مجروح سلطانپوری

(حیات اور کارنامے)

مقالہ برائے پی ایچ ڈی

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اودھ یونیورسٹی، فیض آباد

نگراں

ڈاکٹر زیبا محمود
ریڈر شعبہ اردو
گنپت سہائے پی. جی کالج،
سلطانپور

پیش کردہ

محمد سلیم
گنپت سہائے پی. جی کالج،
سلطانپور

سنہ ۲۰۱۰ء

MAJROOH SULTANPURI

(Life and Work)

THESIS

A THESIS SUBMITTED TO THE DR. RAM MANOHAR LOA UNIVERSITY, FAIZABAD

For the DEGREE of **DOCTOR of PHILOSOPHY** URDU

Submitted by

Mohd.Saleem

Ganpat Sahai P.G. College, Sultanpur

Supervision by

Dr. Zeba Manood (Reader)

Department of U

Ganpat Sahai P.G. lege, Sultanpu

2010

باب اول

مجروحؔ کی زندگی کے اہم گوشے

ابتدائیہ

ابتدائیہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجروحؔ سلطانپوری کا درج بالا زبان زد خاص وعام شعراور لوگوں کی طرح میرے والد صاحب کے بھی ذہن میں رقص کرتا رہتا تھا اور وہ اس شعر کو ہم لوگوں کو اکثر سنایا بھی کرتے تھے۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے اپنا دیوان مرتب کرتے وقت بڑی سختی سے کام لیا۔ انھوں نے اپنے بے شمار اشعار ضائع کر دئے، معنی آفرینی کے خاطر اکثر متعدد اشعار کے الفاظ بھی تبدیل کرتے رہے۔ شاید ہر بڑا شاعر یہ کرتا آیا ہے۔ تو مجروح سلطانپوری ایسا کیوں نہ کرتے۔ وہ بھی اکثر اشعار کی نوک پلک سنوارتے رہتے تھے۔

درج بالا شعر میں بھی مجروح نے تبدیلی کی ہے۔ مصرع ثانی ؎

'لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا'

میں پہلے ''لوگ''(۱) کی جگہ 'غیر' تھا۔

اس شعر میں مجروحؔ نے ٹیگور کے پیغام کو آگے بڑھایا ہے۔ ایکلا چلو، ایکلا چلو، ایکلا چلو رے!

---

(۱)''گلکاری وحشت کا شاعر'' مجروح سلطانپوری مرتب خلیق انجم ص ۱۰۱

اس شعر میں تراکیب لفظی کے حوالے سے مجروحؔ میں بعض کو غالبؔ کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں مجروحؔ کا یہ شعر فیضؔ کے نام سے پارلیامنٹ میں بھی سنایا گیا۔فیضؔ کا ایک بھی شعر ایسا نہیں ہے جو اس قدر مشہور ہو۔

اس شعر کے ذریعے غزل کے موضوع پر پہلی بار نئے موڑ کا آغاز مجروح کی شاعری میں ہوا۔

مجروح کی شاعری کا یہ بہت بڑا کمال ہے جو انھوں نے اس طرح کا شعر کہا ہے۔

اس شعر میں جو شاعرانہ اعجاز نظر آتا ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔اس شعر میں خود اعتمادی کے ساتھ غرور نہیں بلکہ بانکپن ہے۔

مجروحؔ صاحب کے اس شعر کو جو مقبولیت حاصل ہے اس ضمن میں یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ ان کے معاصرین میں سے کسی شاعر کے کسی ایک شعر کو بھی اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔اس حیثیت سے ان کا شاعرانہ قد مزید بڑھ جاتا ہے۔

مجروح سلطانپوری کا یہی شعر میری ان سے وابستگی، محبت اور عقیدت کا ساماں بنا۔

میرے .Ph.D میں داخلے کا دوسرا سبب ہے:

میں ''سبق اردو'' نام کے ایک ماہنامے کا مدیر ہوں۔رسائل کے اجرا کے وقت تو تخلیقات حاصل کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن کچھ شماروں کے بعد تخلیقات کی بھرمار ہو جاتی ہے اور انتخاب میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔میرا بھی اس دوسری دشواری سے سامنا ہوا۔ ایک بار ''نیا دور'' لکھنؤ کے سابق مدیر جناب شہنواز قریشی کے سامنے یہ ذکر چھڑ گیا۔کہنے لگے کہ تخلیق کار اگر شعری تخلیق بھیجے تو نثر میں کچھ مانگیے اور اگر نثری تخلیق آئے تو شعری تخلیق ارسال کرنے کو کہیے۔اس طرح آپ بہت حد تک اس پریشانی سے بچ جائیں گے۔میں نے یہ طریقہ اپنایا کہ نہیں اس سے قطع نظر ایک دوسری حکمت عملی ملاحظہ فرمائیں۔مشرقی اتر پردیش کے ایک استاد کی تخلیقات کی

زیادتی اوران کے عہدے کی زیادتی میرے لئے پریشانی کا سبب بنی ہوئی تھی۔ میں اردو میں ایم۔اے پہلے سے تھا۔ میں نے ان سے گذارش کی کہ مجھے آپ اپنی نگرانی میں ڈاکٹر بنا دیجئے۔ بس اس کے بعد سے ان کی تخلیقات آنا بند ہوگئیں۔۔ میری نگراں محترمہ ڈاکٹر زیبا محمود کی ایک کہانی بغرض اشاعت میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اسے شائع کر دیا۔اس کے بعد پھر ایک مضمون آ گیا۔میں نے ان سے بھی 'ڈاکٹر' بننے کی خواہش ظاہر کی جسے انھوں نے خوشی خوشی قبول کرلیا۔مگر اس کے بعد انھوں نے تخلقات بھیجنا بند کر دیا۔ میں نے انھیں سمجھنے میں بھول کی تھی۔ جس کا مجھے آج بھی ملال ہےاور بے انتہا شرمندگی بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں بہت التجا کرنے پر انھوں نے اپنی کچھ تخلیقات عنایت فرمائیں۔

تیسری وجہ میری والدہ ماجدہ مجھے ڈاکٹر بننے کے لئے کہا کرتی تھیں۔ان کی خواہش کا احترام بھی مجھ پر قرض تھا۔

حالؔی نے غالبؔ کو اس قدر غالب کر دیا کہ ظفرؔ ذوقؔ اور مومنؔ دب سے گئے۔ مجروحؔ کے ہمعصروں میں فیضؔ کی سیاسی بساط سے حاصل شہرت اور فراقؔ کی خودستائی اور حکمت عملی سے ناقدوں نے مجروحؔ کو وقت ہی نہ دیا۔ مجروحؔ کو غالبؔ کے حالؔی اور عبدالرحمٰن بجنوری جیسے مداح ملے اور نہ ہی نیازؔ فتحپوری کے سے نکتہ چیں۔ پھر بھی مجروح نے دیر سے ہی اپنا مقام پالیا۔

مجروحؔ سلطانپوری کے شاعرانہ کارناموں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ان کی ایسی عظیم شخصیت ہے کہ آگے بھی ان پر تحقیقی کام کئے جاتے رہیں گے۔ زیرنظر مقالے میں معروضی انداز اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ مقالہ مندرجہ ذیل چھ ابواب پر مشتمل ہے:

اول: مجروحؔ کی زندگی کے اہم گوشے

دوم: مجروحؔ کے عہد کا ادبی اور تہذیبی پس منظر

سوم: مجروح کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی

چہارم: مجروح کی غزل گوئی

پنجم : مجروح کے شعری مجموعے ''غزل'' اور ''مشعل جاں'' کا تنقیدی جائزہ

ششم: مجروح کی شاعرانہ عظمت

اس کے بعد اختتامیہ اور کتابیات ہے۔

اس مقالے کو تحریر کرتے وقت معروضی انداز اختیار کیا گیا ہے لیکن یہ بات بھی بہت اہم اور توجہ کے لائق ہے کہ غالبؔ نے اپنا دیوان مرتب کرتے وقت بہت زیادہ سرمایا ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا جسے ان کے سخت انتخاب کا نام دیا جاتا ہے، مجروحؔ سلطان پوری اس معاملے میں غالب سے قدرے مختلف ہیں ان کے پاس اس طرح کی شعری تخلیقات اتنی تھی ہی نہیں۔

ان کے ترقی پسند دور کے اشعار کو بعض لوگ یک لخت مسترد کردیتے ہیں جو غلط ہے چند اشعار کی بات الگ ہے ورنہ انھوں نے ترقی پسند نظریے کو بھی جن اشعار میں پیش کیا ہے الفاظ کے نشست و برخاست کے سلیقے نے اشعار کو بلندی معراج عطا کیا ہے۔

اظہار تشکر میں سب سے پہلے میں اپنی اہلیہ سلمٰی خان کا شکریہ ادا کروں گا کہ جن کے تعاون کے بغیر یہ بیش قیمت ڈگری حاصل کرنا میرے لئے قطعی ناممکن تھا۔ اس مقالے کی پوری کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کا کام تن تنہا انھوں نے انجام دیا ہے۔ ان کی محنت واقعی باعث فخر اور لائق رشک ہے۔

اظہار تشکر میں طلبا اپنے نگراں کی تعریف کرتے وقت تبلیغ اور اغراق کی حدیں لانگھ کر غلو کو گلے لگا لیتے ہیں۔ جو حقیقت پر مبنی کم ڈگری، حاصل کرنے کی مجبوری اور بے بسی زیادہ ہوتی ہیں۔ میں نے یہ

ڈگری Medieval History میں ایم۔اے کرنے کے بعد لینے کی کوشش کی تھی۔لیکن جب وہاں پردس۔دس سال تک طلبا کو جوتے گھستے اور بیگاری کرتے دیکھا تو ڈر گیا اور یہ ارادہ ترک کر دیا۔خدا کا شکر ہے کہ میری نگراں ڈاکٹر زیبا محمود حقیقت میں نہایت مخلص اور رحم دل ہیں۔جس کی وجہ میرے خیال میں ان کے والد صاحب کا عطا کردہ ماحول اور تہذیب ہے،ان کو حاصل تعلیم،علمی لیاقت اور خلوص وشفقت کا مزاج ہے۔ان کے والد صاحب سے پورا اردو ادب واقف ہے۔یہ وہ مخلص ورحم دل اور عظیم محقق ہیں جنھیں دنیائے ادب پروفیسر محمود الٰہی صاحب کے نام سے جانتی ہے،جن کی شرافت اور شفقت کے کئی واقعے مجھے میرے استاد پروفیسر عبدالحامد صاحب نے بھی سنائے تھے۔

مجھے بے انتہا خوشی ہو رہی ہے کہ میری 'ڈاکٹر' بننے کی دیرینہ خواہش اب پوری ہونے کے قریب ہے۔اس پر مسرت موقعے پر اپنے والدین کے تعلیمی اور علمی احسانات کا ذکر بھی ضرور کرنا چاہئے۔میرے والد صاحب مدرسے کی معمولی تعلیم رکھتے تھے۔لیکن ادبی ذوق بہت تھا۔انھیں بے شمار اشعار اور ہندی کے دوہے درست طور پر یاد تھے۔

جب میں درجہ پانچ میں تھا تو مجھے محلے کے ایک شاعر کے یہاں ہونے والی سہ روزہ نشست میں پابندی سے لے جایا کرتے تھے جہاں مجھے سب سے پہلے فعولن فعولن فعولن فعولن (بحر متقارب) رٹایا گیا۔میر امنؔ کی 'باغ وبہار' والد صاحب کی زبانی لوگوں کو سناتے ہوئے میں بھی کئی بار سن چکا تھا جسے بعد مین ایم۔اے کے کلاس میں پڑھا۔

بی۔اے پاس کرنے بعد مالی حالت ایسی نہ تھی کہ آگے پڑھائی جاری رکھ سکتا اس وقت میری عظیم والدہ نے سہارا دیا۔

درجہ آٹھ پاس کرنے کے بعد پڑھائی میں من نہ لگتا تھا،گاؤں چلا گیا تھا۔کافی دیر ہو چکی تھی بہر حال بڑے بھائی نے کسی طرح اسکول میں داخلہ کرایا اور اس طرح پڑھائی کا سلسلہ ختم ہوتے ہوتے رہ

گیا۔ تعلیمی میدان میں ان کا احسان سب سے زیادہ ہے۔ مجھ سے چھوٹے بھائی محمد کلیم نے مجھ سے پہلے شاعری شروع کی۔ وہ شعر کہہ لیتے تھے لیکن عروض پر دست رس حاصل نہ تھا جو مجھے بہت کھٹکتا تھا ۔ میں نے عروض پر محنت سے کافی کتابیں پڑھیں لیکن شعریت میں ان سے پیچھے رہ گیا۔

میں اپنے پہلے استاد محترم اصغر مہدی کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں کہ جنھوں نے مجھے قلم پکڑنا سکھایا۔ میں نے ایم۔اے (اردو) الہٰ آباد یونی ورسٹی سے کیا ہے وہاں کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ میں شعبے میں سب سے زیادہ پروفیسر عقیل رضوی سے متاثر ہوں۔ ان کی علمی لیاقت اور صلاحیت کے چرچے پہلے بھی بہت سن چکا تھا اور ویسا ہی پایا بھی ۔ اشعار کی زلفیں سلجھانے کا ہنر ان کے پاس خوب تھا ۔ پروفیسر جعفر رضا کی انتظامی صلاحیت کا کوئی ثانی نہ تھا۔ پروفیسر سید عبدالحامد نے مجھے سب سے زیادہ شفقت اور پیار دیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کی سرگرمی کی خبریں اس وقت بھی گرم رہتی تھیں اور آج بھی استاد محترم اسی سرگرمی سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ایک نہایت مخلص استاد کا ذکر بھی کروں گا جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں ڈاکٹر احمد حسن صاحب کا جن کی شفقت سب پر ابر نیساں کی سی تھی ۔

میں رسمی نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے مجموعی طور پر سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ میری خراج عقیدت متذکرہ محسن اور اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔ آمین ۔

☆☆☆

پیش کردہ

(محمد سلیم)

مجروحؔ کی زندگی کے اہم گوشے

فراقؔ نے اپنی ادبی زندگی کا ایک بڑا حصہ الٰہ آباد میں گزارا۔ یہاں کے ادبی ماحول سے بہت استفادہ بھی کیا لیکن اپنی جائے پیدائش کو اپنے نام سے منسوب کیا اور فراقؔ گورکھپوری کہلائے۔ غالبؔ نے اکبر آبادی نہ لکھ کر دہلوی کہلانا پسند کیا۔ بقول کسے مجروحؔ اس معاملے میں غالبؔ کی پیروی کرتے ہیں۔

معاملہ جائے پیدائش کا ہو یا تاریخ پیدائش کا، اکثر بڑی شخصیات کے معاملے میں یہ بات واضح نہیں ہوتی ہے۔ جانے کتنے شاعر ہوں گے، جانے کتنے ادیب جن کی جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش کے بارے میں سبھی ایک زباں نہیں۔ مجروحؔ سلطانپوری بھی چونکہ اس بلند مقام پر پہنچے، جہاں پہنچنے پر بحث ومباحثہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مجروحؔ سلطانپوری کے بارے میں بھی سبھی لوگ اک رائے نہیں ہیں۔ مجروح سلطانپوری کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ ہنوز طے نہیں ہوا ہے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی فرماتے ہیں ''اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر مجروحؔ سلطانپوری کا اصل نام اسرار حسن خاں تھا۔ وہ ۱۹۲۱ میں سلطانپور میں پیدا ہوئے۔''(۱)

ڈاکٹر شیما رضوی کے مطابق ''اسرار الحسن خاں مجروح سلطانپوری پیدائش ۱۸ جون ۱۹۲۰ اور وفات ۱۹ مئی ۲۰۰۰ ہے۔(۲)

(۱،۲) مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب:: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۷، ۱۵

ڈاکٹر بشریٰ بانو رقمطراز ہیں'' مجروح سلطانپوری کی پیدائش ۱۹۱۹ میں اعظم گڑھ میں ہوئی۔''(۱)

شہر مجروح سلطانپور کے رہنے والے ہاشم عبداللہ صحافی زور دے کر کہتے ہیں''مجروح کی جائے پیدائش سلطانپور ہی ہے۔''(۲)

ڈاکٹر ضیاالدین شکیب سے ملاقات کے دوران خود مجروح صاحب نے جو بیان دیا ہے وہ یہ ہے:

''ایک دفعہ میں نے اپنی والدہ ماجدہ سے پوچھا کہ ہماری پیدائش کا دن تو آپ کو یاد ہوگا۔ انھوں نے فرمایا کہ بیٹے اتنا تو یاد ہے کہ جمعرات کا دن تھا اس کے بعد رات ہوئی اور ساڑھے چار بجے تم پیدا ہوئے۔ دوسرے دن جمعہ بھی تھا اور عید بھی۔(۳)

وہاب اشرفی کہتے ہیں کہ مجروح صاحب کیاس سرائے فانی سے چلے جانے کے فوراً بعد ان کے تعلق سے کالی داس گپتا رضا نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا:

''مجروح سلطانپوری کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نے اپنے انگریزی مضمون میں مجروح صاحب کا ایک خاکہ مرتب کیا جس میں انھوں نے مجروح کی تاریخ پیدائش ۱۹۱۹ تحریر کی ہے۔''خلیق انجم صاحب کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۱۹۱۵ یا ۱۹۱۶ ہے۔ خلیق انجم صاحب کا کہنا ہے کہ یہ سن ولادت مجروح صاحب نے خود ان سے بتایا تھا۔'

مجروح کے انتقال کے فوراً بعد کالی داس گپتا رضا نے مجروح سے متعلق اپنے ایک مضمون ''ایک روز

(۱،۲) مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۴۵، ۷۹

(۳) ''گلکاری وحشت کا شاعر'' مجروح سلطانپوری مرتب خلیق انجم ص ۱۶۱ (۴) ''مجروح سلطانپوری'' مصنف: وہاب اشرفی ص ۸

میں نے ان سے ان کی تاریخ ولادت دریافت کی کیوں کہ تذکرہ ماہ وسال مرتبہ:(مالک رام) میں درج تاریخ یکم جولائی ۱۹۱۵ سے مجھے اتفاق نہ تھا۔ فرمایا کہ ۱۹۱۵ تو غلط محض ہے مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۹ سال ولادت ہوگا۔ میں نے مزید ٹٹولا تو انہوں نے اپنی بڑی بہن کے حوالے سے مجھے کئی باتیں بتائیں۔ میں نے دو تین گھنٹوں کی مغز پچی کے بعد ان کی ہمشیرہ (جو عمر میں ان سے بڑی تھیں) کے دئے ہوئے حوالوں کی مدد سے ان کی تاریخ ولادت متعین کر دی جسے سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ابھی حال ہی کے ایک انٹرویو میں انہوں نے یہی تاریخ ولادت بتائی تھی اور کہا تھا کہ اس کا تعین کالی داس گپتا رضا نے بڑی خوبی سے کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ تاریخ ولادت یہ ہے:

۱۷/جون ۱۹۲۰ جمعرات صبح چار بجے۔"(۱)

مجروح سلطانپوری کا نام اسرارالحسن خاں تھا، بعد میں ایک مولوی نے عربی قاعدے کو ہٹا کر خالص ہندوستانی زبان اردو کے مطابق ان کا نام اسرار حسن خاں کر دیا۔ بات کے دوران انھوں نے خلیق انجم صاحب کو بتایا تھا کہ میری رگوں میں راجپوتی خون ہے۔ اس لئے بہت جلد غصہ آ جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مجروح نسلاً راجپوت تھے۔

مجروح کے والد محمد حسن خاں شعبۂ پولیس میں ملازم تھے۔ مجروح اپنے والدین کے تنہا چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد صاحب کی مالی حالت بہت اچھی نہیں تھی تو بری بھی نہیں تھی۔ مجروح کا بچپن بہت لاڈ پیار میں گزرا۔

جب مجروح کو اسکول میں داخلے کا وقت آیا تو خلافت تحریک (اس کو تحریک مخالفت کا نام نہ مل سکا، جو افسوس ناک ہے کیوں کہ خلافت کے معنی مخالفت کے ہیں نہ کہ رہنمائی کے۔ ہندی والے آج

---

(۱) منفرد غزل گو؛ مجروح سلطانپوری مطبوعہ 'آج کل' نئی دہلی اگست ۲۰۰۰

بھی اسی غلط معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں) شباب پر تھی ۔ان کے والد صاحب کے اندر حب الوطنی کا جذبہ انتہا کی حد تک تھا سرکاری ملازم ہوتے ہوئے بھی انھیں انگریزوں سے بیر تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ اپنے لخت جگر کو انگریز اور انگریزی دونوں سے دور رکھیں گے۔

اس لئے انھوں نے اسرار الحسن خاں کو اسکول نہ بھیج کر ایک مقامی مکتب میں داخلہ دلایا۔ جہاں انھوں نے عربی، فارسی اور اردو پڑھی ۔ درس نظامیہ کے مکمل ہونے میں صرف دو سال رہ گئے تھے کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس کی وجہ سے مجروح کو تعلیم ترک کرنی پڑی ۔ مجروح نے کسی لڑکے سے کوئی مذاق کر لیا اور لڑکے نے مولوی صاحب سے شکایت کر دی ۔ مولوی صاحب نے بغیر کسی تفتیش کے بید سے مجروح کی پٹائی شروع کر دی مجروح پٹائی برداشت کرتے رہے، کرتے رہے، جب پٹائی حد سے بڑھ گئی تو انھوں نے ایک ہاتھ سے بید پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے مولوی صاحب کی گردن ۔اس عمل کے بعد وہ اس مدرسہ سے نکال دئے گئے کچھ کا کہنا ہے کہ وہ خود مدرسہ چھوڑ کر آ گئے ۔ کچھ دنوں تک بیکار رہنے کے بعد لکھنو کے طبیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔

کم لوگ جانتے ہیں کہ اعظم گڑھ اور سلطانپور کے بیچ میں واقع ضلع فیض آباد (اب امبیڈکر نگر) کے قصبہ ٹانڈہ سے ان کا کس قدر گہرا تعلق ہے ۔ پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی زبانی: مجروح صاحب کا میرے آبائی وطن ٹانڈہ امبیڈکر نگر سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ٹانڈہ کے مدرسہ کنز العلوم جس کے بانی میرے والد مرحوم حاجی مولانا علیم اللہ صاحب تھے، کے وہ شاگرد تھے، جب انھیں اقبال سمان سے نوازا گیا اور علم ہونے پر کہ میں اوارڈ کے Panel میں تھا تو انھوں نے بذریعہ ٹیلی فون رابطہ قائم کیا میرے مبارک باد دینے پر انھوں نے معنیٰ خیز جملے کا استعمال کیا:

''میں تو ان (والد مرحوم) کے دامن کی جھٹکی ہوئی دھول بھی نہیں ۔''(۱)

مجروح بچپن سے ہی بہت ذہین تھے ۔ طالب علم کی حیثیت سے وہ ایک ہونہار طالب علم سمجھے

---

(۱) مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود کے نام پروفیسر محمود الٰہی صاحب کا پیغام

جاتے تھے۔ پڑھائی کے دوران ہی انھوں نے طب پر ایسی قدرت حاصل کرلی تھی کہ جھوائی ٹولے کے بڑے طبیب شفا المسلمین حکیم عبدالمعید جب کسی علاج کے سلسلے میں باہر تشریف لے جاتے تو مجروح کو اپنی کرسی پر بٹھا کر جاتے۔ ۱۹۳۸ میں کالج سے سند حاصل کرنے کے بعد مجروحؔ فیض آباد کے قصبہ ٹانڈہ چلے گئے اور وہاں انھوں نے اپنا مطب قائم کرلیا۔ مجروحؔ نے خود مجھے مسکراتے ہوئے بتایا تھا کہ ٹانڈہ میں ایک بہت خوبصورت لڑکی سے ان کو عشق ہوگیا تھا۔ جس کا بعض لوگوں کو علم ہوگیا تھا۔ اس لئے وہ لڑکی کی رسوائی کے ڈر سے ٹانڈہ چھوڑ کے سلطان پور آگے ء۔

مجروح کو ابتدا ہی سے علم موسیقی سے لگاؤ تھا اور دلچسپی تھی ۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ لکھنؤ کے میوزک کالج میں انھوں نے داخلہ لیا تھا۔ ان کے والد نے اس پر اپنی شدید نا گواری کا اظہار کیا اور میوزک کالج جانے سے منع کردیا۔ مجروح نے وہاں جانا بند کردیا اور یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

انھوں نے ۱۹۳۵ یا ۱۹۳۶ میں شاعری شروع کی تھی، مجروح کی شاعری کے آغاز کے بارے میں مجروح کے لڑکپن کے دوست حکیم ابن نے ''چراغ'' ممبئ میں لکھا ہے:

''مجروح کی طبیعت کو شاعری سے
لگاؤ اور کافی مناسبت تھی۔ سلطانپور
میں ہی پہلی غزل کہی اور وہیں کے
ایک آلنڈیا مشاعرے
میں سنائی۔ اس مشاعرے میں

مولانا آسی الدنی شریک تھے۔مجروح نے اپنی ایک
غزل مولانا کی خدمت میں بغرض اصلاح روانہ
کی،مولانا نے مجروح کے خیالات کو باقی رکھنےاور کسی صحیح
مشورے کو بجائے ان کے اشعار ہی سرے سے کاٹ
دئے اور اپنے اشعار لکھ دئے۔ مجروح نے مولانا کو لکھا
کہ مقصد اصلاح یہ ہے کہ اگر قواعد یا زنان یا بحر کی کوئی
لغزش ہو تو مجھے آپ اس طرف متوجہ کریں۔ یہ نہیں کہ
اپنے اشعار کا اضافہ کردیں۔مولانا نے جواب دیا کہ اس
قسم کی اصلاح کے لئے میرے پاس وقت نہیں ،
چناں چہ یہ سلسہ بند ہوگیا۔''(۱)

اس کے بعد مجروح نے اپنا کلام کسی استاد کو نہیں دکھایا اور خود محنت کر کے فن شاعری اور زبان و بیان پر وہ قدرت حاصل کی جو ان کے معاصرین میں بہت کم لوگوں کو نصیب تھی۔ انکی ذہنی تربیت میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور جگر مرادآبادی کا بہت ہاتھ تھا۔ اگر چہ ان دونوں سے مجروح کا رشتہ استاد اور شاگرد کا نہیں تھا۔ رشید احمد صدیقی صاحب سے تو معاملہ یہ تھا کہ رشید صاحب نے مجروح میں ایک بڑے شاعر کو دیکھ لیا تھا اس لیے وہ چاہتے تھے کہ مجروح عربی، فارسی اور اردو کے کلاسیکی ادب کا بہت اچھا مطالعہ کریں۔ مجروح کو یونیورسیٹی میں تو داخلہ مل نہیں سکتا تھا۔ اس لیے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے تین سال تک انھیں اپنے گھر رکھا، جہاں مجروح نے کلاسیکی ادب کا بہت اچھا مطالعہ کیا۔
یہ بات ۱۹۴۵ کی ہے مجروح ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جگر صاحب کے ساتھ ممبئی

(۱)'' گلکاری وحشت کا شاعر'' مجروح سلطانپوری مرتب خلیق انجم ص ۱۲

گئے ۔ وہاں مشاعرے میں جب انھوں نے اپنا کلام سنایا تو فلموں کے صف اول کے ڈائرکٹر کاردار مجروح کی شاعری سے بہت متاثر ہوئے ۔ ان دنوں کاردار "شاہجہاں" نام سے ایک فلم بنا رہے تھے ۔نوشاد، میوزک ڈائرکٹر تھے ۔کاردار نے مجروح کو پانچ ہزار روپے مہینے کی ملازمت کی پیش کش کی ۔ مجروح اتنی بڑی تنخواہ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے اسی لیے انھوں نے فوراً منظور کرلیا۔ انھوں نے اس فلم کے گانے لکھے ،نوشاد نے موسیقی دی اور سہگل پر یہ گانے فلمائے گئے ۔ان گانوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ آج بھی لوگ ان پر سر دھنتے ہیں۔ مجروحؔ نے فلمی زندگی کے پچپن برسوں میں تقریباً ساڑھے تین سو گانے اردو میں اور تین بھوجپوری میں لکھے ۔ان نے پنچانوے فی صد گانوں کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۹۴۹ میں جب کمیونسٹ پارٹی نے ریلوے اسٹرائک کا نعرہ دیا تو سارے ہندوستان میں جگہ جگہ کمیونسٹ گرفتار ہونے لگے ۔ چوں کہ مجروحؔ کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ ممبر تھے اور انھوں نے مزدوروں کے حق میں شعر کہے تھے ،اس لیے انھیں بھی گرفتار کرلیا گیا اور وہ ایک سال جیل میں رہے۔

دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ غالباً ۱۹۴۳ میں ایک بہت بڑا جنگی مشاعرہ امرتسر میں منعقد ہوا۔ یہ تھا حکومت برطانیہ کی امداد کے لیے (یا دوسرے لفظوں میں اس وقت کی حکومت ہند کی امداد کے لیے) لیکن دعوت ناموں میں یہ لکھا گیا تھا کہ جنگ میں زخمی ہونے والے سپاہیوں کے علاج اور مرہم پٹی کے لیے یہ مشاعرہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ یہ امدادی مشاعرہ بہت اہم تھا۔اس طرح کے امدادی مشاعروں کے بڑے فاعدے ہیں۔

یہ ہر اعتبار سے ایک بڑا مشاعرہ تھا۔اس میں بڑے شعرا مثلاً جوشؔ ملیح آبادی، جگرؔ مرادآبادی، تاجور نجیب آبادی، حفیظ جالندھری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ،احسان دانشؔ ،روشؔ صدیقی ، فیض احمد فیضؔ ، ہری چند اختر اور نفیس خلیلی کے علاوہ نئے شعرا بھی خاصی تعداد میں تھے مثلاً راقم التحریر، راز مرادآبادی

جمیل الدین عالی، پرشوم لال مینا، کرپال سنگھ بیدار، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی۔ شعرا کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ باقی نام یاد نہیں آرہے ہیں۔

ریاض قریشی صاحب مجروح کو کہیں پہلے سن چکے تھے۔ ان کے بارے میں انھوں نے یہ شعر پڑھا:

بلبل باغ سخن مجروح ہے
اس کا نغمہ شاعری کی روح ہے

جب مجروح نے اپنا کلام پڑھا تو سماں باندھ دیا۔ مجروح نے پہلے ایک غزل پڑھی۔ غزل بھی بہت عمدہ اور پھر مجروح کی اس زمانے کی آواز۔ مکرر مکرر کے شور میں مجروح نے اب کے ایک گیت 'گائے جا پپیہے گائے جا' شروع کیا اور مشاعرہ لوٹ کے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی نشت پہ آ کے بیٹھ گئے۔ مجروح جگر صاحب کے شاگرد نہیں تھے بلکہ مجروح جگر صاحب کے ایک جونیر دوست تھے۔

۱۹۴۷ میں ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ہندوستان اور پاکستان میں انڈو پاکستان (یا پاک ہند) مشاعرے منعقد ہونا شروع یو گئے۔ چیمسفورڈ کلب نئی دلی ان مشاعروں کے انعقاد میں پیش پیش تھا ۱۹۴۷ کے بعد کا ایک مشاعرہ میں مجروح صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ مجروح کو چیمسفورڈ کلب مشاعرے میں امرتسر والے مشاعرے کی طرح بے تحاشا داد ملی۔

چیمسفورڈ کلب کے مشاعرے کے بعد اور اکثر دلی کلاتھ ملز کے مشاعرے کے بعد پاکستان ہائی کمیشن میں دعوت طعام کے ساتھ ہی عمدہ اور معیاری شعری نشت منعقد ہوتی تھی۔

ہندوستان کے شعرا میں مجروح کے علاوہ وامق جونپوری اور کنور سنگھ بیدی بھی

تھے۔چمیسفورڈ کلب میں تو کنور سنگھ بیدی مشاعرے کی کاروائی چلاتے ہی تھے، پاکستان ہائی کمیشن کی نشت میں بھی جب وہ موجود ہوتے تھے یہ اعزازانھی کو دیا جاتا تھا۔مذکورہ نشت میں جب انھوں نے مجروح صاحب سے کلام ارشاد کرنے کی فرمائش کی تھی توان کا تعارف ایک مشہور فلمی گیت کار کہ کر کرایا۔اس وقت مجروح کا چہرہ، جو غصے سے سرخ ہورہا تھا دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا،لیکن انھوں نے خاصے ضبط سے کام لیا اور کنور صاحب ہی سے خطاب کرتے ہوئے کہا سردار جی ایک فلمی گیت پیش کر رہا ہوں۔سماعت فرمایئے۔اور یہ کہ کے اپنی مشہورومعروف غزل شروع کی:

جب ہوا عرفاں توغم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

پہلے شعر ہی پر داد کا عالم تھا کہ خدا کی پناہ۔ یہ داد تو ہر شعر پر زیادہ سے زیادہ ہوتی گئی لیکن جب مجروح اس شعر پر پہنچے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

تو داد کی کیفیت حدود بیان سے باہر جا چکی تھی لیکن دو یا تین اشعار کے بعد مقطع باقی تھا:

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

اس مقطعے پر تو اگر چہ دعوت یا نشت پندرہ بیس حضرات ہی پر مشتمل تھی، داد و تحسین نے قیامت برپا کردی۔ قبلہ بیدی صاحب بھی ذوق وشوق سے داد دے رہے تھے لیکن جھینپ اور ندامت کی کیفیت ان کے چہرے پر نمایا تھی۔ بیدی صاحب کی شرافت نفسی کا جواب نہیں تھا اسی لیے انھوں نے نشت کے بعد مجروحؔ صاحب سے معذرت بھی کر لی۔

گورکھپور کے ایک مشاعرے میں دوسرے معروف شعرا کی طرح مجروحؔ بھی شریک ہوئے۔ مشاعرہ کے دوران مولانا انور صابری اور مجروحؔ سلطانپوری میں کسی شعر کے مضمون پر اختلاف ہوا جس نے بڑھ کر مخالفت اور مہارت کی شکل اختیار کر لی، ہاتھا پائی کی نوبت آنے والی تھی کہ بیچ بچاؤ کرایا گیا اور عافیت مشاعرہ کو ملتوی کرنے میں ہی سمجھی گئی۔ کسی مشہور شاعر کو سر محفل اس طرح غضبناک دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

۱۹۴۹ میں جب آزاد ہندوستان غلامی کی توصیع کا نظارہ پیش کر رہا تھا تب ہی مزدوروں کے ایک جلسے میں مجروح نے اپنے رنگ سے پالکل ہٹ کر ''سوسنار کی تو ایک لوہار کی'' کے مصداق جب ایک نظم سنائی:

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

تو مزدوروں نے تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ یہ نظم ان کے لئے باعث تکلیف بھی ہوئی۔ ادب کے اکثر ٹھیکیداروں نے اسے بہانا بنا کر ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی خوب ہجو کی کہ یہ نئے ادب کا نیا معیار تھا۔ اور مرارجی دیسائی نے جو اس وقت ممبئی کے وزیر اعلی تھے، اس نظم کی وجہ سے انھیں جیل میں بند کر دیا۔

مجروح سلطانپوری کے لئے یہ تجربہ اہم ضرور تھا لیکن ان کے پائے استقلال کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ وہ اسی طرح اپنے خیالات پر قائم رہے۔ ان کے اظہار برملا پر کوئی ضرب نہ لگنے پایا۔ وہ ترقی پسندوں کے درمیاں رہ کر بھی اپنے آپ کو کبھی کبھی تنہا محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ غزل کے شاعر ہیں۔ وہ مزدورں کی حمایت میں اپنی شاعری کے رنگ کو دبیز کرتے جاتے ہیں۔

ایک غزل جس کے پہلے مصرے کی تان الفاظ پر ٹوٹتی ہے۔ ''واہ رے جے پر کاش نرائن''۔ اتفاق سے یہی وہ غزل ہے جو انھوں نے پروفیسر سامری کے مشاعرے واقع بلاسس روڈ (ممبئ) میں مائیکروفون کے استعمال کے وقت کی مقررہ حدرات کے گیارہ بجے کے بعد) پولیس کی پابندی کو توڑتے ہوئے پڑھی اور جس کے باعث ان کی گرفتاری کا وارانٹ جاری ہوگیا اور اسی جگہ نیاز حیدر نے اپنی نظم ''رقص بغاوت'' اور وہ مشاعرہ گاہ میں ہی پولیس کے ہتھے چڑھ گئے اور کئی ماہ جیل میں رہے۔

مجروحؔ بہت دنوں تک انڈر گراؤنڈ رہے، آخر تقریباً دس گیارہ ماہ بعد ناگپاڑے (ممبئ) کے ایک مشاعرے میں انھوں نے شرکت کی اور مشاعرے کے فوراً بعد سی آئی ڈی انسپکٹر شیخ نے ان کو گرفتار کرتے ہوئے کہا ع

ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا تو چراغ راہ میں جل گئے

مجروحؔ نے کئی ماہ جیل کاٹی اور اس زمانے میں ان کی پریشانیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ انھوں نے اپنی نئ شادی شدہ بیگم کو بہ طور امداد کچھ روپے بھیجنے کے لیے اپنے کچھ دوستوں کی لسٹ بھیجی جس میں راقم الحروف کا نام بھی شامل تھا۔ اس مصیبت کے وقت میں راجندر سنگھ بیدی نے

بڑی فیاضی کا ثبوت دیا اور کہا کہ جب تک مجروح رہا نہیں ہو تے ان کے خراجات میرے ذمے ۔ بیدی کو فلموں میں خاصا کام ملنے لگا تھا۔ انھیں فلموں میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے شدید جدو جہد سے دوچار ہونا پڑا۔ فلمی شاعری کا منظر نامہ یہ تھا کہ نوشاد تو صرف شکیل بدایونی سے گانے لکھواتے تھے اور ایس ڈی برمن صرف ساحر لدھیانوی سے۔ نخشب جارچوی کا اپنا مارکیٹ تھا ۔ وہ تو شاعر سے فلم ساز بن گئے تھے۔ مجروح کو زیادہ سہارا املا او۔ پی ۔ نیر سے اوران کی فلمی کامیابی کی ضمانت ہیں۔ ''سی اے ٹی کیٹ، کیٹ معنی بلی، اور کبھی آر کبھی پار لگا تیر نظر، جیسے گانے ۔ بہر حال مجروح فلمی دنیا میں اس مقام پر پہنچے کہ انھیں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا جو ہندوستانی فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔

مجروح کو حاصل یہ سعادت ہوئی کہ یکم اکتوبر ۱۹۱۹ کو شہر شبلی میں ان کی ولادت ہوئی ۔ ان کے والد سرکاری افسر تھے یعنی پولیس انسپکٹر تھے۔ وہ نسلاً راجپوت تھے۔ مجروح فیض آباد سے فیضیاب ہوئے۔ تعلیمی میدان میں کامیاب و کامران رہے۔ اردو زبان کو بزم دل کی زینت بنایا اور عربی فارسی سے ذہن کو سجایا۔ مولوی اور عالم کی سند حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ لکھنؤ سے کامل طب و جراحت ہوئے۔ اعظم گڑھ میں مطب کیا۔ سن چالیس میں کوچہ شاعری میں قدم رکھا۔ جگر صاحب کی نظران پر سلطان پور میں ہی ایک مشاعرے میں پڑی اور ہو کلام اور مترنم آواز سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں اپنے ساتھ لے گئے جہاں سے ان کی زندگی میں کامیابی کے زینے روشن ہوئے۔ ۱۹۹۳ میں جوان بیٹے کی موت نے انھیں توڑ کر رکھ دیا تھا ان کے پورے وجود کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ اور تبھی سے ان کی صحت خراب رہنے لگی ۔ آنسو بن کر آنکھو سے بہنے لگے۔ پھیپھڑوں کی دق کو اجان سے لگایا اور اسی میں سکون ابدی پایا۔

راولپنڈی سازش کیس میں فیض اور سجاد ظہیر گرفتاری ساتھ ساتھ ہوئی تھی ۔ اور

یہ مصدقہ ہے کہ فیض ۹ مارچ ۱۹۵۱ کو گرفتار ہوئے تھے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مجروح مارچ ۱۹۵۱ یہ کی کسی تاریخ کو گرفتار ہوئے ہوں گے۔ ''گفتگو'' کے ''ترقی پسند ادب نمبر'' (مرتب: سردار جعفری) میں ''نقوش زنداں'' کے عنوان کے تحت مجروح کی پانچ غزلیں بھی دی گئی ہیں اور ہر ایک کے نیچے درج ہے:

''بائیکلہ جیل بمبئی، ۱۹۵۱''

۱۹۷۳ میں نہرو کلچرل ایسوسی ایشن لکھنؤ کی طرف سے کانپور میں ایک بڑا کل ہند مشاعرہ ہوا تھا۔کرشن چندر نے صدارت کی تھی۔کیفی اعظمی فالج کے حملے سے جانبر ہونے کے بعد پہلی بار کسی محفل مشاعرہ میں شریک ہوئے تھے۔فراق، ساحر شاذ تمکنت اور کئی مقتدر شعرا موجود تھے۔مشاعرے میں اتنی بھیڑ تھی کہ اسے کنٹرول کرنا مشکل تھا۔افراتفری کا یہ عالم تھا کہ مجروح مشاعرہ گاہ کے گیٹ تک پہنچے تو انھیں کسی نے نہیں پہچانا اور انھیں اندر جانے نہیں دیا وہ خفا ہو کر چلے گئے اور مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے۔نئی غزل کے موجد مظہر امام صاحب فرماتے ہیں:

> ''۱۳ اکتوبر ۱۹۸۱ کو کشمیر یونی ورسٹی کی دعوت پر عصمت چغتائی سری نگر تشریف لائیں۔وہاں کی تقریبات سے فارغ ہونے کے بعد میری درخواست پر وہ میرے گھر آ گئیں اور وہاں انھوں نے پچیس دن قیام فرمایا۔وہیں ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگیں آج کل مجروح ایک شاعرہ پر ریشہ خطمی ہو رہے ہیں اور جوہو کے کنارے

اس کے ساتھ گریباں چاک کئے ہوئے مجنوں کی طرح بیٹھے رہتے ہیں۔ مجھے اس واقعہ کا علم نہیں تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ بات اس وقت تک کافی مشہور ہو چکی تھی۔ شاعرہ کا نام عصمت آپا کو یاد نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے کچھ اشارہ دیا تو میرا ذہن فوراً اس نام کی طرف منتقل ہو گیا۔''

(۱)

۱۹۸۶ میں دوردرشن سری نگر اور کشمیر یونی ورسٹی کے اشتراک سے ایک بڑے کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ شاعروں کا انتخاب آل احمد سرور اور مظہر امام نے کیا تھا۔ نظامت کے فرائض بھی سرور صاحب نے انجام دئے تھے۔ سردار مجروح کیفی تو تھے ہی، ملک کے تمام علاقوں کی نمائندگی ہوئی تھی۔ بہر حال، مشاعرے کے دوسرے دن میں نے دوردرشن کے لیے مجروحؔ سلطان پوری اور اختر سعید خاں سے انٹرویو لیا۔ دوران گفتگو اختر سعید خاں نے آزاد غزل کی بابت مجھ سے ایک سوال کر دیا اور مجروح صاحب دیر تک مجھ سے بحث کرتے رہے کہ آپ کوئی چھوٹے موٹے شاعر تو ہیں نہیں، آپ آزادغزل کا ڈول کیوں ڈالا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ آزادغزل سے ان کے مزاج کو کوئی مناسبت نہیں تھی۔ خیر، اس بات میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں آزادغزل کی ہیئت اور اس تجربے کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے آزادغزل کے بارے میں صرف سن رکھا تھا اور ایک منفی رائے قائم کر لی تھی۔ شاید ان کا خیال تھا کہ آزادغزل میں ردیف اور قافیے کا کوئی التزام نہیں ہوتا اور کہیں بھی کوئی لفظ بطور قافیہ استعمال ہو سکتا ہے۔ میرے اس خیال کو تقویت

---

(۱)'' گلکاری وحشت کا شاعر'' مجروح سلطانپوری مرتب خلیق انجم ص ۹۹

مجروحؔ صاحب کے ایک انٹرویو سے بھی ملی جو ماہ نامہ ''اردو چینل''،ممبئی کے دسمبر ۱۹۹۸اور جنوری ۱۹۹۹ کے مشترکہ شمارے میں شائع ہوا تھا۔ان سے ایک سوال پوچھا گیا کہ بابری مسجد کے انہدام کے واقعے کو ادب میں کسی علامت یا استعارے کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے یا نہیں؟ مجروح صاحب نے اس کا جو جواب دیا تھا،اس کا پورا متن یہ ہے:

''ابھی تک تو استعمال نہیں ہوا ہے۔ جب ان لوگوں نے یہ تحریک شروع کی تھی اور بابری مسجد کا نام رام جنم بھومی دیا تھا تو میں نے ایک قطعہ کہا تھا،جس کا عنوان تھا:

آزاد غزل

کالک ہے جہالت کی کیا شعر لکھا ظالم
یہ کہ کے جو ملا نے پنڈت کی جبیں چومی
پنڈت نے کہا صاحب یہ دور ہے جدت کا
اب طرز بدل ڈالیں اقبال ہوں یا رومی
آزاد ہیں ہم فیشن آزاد غزل کا ہے
اب قافیہ مسجد کا ہے رام جنم بھومی

مجروحؔ کے یہ اشعار فیضؔ کے نام سے پارلیامنٹ میں بھی سنائے گئے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے او ر کارواں بنتا گیا

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

۱۹۵۲ کے شدید جاڑوں کی ہے۔ غالباً دسمبر کے آخری دن تھے۔ مجروح صاحب جیل میں ایک برس گزارنے کے بعد رہا ہوئے تھے۔ ترقی پسندوں کے جذباتی مبالغے، احساس تناسب سے عاری آدرش واد کا دور جس میں مجروح صاحب نے بھی اپنے دوسرے ہم صفیروں کی طرح نہرو جی کی پالیسیوں پر سخت وار کیے تھے:

کامن ویلتھ کا داس یہ نہرو، اور تباہی لانے نہ پائے

مجروحؔ صاحب کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جس نے دینوی مصلحتوں پر پاس وضع کے حفظ کو ہمیشہ ترجیح دی۔ کبھی عزت نفس اور ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ خاندان کے محدود وسائل اور بندھی ٹکی آمدنی کے باوجود انھیں طب کی تکمیل کے راستے پر جو لگایا گیا تو صرف اس لیے تاکہ وہ فرنگی حکومت کے تابع نہ ہوں اور آزادانہ روزی حاصل کر سکیں۔ گر مجروح صاحب کے وجود میں خودروی کا عنصر شروع

سے سرگرم تھا۔ لکھنؤ میں طبابت کے ساتھ ساتھ شاستریہ سنگیت کے کالج میں، گھر والوں کو بتائے بغیر انھوں نے داخلہ لے لیا۔ پھر ۱۹۴۵ میں جگر صاحب کے ہاتھ ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے وہ ممبئی پہنچے تو گویا کہ انھیں اپنی منزل مل گئی۔ ان کی نغمہ نگاری شعری اظہار ہی کی دوسری سطح تھی۔ یہ سطح مجروح صاحب کی استعداد کے لحاظ سے کم تر سہی، مگر اس سطح پر بھی انھوں نے اپنے شیوۂ سخن کا بھرم بڑی حد تک محفوظ رکھا۔

جواں عمری میں بڑے بیٹے کی موت نے انھیں ایک دم توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس سخت سانحے سے پہلے بھی ان کے حالات معاشی اعتبار سے بہت پریشان کن تھے۔ چین سے سانس لینے کا موقع انھیں بہت کم ملا۔ مجروح صاحب مکتبوں کے پیرزاد تھے۔ لیکن خیالوں میں یونیورسیٹی چلے گئے انھوں کمیونسٹوں والا عشق کیا، لال جھنڈا اٹھایا، Modern Intellctual ہو گئے۔ گھر دوار، اللہ رسول سب کا ایثار کر دیا، دن رات سو سگریٹیں پیں، ہفتوں شیو نہیں کیا۔ یونیورسیٹی میں گئے تو کلاس پاس کرنے کی ذلت نہیں اٹھائی۔ انقلاب زندہ باد کہہ کر وائس چانسلر کی میز الٹ دی۔ دونوں وقت کبھی روٹی نہیں کھائی صرف پچاس سگریٹ اور ۲۵ چائے کی پیالی فی دن سے گزار دی۔

مجروح صاحب فرماتے ہیں کہ میں کئی برس تک رشید احمد صدیقی کے یہاں رہا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا، سچ تو یہ ہے کہ میرا سارا ذوق شعر و ادب ان ہی کی توجہ اور تربیت کا رہین منت ہے۔

ڈاکٹر ضیا الدین شکیب بتاتے ہیں کہ میں نے جب مجروح سے اورنگ آباد کے ۱۹۴۴ والے مشاعرے کا ذکر چھیڑا جو بالعلوم سید نسیم الحسن موہانی کی کوشش اور تعاون سے منعقد ہوا کرتا۔ اس میں مجروح کے علاوہ کیفی اعظمی علی سردار جعفری، سکندر علی وجد، نظر حیدرآبادی کا ذکر چھڑ گیا۔ اگرچہ باتیں یوں ہی سی ہوئی تھیں لیکن معنی خیز تھیں۔ مجروح نے یہ تو نہیں بتایا کہ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ کیوں ہوئے مگر فرمانے لگے" ۱۹۴۵ سے ترقی پسند تحریک نے غزل کے خلاف آواز اٹھانا شروع کی جس کی وجہ

سے اکثر شعرا نے غزل گوئی ترک کردی۔ غزل کہنا باعث ننگ ہو گیا تھا۔

مجروح غزل کے تعلق سے ایک دلچسپ واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ علی سردار جعفری صاحب آئے اور انھوں نے اقبال کا یہ مصرع پڑھا۔

'دگر گوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی'

اور پوچھا کیسا مصرع ہے۔ میں نے کہا نہایت رواں نہایت بامعنی، متحرک اور شگفتہ مصرع ہے۔ پھر سردار صاحب نے دوسرا مصرع پڑھا۔

'دل ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی'

اور اس پر رائے پوچھی تو مجروحؔ صاحب نے کہا کہ اس مصرع کی صوتی کیفیت پہلے مصرعے کی صوتی کیفیت کی نسبت گراں اور اس سے اہمل ہے۔

سردار صاحب نے کہا کہ جی نہیں دوسرے مصرعے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ شعر دولختہ ہو گیا ہے۔ پہلے مصرعے میں بات پوری ہو گئی تھی۔ اس پر مجروحؔ صاحب نے کہا کہ غزل میں دوسرا مصرع اضافی ہی سہی غزل کا شعر بنتا دو مصرعوں سے ہے اور جب تک دوسرا مصرع نہ کہا جائے پہلا مصرع معلق رہ جاتا ہے۔ پھر غالب کا یہ شعر سنایا کہ اس میں بھی پہلے مصرعے میں بات پوری ہو چکی تھی لیکن دوسرا مصرع کہا گیا۔ شعر یہ تھا:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

مجروحؔ صاحب نے صاف لفظوں میں تو نہیں کہا لیکن اس کے نتیجے میں ان کے خلاف کسی حد تک رشک و رقابت کی فضا بن گئی اور انھیں نظر انداز کیا جانے لگا۔ جگر مراد آبادی نے ان سے کہا کہ ''مجروح یہ تم کہاں ترقی پسندوں کے چکر میں پڑے ہو۔ اس سے باہر نکلو اور ''عشق'' کو اپنی شاعری کا مرکز و محور بناؤ۔ عشق کے موضوں کو کبھی زوال نہیں''۔ مجروح صاحب نے کہا ''میں جگر صاحب کا بے حد ادب کرتا تھا اور ان کو بڑا شاعر مانتا تھا اس لیے میں نے عرض کیا کہ جگر صاحب میں نے جو کچھ سیکھا ہے آپ ہی سے سیکھا ہے لیکن جو میں کرنا چاہتا ہوں اس میں تو مجھے اجازت دیجیے کہ میں پنے طور پر کروں ۔اس پر جگر صاحب خاموش ہو گئے۔

اس کے بعد شیشے کے چھوٹے چھوٹے پیالیوں میں بغیر دودھ کی خوش رنگ چائے آئی۔ ساتھ ہی پلاسٹک کے ایک فٹ لمبے اور آدھا فٹ چوڑے شفاف ڈبے میں ایک درجن سے زیادہ انگریزی اور یونانی دوائیں آئیں ۔ دواؤں کو دکھا کر فرمایا۔ ''اب اتنی دوائیں ہر روز دن میں ایک سے زیادہ دفعہ لینا پڑتی ہیں۔ دوا کھانے کے بعد سو جاتا ہوں۔ پھر لڑکے سے کہا دوائیں لے جاؤ۔ آج میں دوا نہیں کھاؤں گا۔ ہم لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ میری دوائیں ہیں۔ یہ دوائیں لے جاؤ۔ میں نے بہ اصرار عرض کیا کہ دوا میں ناغہ نامناسب ہے آپ دوا ضرور لیں اور آرام فرمائیں۔ کہنے لگے آپ سے زیادہ موثر یہ دوائیں نہیں۔ آپ کو جلدی تو نہیں ہے میں نے عرض کیا کوئی جلدی نہیں۔ فرمایا کہ پھر کیا ہے بیٹھیے آج طبیعت آپ لوگوں سے مل کر بے حد خوش ہے۔ کبھی کبھی دوا میں ناغہ اچھا ہوتا ہے۔ آپ بیٹھیے۔

میں نے پوچھا اب آپ کی عمر کیا ہے؟ فرمایا۔ایک لحاظ سے اسی سال پورے کر چکا ہوں دوسرے لحاظ سے اناسی سال ہوئے ہیں ۔ میرے سارے رکارڈ میں سنہ پیدائش ۱۹۱۹ ہے لیکن ایک دفعہ میں نے اپنی والدہ ماجدہ سے پوچھا کہ ہماری پیدائش کا دن آپ کو تو یاد ہوگا۔انھوں نے فرمایا کہ '' بیٹے اتنا یاد ہے کہ جمعرات کا دن تھا اس کے بعد رات ہوئی اور ساڑھے چار بجے تم پیدا ہوئے۔ دوسرے دن جمعہ بھی تھا اور عید بھی''۔ مجروح صاحب نے کالی داس گپتا رضا صاحب سے پوچھا کہ بھئی ۱۹۱۷ سے لے کر ۱۹۲۱ تک عید جمعہ کے دن کب آئی۔انھوں نے تقویم دیکھ کر بتایا ایسا ۱۹۲۰ میں ہوا۔ اگر یہ درست ہے تو میری عمر اناسی سال ہوئی۔

بھوپال میں عالی معیار کے مشاعرے عام تھے جن میں جگرؔ، اصغرؔ اور اسی درجے کے دیگر شعرا تشریف لاتے ۔ اقبالؔ اس سے مستثنیٰ ہیں کہ وہ علاج کے سلسلے میں آیا کرتے تھے۔ اقبالؔ کے علاوہ جگرؔ مرادآبادی نے بھوپال کو زیادہ عزت بخشی ۔ جب بھی کسی مشاعرے کے سلسلے میں آتے ، دنوں ہفتوں قیام کرتے اور بھوپال جیسے نیم خوبیدہ۔نیم بیدار شہر میں ہلچل سی مچ جاتی ۔ان کا تانگہ یہاں کی سڑکوں اور گلیوں میں گھنگھرو جھنجھناتا گھومتا رہتا اور دیوان خانوں میں غزل کا ترنم لہراتا رہتا۔ مجروحؔ جگرؔ کے شاگرد تھے استاد کی اس روایت کو آگے بڑھایا، بھوپال کو اپنا وطن ثانی سمجھا اور آخر دم تک اس پر فخر محسوس کرتے رہے۔۱۹۴۹ میں بھوپال میں ترقی پسند مصنفین کی تین روزہ کانفرنس ہوئی ۔۱۹۳۵ کی کانفرنس کی طرح یہ کانفرنس بھی بہت اہم تھی ۔اس میں جوشؔ ملیح آبادی ،عصمت چغتائی ، کرشن چندر، مہندر ناتھ اور اسی صف کے جانے کتنے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی اور صدارت سید سلیمان ندوی نے ۔اس کانفرنس سے مجروحؔ کو بحیثیت غزل گو شہرت حاصل ہوئی ۔ اپنی دل آویز شخصیت، پروقار سادگی اور ساحرانہ ترنم کے ساتھ جب انھوں نے یہ غزل پڑھی جس کا مقطع ہے:

تقدیر کا شکوہ بے معنی جینا ہی تجھے منظور نہیں
آپ اپنا مقدر بن نہ سکے ایسا تو کوئی مجبور نہیں

تو مشاعرہ لوٹ لیا۔نفیس ململ کے کرتے اور بڑے پائینچے کے لٹھے کے پاجامے میں ملبوس اس نوجوان سے بار بار پڑھوایا گیا اور اسی رات سے وہ بھوپال کے محبوب شاعر بن گئے اور اس عظمت و محبت کی وجہ سے بھوپال ان کا وطن ثانی بن گیا۔اس کے بعد وہ بیسیوں مرتبہ بھوپال آئے۔سینکڑوں مشاعرے ان کے اعزاز میں منعقد کیے جاتے رہے اور اہل بھوپال فرمائش کر کر کے بار بار سنی ہوئی غزل سنتے رہے۔لیکن کبھی انھیں ہوٹ نہیں کیا۔ان پر فقرے بازی نہ ہوئی۔ان کی شان میں گستاخی نہ کی۔پچھلے کئی برسوں سے ان کے مخصوص ترنم نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔لیکن لوگ تحت میں ہی انھیں سن لیتے۔ان کا شعری سرمایہ بہت مختصر تھا۔پھر بھی سامعین ہزار بار کی سنی غزلیں اس طرح سنتے جیسے پہلی بار سن رہے ہوں۔

بھوپال نے ہی انھیں ان کی ادبی زندگی کے سب سے بڑے اعزاز ''اقبال سمان'' سے نوازا۔پھالکے ایوارڈ انھیں اس کے بعد یعنی ۱۹۹۷ میں ملا۔سمان کے موقع پر جو شعری نشت ہوئی اس میں مجروح صاحب کو سننے کے لیے اردو سے زیادہ ہندی داں افراد تھے اور مجروح کو اپنے پرانے شعری سرمایے پر ایک بار وہی داد ملی جو ابتدائی دور میں ملا کرتی تھی۔

آخری مرتبہ بھوپال ۱۹۹۸ میں تشریف لائے جب اختر سعید خاں کو ''اقبال سمان'' سے نوازا گیا (جیوری ایک ممبر خود مجروح سلطان پوری تھے) اس وقت وہ حکومت یا کسی ادارے کی دعوت پر نہیں ذاتی طور پر آئے تھے۔کہتے تھے ''یہ میرے بھائی کی زندگی کا سب سے اہم اعزاز ہے۔میں اپنی اور اس کی خوشی کے لیے آیا ہوں'' قابل داد بات یہ کہ منتظمین اور سامعین کے انتہائی اصرار کے باوجود وہ ڈائس

پر نہیں بیٹھے کہ بقول ان کے ''یہ اختر میاں کی تقریب ہے''۔ وضع داری ان میں اتنی تھی کہ کسی کی دعوت پہ آئیں، قیام اختر سعید کے گھر پر ہی ہوتا۔ اس گھر میں جہاں اسٹار ہوٹل کا سا آرام تو نہیں مل سکتا تھا لیکن خلوص، محبت، اپنائیت کی اتنی فروانی تھی کہ گھر کا بچہ بچہ ''مجروح چچا'' کی خدمت میں حاضر رہتا۔ وہ بھی سب میں گھلے ملے فلمی دنیا کی داستانیں سنا رہے ہیں، ممبئی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ شطرنج کی بازی جم رہی ہے۔ بچوں سے چھوٹی چھوٹی فرمائشیں ہوتیں۔ کہتے :

''جاؤ بچو ہمارے لیے نیم کے تنکے بین کے لاؤ۔ ہم انھیں ممبئی لے جائیں۔ اس سے ہم خلال کرتے ہیں''

اس کے بعد تو گھر کا ہی نہیں محلے پڑوس کا بھی بچہ نیم کی چھاؤں تلے ہی نظر آتا۔ ایک ''آڑے وقت'' میں تنکے ہمارے محلے سے بھی ان کے لیے گئے تھے۔

اسرار حسن خاں جو بعد میں مجروحؔ سلطان پوری کے نام سے شہرت اور مقبولیت کی بلند ترین چوٹی تک پہنچے۔ یکم اکتوبر ۱۹۱۹ سلطان پور میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے کی رسم کے مطابق انھیں مدرسے میں داخل کیا گیا جہاں انھوں نے اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی بعد ازاں وہ لکھنؤ گئے اور یہیں کے جھوائی ٹولہ میں واقع طبیہ کالج سے طب اور حکمت کی سند سے سرفراز ہوئے۔ کچھ دنوں تک ان کا قیام سلطان پور سے متصل ضلع اعظم گڑھ میں بھی رہا۔ اس زمانے میں اعظم گڑھ کی علمی و ادبی فضا اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ علامہ شبلی نعمانی کی درخشاں یادگار دارالمصنفین میں برصغیر کے ناموران علم و ادب حاضری دیا کرتے تھے اور علامہ شبلی نعمانی کے دو یگانۂ روزگار شاگردوں علامہ سید سلیمان ندویؒ اور ''شعر الہند'' اور ''اقبال کامل'' والے مولانا عبدالسلام ندوی سے جی بھر کے فضیاب ہوتے۔ علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے علاوہ اعظم گڑھ شہر میں اس وقت علامہ اقبال سہیل اور مرزا احسان بیگ جیسے تشریحات و توضیحات زندگی کے علم بردار شعرا کی موجودگی سونے پر

سہاگہ بنی ہوئی تھی۔ظاہر ہے مجروح سلطان پوری کے ذہن پراس پرے بھرے علمی وادبی ماحول کا خاطر خواہ اثر پڑا ہوگا۔

مجروح سلطان پوری کے محسن عظیم مرحوم جگر مرادآبادی کی ذہنی وفکری تربیت بھی اعظم گڑھ میں ہوئی۔ان دنوں مرحوم جگر مرادآبادی چشمے کا کاروبار کرتے تھے۔چشمے کے کاروبار کے سلسلے میں وہ اعظم گڑھ اکثر آتے اور یہاں کے رفیع الشان علمی وادبی ماحول کے ہاتھوں گرفتار ہوکر ہفتوں یہاں قیام کرتے۔چوں کہ جگر مرادآبادی ذہین تھے شعر گوئی کا ملکہ خداداد تھا لہجے میں رچاؤ اور شائستگی تھی اور سب سے بڑھ کر ان کی نہایت خوبصورت، مترنم اور غنائی آواز نے اہل دانش وبینش پر بھر پور اثر کیا۔اعظم گڑھ کے ادبی وشعری ماحول نے جگر کو اچھال دیا۔اور جب ان کا اولین شعری مجموعہ ''داغ جگر'' چھپا تو وہ برصغیر کے نامر شعرا کی صف میں شامل ہو گئے ایک ذہن میں رکھیے کہ ''داغجگر'' کا دیباچہ اعظم گڑھ کے مرزا احسان بیگ نے ہی لکھا تھا۔اسی زمانے میں مجروح سلطان پوری مرحوم جگر مرادآبادی کے ہاتھ لگے۔ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن روشن ہوا۔ہمیشہ یہ ادب کا کارواں اسی طرح آگے بڑھا۔اگر اعظم گڑھ کے اکابر شعرا وادبا نے جگر مرادآبادی کو جگر مرادآبادی بنایا تو ادب کا یہ احسان انھوں نے اس طرح اتارا کہ حکیم اسرار حسن خاں کو مجروح سلطان پوری میں تبدیل کر دیا۔جگر مرادآبادی کے مشورے پر ہی علی گڑھ تہذیب کی آبرو مرحوم رشید احمد صدیقی نے مہینوں مجروح سلطان پوری کو علی گڑھ میں اپنے یہاں ٹھرایا۔

اعظم گڑھ کے لطیف اور خوش گوار علمی وادبی ماحول نے مجروح سلطان صاحب کے نورستہ اور خیز ذہن کو نوک پلک سے درست کیا۔جگر مرادآبادی نے انھیں شعروشاعری کا کس بل عطا کیا اور مرحوم رشید احمد صدیقی نے تہذیبی وثقافتی قدروں کی پاسداری کا انھیں ہنر سکھایا۔نتیجہ یہ سامنے آیا کہ مرحوم مجروح سلطان پوری نے ایک طرف اگر فن غزل گوئی کو اپنے تو بہ تہ داور تازہ بہ تازہ افکار وخیالات اور

گہری دروبینی سے گراں بہا کیا تو دوسری طرف تہذیبی وثقافتی اقدار کو بطریق احسن سینے سے لگائے رکھا۔ جن حضرات نے مجروحؔ سلطان پوری کو قریب سے دیکھا۔ انھیں ان کی شخصی خوبیوں کا علم ضرور ہوگا۔ اپنے بھر پور قد وقامت کو صاف وشفاف سفید کرتا اور چوڑے پائینچے کے پاجامے سے انھوں نے کبھی علاحدہ نہیں ہونے دیا۔ ان کے گول مول بھرے بھرے چہرے اور قاعدے اور قرینے سے سنوارے جانے والے کھچڑی بال ان کی خوبصورتی میں بڑا اضافہ کرتے تھے۔ ان کی انا تو اس درجے کی تھی کہ کھوٹی باتوں پر اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتے جو بات ناپسندیدہ ہوتی تھی اس پر گہرے ردعمل کا ظہار کرنے میں چوکتے نہیں تھے ایسے تھے۔ کھری اور بھر پور شخصیت کے مالک غزل کے بانکے اور سجیلے شاعر مجروحؔ سلطانپوری ۔

مجروح کی شاعری کا یہ بہت بڑا کمال ہے جب وہ کہتے ہیں:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا

تو اس شعر میں شاعرانہ اعجاز نظر آتا ہے۔

مجروح ۱۹۴۵ میں ایک مشاعرے میں ممبئی آئے میرے آنے کا مقصد صرف مشاعرے میں شرکت کرنا تھا۔ اس وقت ان کی عمر شاید ۲۵ یا ۲۶ سال ہوگی۔ جگر صاحب کے توسط فلمی دنیا سے تعارف ہوا۔ گئے تھے مشاعرہ پڑھنے، اسی مشاعرے میں فلم ہدایت کار عبدالرشید کاردار صاحب نے کلام سنا اور پسند کیا اور انھوں نے خواہش ظاہر کی ان کی فلم شاہجہاں کے لیے گانے لکھوں۔ لہذا پانچ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پر انھوں نے مجھے ملازم رکھ لیا۔ میں نے اس فلم کے گانے لکھے یہ میری پہلی فلم تھی۔ فلم اور

گانے بہت پسند کیے گئے۔

پہلا گانا میں نے نوشاد کے طرز پر لکھا تھا۔اس گیت کے بول کچھ یوں تھے:

کر لیجیے چل کر میری جنت کے نظارے
جنت جو بنائی ہے محبت کے سہارے

اس فلم کے سب گانے بے حد مقبول ہوئے۔سہگل کی آواز میں یہ گانا 'غم دیے مستقل کتنا نازک ہے دل' یا 'جب دل ہی ٹوٹ گیا' اب جی کے کیا کریں گے۔وغیرہ۔اس کے بعد تو فلموں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔جو تقریباً پینتیس سال پر محیط ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

مجروح وقت بڑا بلوان ہے جو لوگ اس کی قدر کرتے ہیں اور وقت کے مزاج سے سمجھوتا کر لیتے ہیں وہ یقیناً کامیاب ہوتے ہیں۔کامیابی کا دوسرا بڑا راز ہے ایمان داری،محنت،لگن اور اپنے کام کو عبادت سمجھ کر انجام دینا اور شاید بہت حد تک میں نے اسی فارمولے پر عمل کیا۔میں نے فلموں کو معیاری غزلیں اور ایسے گیت بھی دیے جو فلم کی ضرورت تھے۔شعر و شاعری اور موسیقی سے مجھے بچپن سے بے حد دلچسپی تھی۔اسکول میں نظمیں ترنم سے پڑھا کرتا تھا۔کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اگر کلاس میں ماسٹر صاحب کوئی مصرعہ ناموزوں پڑھتے تھے تو میں انھیں ٹوک دیتا تھا۔لیکن شاعری میرا پیشہ بن جائے گا یہ کبھی نہیں سوچا تھا۔مجروح میں فطری شاعر ہوں حکمت اور مولویت میں نے والد صاحب کی وجہ سے پڑھی۔کیوں کہ وہ تحریک خلافت سے وابستہ تھے اور مغربی تعلیم کے خلاف تھے۔وہ مجھے مولوی بنانا چاہتے تھے لہذا مجھے مولویت پڑھنی پڑی۔ابھی مولوی کی پگڑی بندھنے میں کچھ وقت باقی تھا کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مجھے مدرسے سے نکال دیا گیا،اس کے بعد ۱۹۳۶ میں میں نے لکھنؤ طبیہ کالج میں

داخلہ لے لیا۔ وہاں سے حکمت کی سند حاصل کر کے ٹانڈہ میں پریکٹس شروع کردی۔ لیکن شعروشاعری، مشاعرے مجھ پر حاوی رہے۔ ایک مشاعرے کے سلسلے میں ممبئی آنے کا اتفاق ہوا اور یہیں میری دال روٹی کا انتظام بھی ہوگیا۔

مجروح مدرسوں میں عام طور پو مولوی صاحبان کچھ زیادہ سختی روا رکھتے ہیں۔ میں جس مدرسے میں پڑھتا تھا نہایت گھٹا ہوا ماحول تھا۔ سر گنجا، ٹخنوں سے اوپر پاجامہ پہننا لازمی۔ کھلینا ناجائز، ہنسا منع ، کسی لڑکے سے مذاق کرنا منع ، اوپر سے مولوی صاحب نہایت سخت مزاج اصلوں کے غلام انسان تھے۔ میری جو شامت آئی میں ایک لڑکے سے مذاق کرلیا۔ اس نے مولوی صاحب سے شکایت کردی۔ وہ گرھتے ہوئے آئے کس نے یہ مزاق کرنے کی ہمت کی اور اٹھالیا بیت۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ یوں تھا کہ میرا ایک ہاتھ ان کی بیت پر اور دوسرا گردن پر تھا، وہ نیچے میں اوپر۔ بس نکال دیا گیا مدرسے سے۔
مجروح ابتدا میں مجھے بھی یہ خدشہ تھا اس لیے میں نے فلموں کے گیت لکھنے سے انکار کردیا تھا۔ لیکن جگر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ نہ تمہیں حکمت سے دلچسپی ہے اور نہ تمہارے پاس کوئی ڈگری ہے جس سے تمہیں نوکری مل سکے لہذا یہ اچھا موقع ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اس طرح میں فلمی شاعر بن گیا ۔لیکن میں نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ میرے فلمی گیتوں سے میری ادبی شاعری کی عظمت مجروح نہ ہو۔

''شمیم جہاں نے مجروح سے سوال کیا کہ رشید احمد صدیقی کا ایک مضمون ''جدید غزل'' کے عنوان سے رسالہ 'فکر و نظر' میں شائع ہوا تھا۔ وہ میری نظر سے گزرا، جس میں رشید احمد صدیقی صاحب نے کہا تھا کہ ''مجروح غزل کے آداب سے انحراف کرتے ہوئے مضحکہ خیز حد تک بے سرے ہوجاتے ہیں۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟
مجروح نے جواب میں شعر پڑھا ؎

تجھے نہ مانے کوئی تجھ کو اس سے کیا مجروحؔ
چل اپنی راہ بھٹکنے دے نکتہ چینوں کو"

(۱)

مجروح کو شکار، شطرنج اور تاس کھیلنا بہت پسند ہے۔ مچھلی کے شکار پر اکثر جاتے، کبھی کبھی رائفل لے کر جنگل میں شکار کے لیے جاتے۔ رات کے کھانے کے بعد مطالعہ بھی کرتے۔
مجروح صاحب کی بیگم فردوس بہت مہذب، ملنسار، مہمان نواز اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ ان کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ ان کے ایک جوان بیٹے کی موت ناگہانی نے انھیں ایک دم توڑ دیا تھا۔
اسلم جمشید پوری کے مطابق مجروح سلطان پوری جن کا اصل نام اسرارالحسن خاں تھا، کی پیدائش اعظم گڑھ میں ۱۹۱۹ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں حاصل کرنے کے بعد آگے کی تعلیم کے لیے فیض آباد اور الہٰ آباد گئے اور عربی کے امتحانات مولوی اور عالم پاس کیے۔ پھر لکھنؤ پہنچ کر طب یونانی کی تعلیم حاصل کی اور بعد میں اسی کو پیشہ کے طور پر اختیار کیا۔ لیکن یہ زندگی راس نہیں آئی۔ شاعری شروع کی اور بہت جلد مقبول ہوتے گئے۔ ۱۹۴۵ میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے ممبئی گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کا وہ عزم تو ہمارے ساتھ ہمیشہ رہے گا جس میں وہ اکیلے ہی جانب منزل سفر کرتے ہیں اور قافلہ بنا لیتے ہیں :

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا"

(۲)

(۲،۱) "گلکاری دحشت کا شاعر" مجروح سلطانپوری؛ مرتب خلیق انجم ص ۲۹۶، ۳۱۶

مجروحؔ نے کسی بھی تقلیدی رجحان کے تحت خود کو شعوری طور پر نہیں بدلا جیسا کہ اپنی منفرد غزل گوئی کے بارے میں ان کا اپنا ادعا تھا ''غزل کے موضوع پر پہلی بار نئے موڑ کا آغاز میری شاعری میں ہوا'' کے مصداق مجروحؔ نے ثابت کر دکھایا۔

اسی لہجے میں مخدوم بھی بولنے لگے :

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

تراکیب لفظی کے حوالے سے مجروحؔ میں کسی کو غالبؔ کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ بعض نقادوں کو ان میں غالب کے تیور نظر آ گئے۔

سرسید، عبدالحق، سید محی الدین قادری زور، غالب، اقبال اور جوش ایسی ہستیاں ہیں جنھوں نے زبان حال سے کہا تھا ''ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں'' ایسی منفرد شخصیتیں اکیلے ہی اپنے اسلوب اور کردار کا علم لے کر اٹھتی ہیں بعد۔ میں ان کی بے پناہ مقبولیت کے باعث ان کی اتباع میں ان کے پیچھے چلنے والوں کا کارواں بن جاتا ہے۔ لوگ ساتھ آتے گئے۔

مجروحؔ کا یہ شعر اردو دنیا کا مقبول ترین اور زبان زد خاص و عام شعر ہے۔ ترقی پسند نظم گو شاعروں نے نہ جانے کتنی معرکتہ الآرا نظمیں کہی ہوں گی لیکن مجروح کی غزل کا یہ ایک شعر عوام و خواص کے دلوں میں جا گزیں اور ذہنوں پر نقش ہو گیا۔ شاید یہ زندہ فکر کی ایک سچی مثال ہے۔ مجروحؔ اپنے ہم عصر شاعروں میں ممیّز اور ممتاز شاعر تھے اس لیے کہ انھوں نے غیر فطری رجحانات اور مصنوعی شعری

رویوں سے نہ صرف گریز کیا بلکہ اپنی روش کے خود خالق ہوئے۔ مجروحؔ کے گلے میں جو سوز تھا وہ ان کے شعروں میں بھی ہے۔ جب مشاعروں میں وہ اپنی غزل سنانے لگتے تھے تو سماں بندھ جاتا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود ان کی غزلیں روایتی تغزل اور رومانیت سے بالکلیہ مبرا نہیں رہیں۔

فیضؔ عالمی سمینار لکھنؤ کے عالمی مشاعرے میں مجروح صدارت کر رہے تھے۔ جب ناظم صدر سے اپنا کلام سنانے کی درخواست کی تو صدر بے ساختہ بول پڑے ''ارے بھئی، ابھی شہریار رہ گئے ہیں'' مگر ناظم نے دوبارہ ان سے درخواست کی۔ مجبور ہو کر وہ مائک پر آئے اور بولے ''ناظم مشاعرہ کی دوبارہ درخواست پر میں آ گیا ہوں۔ مگر یہ کلیہ نہیں ہے کہ صدر کے پڑھنے کے بعد مشاعرے کی کاروائی ختم سمجھی جائے۔ مجھے سننے کے بعد آپ سب اطمینان سے شہریار کو سنیے'' اتنا کہ کر انھوں نے اپنا کلام سنایا اور سامعین سے پھر کہا ''اب آپ لوگ شہریار کو سنیے'' مگر فوراً ہی ناظم مشاعرہ نے مشاعرے کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ شہریار کو کیوں نہیں پڑھنے دیا گیا۔ اس کی وجہ تو معلوم نہیں ہو سکی مگر اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجروحؔ کے دل میں ہر شاعر کے لیے کتنا احترام تھا کہ وہ شہریار کو سننے کے لیے اس روایت کو بھی توڑنے کے لیے تیار ہو گئے تھے کہ صدر مشاعرہ کے کلام کے بعد مشاعرے کی کاروائی ختم ہو جاتی ہے، نیز ان کے ذہن کی بھی داد دینا پڑے گی کہ انھیں بخوبی یاد تھا کہ شہریار نے اپنا کلام نہیں پڑھا تھا۔

فراقؔ عالمی سمینار لکھنؤ کے عالمی مشاعرے میں دعوت نامہ ہونے کے باوجود راقم شرکت نہیں کر سکا تھا۔ البتہ اگلے روز راقم اس تقریب میں موجود تھا جو آنجہانی رام لعل نے گوپی چند نارنگ کے اعزاز میں حضرت گنج کے ایک ریستوراں میں منعقد کی تھی کیوں کہ ان کو پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ یہ آنجہانی رام لعل کی ہر دلعزیز کا ثبوت تھا کہ ان کی دعوت پر دنیائے اردو کی تقریباً ہر نامی گرامی شخصیت نے شرکت کی تھی (البتہ راقم کا شمار اس فہرست میں نہیں تھا) اسی شام ارم پبلک اسکول، اند

رانگر میں ایک مشاعرہ تھا جس کیں ظامت ملک زادہ منظور احمد کررہے تھے۔ مجروحؔ قدرے تاخیر سے پہنچے۔ ملک زادہ کو دیکھتے ہی وہ بے ساختہ بول پڑے ''یا وہ جگہ بتادے جہاں 'تو' نہ ہو''۔ 'تو' کے زور پر سب ہنس پڑے۔ مجروحؔ کا مطلب تھا کہ کیا کوئی ایسا بھی مشاعرہ ہے جس کی نظامت ملک زادہ نہ کر رہے ہوں۔ 'چائے پانی' کے دوران راقم نے مجروحؔ سے چند سوالات کیے جن کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ ''بہت پہلے ایک فلمی رسالے نے خبر شائع کی تھی کہ آپ ایک حسین شاعرہ کی زلفوں کے اسیر ہو گئے ہیں اور اس کے عوض آپ نے اسے پچیس تیس ہزار کے تحائف سے نواز دیا ہے۔ کیا یہ خبر صحیح تھی کیوں کہ اس کی اور آپ کی عمر میں کافی فرق تھا۔

''دراصل مدیر رسالہ نے مجھ سے وقت طے کرلیا تھا مگر مقررہ وقت سے پہلے وہ شاعرہ آ گئی۔ اسے ایک کام کے سلسلے میں میری مدد درکار تھی۔ چناں چہ میں اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔ ناراض ہوکر مدیر نے بات کا بتنگڑ بنا دیا تھا۔

جب مدیر آپ سے وقت طے کر چکا تھا تو آپ کو اس سے مل کر جانا چاہیے تھا۔''

''میں نے سوچا کہ مدیر تو ہر ماہ کئی روز کے لیے آتا رہتا ہے اس سے اگلے روز یا اگلے ماہ مل لوں گا۔ شاعرہ پہلی مرتبہ ممبئ آئی تھی۔

کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی ہوا ہوگا ورنہ مدیر رائی کا پربت بنا کر پیش نہ کرتا''

میں فرشتہ تو نہیں ہوں، گوشت پوشت کا انسان ہوں، اوپر سے شاعر بھی لہٰذا میرے اندر رومانی عناصر ہونا بھی لازمی ہیں مگر جو کچھ ہوا تھا مدیر نے اس کو بہت بڑھا چڑھا کر شائع کر دیا تھا۔

مجروحؔ صاحب سلطانپور کی ایک ایسی برادری سے تعلق رکھتے تھے جو کہ عرف عام میں ''بھالے سلطان'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ برادری اپنی بے باکی و بے خوفی اور جنگجویانہ اسپرٹ کے لیے مشہور تھی اور اس کی مناسبت سے مجروحؔ صاحب اس کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔

مجروحؔ صاحب کی ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ کے مدرسہ باغ میر ٹیپو میں ہوئی جہاں ان کے والد پولیس ڈپارٹمنٹ میں تعینات تھے۔ طبی تعلیم کی فراغت انھوں نے جھوائی ٹولہ لکھنؤ سے کر لی۔

ابتدائی شاعری کے زمانے میں اکثر و بیشتر ان کا قیام ردولی شریف میں ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی مصنف ''شبلی۔ایک دبستان''، چودھری ماہتاب احمد صدیقی اور چودھری اویس احمد صدیقی مرحومین کے دولت کدے پر رہا کرتا تھا اور یہیں انھیں پہلی بار دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ان کی سیرت و شخصیت اور شاعری پر پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مرحوم جگرؔ مرادآبادی کا اثر بہت زیادہ ہے جس کا صدق دل سے انھوں نے اعترف کیا ہے۔

مجروحؔ صاحب کے اس شعر کو جو مقبولیت حاصل ہے اس ضمن میں یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ ان کے معاصرین میں سے کسی شاعر کے کسی ایک شعر کو اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔اس حیثیت سے ان کا شاعرانہ قد مزید بڑھ جاتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت نے اپنے پیر جمانے شروع کئے اس کی بنیاد ترقی پسند تحریک کی مخالفت پر ٹکی ہوئی تھی اس رجحان کے سالار اعلیٰ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس ترقی پسند شاعر پر مضمون لکھا۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔

پاکستان کے نقاد اور شاعر انیس ناگی نے مجروح کو تیسرے درجے کا شاعر کہا اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی مجروح کے مثبت پہلوؤں کو نمایاں کرنے سے گریز کیا۔ناگی کی بات الگ ہے لیکن پروفیسر گوپی چند نارنگ کی خاموشی کی وجہ میرے خیال میں مجروح کے حق میں فاروقی کی توصیفی تحریر ہے۔ترقی پسند تحریک کے حامیوں نے مجروح پر دیر سے سہی لیکن مضائین لکھے۔ان میں کئی بڑی ہستیوں میں پروفیسر محمد حسن صاحب کا نام بھی نمایاں طور پر لیا جائے گا۔وہ ایک اچھے ڈراما نگار شاعر اور نقاد ہیں۔وہ مجروح کے بارے میں ررقم طراز ہیں:

''اہل اقتدار جبر واستبداد کے کتنے ہی حربے کیوں نہ آزمائیں لیکن تاریخی قوتیں محنت کش کے حق میں ہیں اوران کی فتح لازمی ہے، گواس فتح تک پہنچنے کا راستہ سخت اور دشوار گزار ہے۔ اوراس راہ کے مصائب بے شمار اور بے انتہا ہیں۔ لیکن جواس راہ میں قدم رکھتے ہیں ان کی حق گوئی اور پامردی تاریخی قووتوں سے ہم آہنگ ہونے کے سبب سے اجتماعی استناد حاصل کرتی ہے اور لوگ ساتھ آتے جاتے ہیں کارواں بنتا جاتا ہے۔ ان کے اسلاف راجپوت تھے چوں کہ یہ بیان خود مجروح کا ہے اس لئے یہ مان لینا چاہئے کہ مجروح نسلاً راجپوت تھے۔ مجروح کے بیان کے مطابق تعلیم ان کی سات پشت میں نہ تھی، بہت ہوا تو کسی نے مڈل پاس کرلیا۔ مجروح کو ابتدا میں قصبہ ہی کے ایک مدرسہ میں داخل کرایا گیا، جہاں انہوں نے عربی فارسی اور اردو کی تعلیم کی ابتدا کی۔ ۱۹۳۳ میں مجروح طبیہ کالج میں طب کی تعلیم کے لئے داخل ہوئے۔ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مجروح نے طب کی تعلیم مکمل کی تھی اور اپنے وقت کے ایک ذہن طالب علم ثابت ہوئے تھے، خصوصاً طبابت کے معاملے میں۔ اس سلسلے میں خلیق انجم کا بیان ہے کہ طالب علمی ہی کے زمانے میں انہوں نے طب میں ایسی مہارت حاصل کرلی تھی کہ جھوئی ٹولے کے بڑے طبیب شفاالمسلمین حکیم عبدالعید جب کسی علاج کے سلسلے میں باہر تشریف لے جاتے تو مجروح کو اپنی کرسی پر بٹھا کر جاتے۔''(۱)

خلیق انجم کہتے ہیں:

''مجروح سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۵ میں ہوئی جب وہ انجمن ترقی اردو کی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے جگر مرآبادی کے ساتھ ممبئی آئے تھے۔ رات کو مشاعرہ تھا۔ جب مجروح کے نام کا اعلان ہوا تو مجمع نے ذرا ضرورت سے زیادہ تالیاں بجائیں۔ کچھ لوگ ہنسے، لیکن مجروح نے اپنی غزل چھیڑ دی اور ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ تالیان بجانے والے اور ہنسے والے شرمندہ ہو گئے۔ شاعر کی خوداعتمادی نے میدان جیت لیا۔ شاعر خوش گو بھی تھا اور خوش گلو بھی۔ خوش پوش بھی اور خوش رو بھی۔

---

(۱) مجروح سلطانپوری 'البیلا غزل گو' مجموعہ ''غزل'' سے ماخوذ ص ۶

سونے پر سہاگا، جگر خوش ہوئے اور مولانا حسرت موہانی نے جی کھول کر داد دی۔‘‘

معین احسن جذبی بتاتے ہیں کہ چالیس بیالیس سال پہلے کی بات ہے جگر صاحب علی گڑھ تشریف لائے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے یہاں قیام کیا۔ ان کے ہمراہ ایک خوش پوش نوجوان شاعر بھی تھا۔ کچھ دنوں کے بعد جگر صاحب تو چلے گئے لیکن اُدنوجوان شاعر کو رشید صاحب کے پاس ہی چھوڑ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ابھی اسے علیگڑھ کی ادبی فضا اور رشید صاحب کی ذہنی تربیت کی ضرورت ہے۔ یہ نوجوان شاعر کوئی اور نہیں بلکہ مجروح ہی تھے۔

مجروح اپنے ترنم کی وجہ سے بہت جلد علیگڑھ میں مقبول ہوگئے۔ جہاں بھی کوئی شعری نشست ہوتی وہاں وہ ضرور بلائے جاتے۔ کیا پرسوز آواز تھی اور اس آواز میں کس بلا کا جادو تھا۔ لوگ گھنٹوں دم بخود سنتے رہتے، اکثر فرمائش ہوتی کہ مجروح صاحب وہ نظم سنائیے۔

گائے جا پپیہے گائے جا

آج مجروح سے اگر اس نظم کی فرمائش کی جاتی کبھی نہیں سناتے لیکن اس زمانے میں بڑے فخر اور دل کی گہرائیوں کے ساتھ سناتے تھے۔ خود بھی لطف اٹھاتے اور دوسروں کو بھی محظوظ کرتے۔

ابتدا میں ہر شاعر اپنے متعلق نہ جانے کن کن غلط فہمیوں کا شکار رہتا ہے۔ مجروح کو بھی غلط فہمیاں رہی ہوں گی۔ ان غلط فہمیوں کو علیگڑھ نے بڑی حد تک دور کیا۔ وہ جب یہاں سے گئے تو شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے ذہن میں شاعری کا ایک اعلیٰ معیار ضرور تھا۔

کچھ عرصے کے بعد یہ سننے میں آیا کہ جگر صاحب کی کوششوں اور سفارشوں سے مجروح کو فلمی دنیا میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ اس طرح وہ فکر معاش سے آزاد ہوگئے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اس شعر میں خود اعتمادی کے ساتھ غرور نہیں بلکہ بانکپن ہے۔

مجروح اردو شعرا کے زمرے میں مشاعروں کے راستے داخل ہوئے، کافی ہاؤس، اور ادبی تحریکوں اور ادبی مجالس کے ذریعے نہیں۔ چنانچہ ان کی شہرت بہت تیزی سے پھیلی اور اس کے پھیلنے میں کسی کے پھیلانے کو دخل نہ تھا۔

مرزا سلیم بیگ کے ایک سوال کے جواب میں مجروح نے بتایا:

"والد میرے پولیس میں تھے، والدہ میری گاؤں کی تھیں۔ تعلیم میری سات پست میں نہیں، بہت ہوا تو مڈل پاس کر لیا اور ہمارے ہاں چونکہ آبائی مزاج سپہ گری تھا تو سپہ گری میں تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک عام مزاج تھا اسی لئے تعلیم آپ کو پرانے زمانے میں نہیں ملے گی۔ جب میرے والد نے نڑھانا چاہا تو ایسا ہوا کہ جب تحریک خلافت چلی تھی اس زمانے میں جب تمام بدیسی کپڑے جلائے گئے تھے اور انگریز کی تمام چیزیں جلا جلا کر پھینک دی گئی تھیں تو میرے والد بھی اس تحریک سے وابستی تھے حالنکہ تھے پولیس میں مگر تھے تو ہندوستانی، تو انھوں نے کہا کہ بھئی اپنے بچے کو انگریزی نہیں پڑھاؤں گا۔ یہ میرے لئے ایک ہینڈی کیپ ہو گیا بہر کیف! انھوں نے اردو فارسی کی کتابیں دلائیں مجھے، وہ تعلیم میں نے حاصل کی مگر ابھی دو سال باقی تھے تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی دو سال بعد مجھے پگڑی بندھتی جو علما کی پگڑی ہوتی ہے، تو میں مولوی ہوتے ہوتے بچ گیا شکر ہے خدا کا۔"

---

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۶۲

جائے پیدائش تو مجھے معلوم ہے ضلع آعظم گڑھ (یوپی) میں میرے والد تھے، رہنے والے تو ہم سلطان پور کے ہیں، بس آعظم گڑھ سے سرحد ملی ہوئی ہے زیادہ دور نہیں ہیں وہاں سے جہاں کے علامہ شبلی وغیرہ ہیں، پورا ضلع ہی بہت پڑھے لکھے لوگوں کا ہے تو وہاں میں پیدا ہوا اور ابتدائی تعلیم میرے والد نے وہیں ایک پرائمری اسکول تھا درجہ چہارم تک میں نے وہاں سے اردو وغیرہ کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد ''شبلی منزل'' جو کہ ضلع آعظم گڑھ میں ہے تو شبلی منزل میں ایک مولوی مسعود ندوی تھے تو ان سے میرے والد نے مجھے عربی پڑھوانا شروع کر دی اس زمانے میں ایک کتاب ہوا کرتی تھی ''اسباق النحو'' اور ''اسباق الصرف'' تو دو کتابوں سے ابتدا کی اور ایک مولوی مصطفیٰ صاحب ہوا کرتے تھے میرٹھ میں ان سے فارسی شروع کی یوں ہماری تعلیم کی ابتدا آعظم گڑھ سے ہوئی اور اس کے بعد ہمارے والد کا ایک ایسے تھانے میں ہو گیا جہاں دور دور تک کوئی اسکول یا کالج نہیں تھا، تو میری بڑی بہن بیاہی گئی تھیں فیض آباد میں ایک بہت مشہور قصبہ تھا ''ٹانڈا'' وہاں کی کامدانی بہت مشہور تھی بالکل اسی طرح جیسے ڈھاکہ کی ململ کسی زمانے میں بہت مشہور تھی، تو ٹانڈا سے کوئی تین میل دور ایک زمینداروں کی بستی تھی، وہاں ہماری بہن بیاہی گئی تھیں اور ٹانڈا میں مدرسہ بہت اچھا تھا اور وہاں عربی تعلیم بہت عمدہ دی جاتی تھی، لہٰذا مجھے وہاں بھیج دیا گیا۔ پھر جو کچھ تعلیم میں نے حاصل کی وہ ہیں سے حاصل کی فارسی، عربی وغیرہ۔ منتہی عربی کا نہیں، فقہ میں ''ہدایہ'' اور ادب میں ''مقامات حریری'' اور تفسیر پڑھی۔ بس یہاں تک۔ پھر میں نے چھوڑ دی تھی۔

مرزا سلیم بیگ کے سوال آپ کا تخلص ہے ''مجروح'' یہ کس حوالے سے منتخب کیا۔ خود ہی انتخاب کیا یا کسی نے آپ کو بطور اعزاز دیا کے جواب میں مجروح صاحب فرماتے ہیں کہ بس ایسا ہی کچھ ہوا میرا نام اسرار ہے، اس زمانے میں تقسیم سے پہلے ہم اقلیت میں رہ کر بھی اکثریت پر بھاری تھے ،تہذیبی طور پر ادبی محفلیں ہوتی تھیں، مشاعرے ہوتے تھے، تو وہاں سلطانپور میں بھی مشاعرے ہوا کر

تے تھے۔ ایک دن ہمارے جی میں آیا کہ ہم بھی مشاعرہ پڑھیں گے، تو ہماری غزل بہت چل گئی صاحب! اس کے بعد ہم نے دوبارہ غزل کہی وہ بھی پسند کی گئی تو یوں ہم چل نکلے۔ اب یہ ہوا کہ اسرار تخلص تو نہیں چلے گا۔ یہ بات ہے نومبر ۱۹۳۹ کی۔ اس وقت ہم دو تین غزلوں کے شاعر تھے، تو اس مسئلے پر ہمارے دوستوں کا بورڈ بیٹھا کہ بھئی ان کا تخلص ڈھونڈا جائے۔ اچھا اس وقت میرا اردو کا مطالعہ بالکل نہیں تھا۔ صرف درسی کتابیں ہی پڑھی تھیں، مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میر مہدی مجروح بھی کوئی گزرے ہیں۔ لہٰذا لوگوں نے بیٹھ کر، اچھا اس بورڈ میں یہاں کراچی کے ایک سوز شاہجہانپوری بھی تھے، اس لئے کہ ان کا سسرال وہیں تھا، تو ان سب نے مل کر میرا تخلص رکھا اس کو سب نے او۔ کے کیا ۔اس کے بعد میرا تخلص مجروح ہو گیا اور یہ دوستوں نے تکھا میں نے نہیں رکھا میں تو ''اسرار'' تخلص ٹھیک سمجھتا تھا۔

مرزا سلیم بیگ کے سوال آپ نے اپنا سن پیدائش نہیں بتایا کے جواب میں مجروح فرماتے ہیں کہ میری اماں بہت سیدھی سادی تھیں۔ والد نے پنڈتوں سے میری پتری وغیرہ بھی بنوائی تھی وہ کہیں گم ہو گئی۔ اب والدہ پوچھا کہ ہم کب پیدا ہوئے تھے کہنے لگیں جمعہ کا دن رہا، تیسرے دن عید تھی۔ اب ہم نے اپنی بہنوں سے پوچھا تو ہماری یہ بہن جو ہیں، وہ ہم سے ڈھائی سال بڑی ہیں اب ڈھائی سال کم جو لگاتے ہیں تو اس کے حساب سے سن ۱۹۲۱ ہونا چاہیے لیکن اندازہ کر کے ہم نے سن ۱۹۱۹ مشہور کر دیا اور ہمارے جتنے بھی انٹرویو اب تک ہوئے ہیں سب میں سن ۱۹ ہی بتایا ہے۔

مرزا سلیم بیگ کے سوال شاعری سے لگاؤ کیسے ہوا کے جواب میں مجروح فرماتے ہیں:

''دیکھئے! موزوں طبیعت تو شاید بچپن سے ہی تھی اس لیے کہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میں تیسرے درجے میں پڑھتا تھا تو ٹیکسٹ بک میں ایک نظم پڑھائی جا رہی تھی تو پرائمری اسکول کے ٹیچر کی تعلیم ہی کیا ہوتی ہے؟ تو وہ شعر کو غیر موزوں پڑھ رہے تھے، میں نے ان سے کہا کہ نہیں ماسٹر

(۲،۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۶۲، ۲۶۳

صاحب ایسے نہیں ایسے ہونا چاہیے۔ وہ کوئی نظم تھی جگنو کے متعلق، اب یاد نہیں ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جب کوئی گیت یا گانا بج رہا ہوتو اس کی جو بیٹ ہوتی ہے "ردہم" اس سے ایک کرنٹ مجھے محسوس ہوتا تھا تو موزونیٔ طبع تو مجھ میں تھی شروع سے ہی۔ سلطان پور میں یہ حادثہ ہوا کہ اچانک ہم ایک ایسے ماحول میں پہنچ گئے جہاں مشاعرے ہوتے تھے، طرح رکھی جاتی تھی، تو یہ سب ہوا۔ لیکن حادثے سے مراد اگر کوئی عشقیہ حادثہ یا اسی قسم کی کوئی چیز ہے تو یہ واقعہ تو ہر ایک کی زندگی میں ہوتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کے ہوتے ہی آدمی شاعری شروع کر دے۔ ایک تجربہ ایک احساس ایک منظر دیکھ رہا ہوں ہو سکتا ہے دس سال کے بعد جب وہ مجبور ہو جائے تب باہر آئے فوری طور پر کچھ کچھ کہنا درست نہیں ہے کبھی کبھار تو ہو سکتا ہے لیکن ہمیشہ نہیں۔ تو ایسا کوئی حادثہ شاعری کا مجھے نہیں ہوا لیکن جمالیات کا احساس، محبت کے جذبے کا احساس، پیدا ہو چکا تھا تو ظاہر ہے کہ ہم کو ان جذبوں کی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی صرف یہ کہ کوئی مضمون اچھا سا آجائے۔ جمالیاتی آجائے، عشقیہ آجائے، اچھا سیاسی بھی پتہ نہیں کیوں اس وقت بھی میرا رجحان تھا کہ اس وقت جو انگریز کی سیاست تھی وہ بھی چھلک پڑتی تھی کبھی کبھار۔ غرضیکہ ایک ماحول تھا، احباب تھے، چھوٹی سی جگہ تھی اور اس چھوٹی سی جگہ میں مجھے بہت اچھا مان لیا گیا۔ شاید بڑی جگہ پر میں ہوتا تو رہ جاتا۔"

مجروح اپنی زندگی کا ایک واقعہ سناتے ہیں کہ ہم گاؤں رہتے تھے۔ ہماری عمر اس وقت تین ساڑھے تین سال تھی اور اس دن میں اور اماں گھر پر اکیلے تھے۔ بہنیں ہماری بیاہی جا چکی تھیں اور والد ہمارے آعظم گڑھ میں۔ تو موری جو ہوتی ہے جس کو نابدان کہتے ہیں، وہ چوک ہوگئی اب پانی پہلے تو آنگن میں بھرا پھر کمروں جانے لگا، اب اماں بہت گھبرائیں، چھوٹا بچہ ساتھ۔ وہ بھی بے دست و پا، میں بھی بے دست و پا۔ ایک صاحب اسی بارش میں گزر رہے تھے انھوں نے جو پریشان دیکھا تو ہماری چوکھٹ کے سامنے ایک گڑھا بنا دیا بیلچے سے اور سارا پانی دھیرے دھیرے چلا گیا۔ اب اس واقعہ نے

---

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۶۳

میرے اوپر ایسا اثر کیا کہ میں اب برسات کے موسم کو انجوائے نہیں کرسکتا۔ اس موسم کی بہت ہیبت سی بیٹھ گئی ہے اور اس نے ہمیں ایک نعمت سے محروم کر دیا برسات کا موسم تو بڑا پرفسوں ہوتا ہے سبھی اس کو انجوائے کرتے ہیں، اس پر گیت لکھے جاتے ہیں، موسیقی بنتی ہے راگ بنتے ہیں مگر میں انجوائے نہیں کرسکتا۔

میں جب پرائمری میں پڑھتا تھا تو وہ نظمیں جو نصابی کتابوں میں ہوتی تھیں، انھیں پڑھاتے وقت اگر ٹیچر کبھی کوئی مصرعہ ناموزوں پڑھتے تو میں ٹوک دیتا کہ ماسٹر صاحب ایسے نہیں ایسے۔ یہ سب چیزیں تو میرے اندر تھیں مگر یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ میں شاعری بھی کروں گا۔ میں اپنے والد کی تنہا نرینہ اولاد ہوں۔ ۱۹۲۱ میں والد نے خلافت تحریک میں شریک ہونے کے بعد کہا کہ میں اپنے بیٹے کو انگریزی نہیں پڑھاؤں گا میں تو اسے مشرقی تعلیم دوں گا۔ اور انھوں نے مجھے عربی فارسی کی تعلیم دلوائی۔ مولانا بن کے پگڑی بندھوانے میں درس نظامیہ کے صرف دو سال رہ گئے تھے ایک واقعہ ہوا اور مجھے مدرسے سے نکال دیا گیا۔ مدرسے کا ماحول عجیب تھا۔ پاجامہ ٹخنے سے نیچا نہ ہو، والی بال ناجائز، ہاکی ناجائز کسی سے مذاق جائز نہیں۔ میں نے کسی لڑکے سے یوں ہی مذاق کیا تو اس نے مولوی صاحب سے شکایت کر دی اور مولوی صاحب نے بیت سنبھالا اور گرجدار آواز میں کہا "کون مذاق کر رہا ہے"۔ میں نے کہا کچھ نہیں مولوی صاحب میں نے یوں ہی ہنسی مذاق کر لیا تو اس میں برائی کیا ہے،۔ اس پر انہوں نے بیت اٹھالیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے جانے دیجیے۔ میرا ایک ہاتھ ان کی بیت پر تھا اور دوسرے میں ان کی گردن تھی۔ وہ نیچے میں اوپر۔ نتیجہ میں مدرسے سے خارج کر دیا گیا"۔ اس کے بعد میں نے طب کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۳۶ میں لکھنؤ کے طبیہ کالج میں (جھوائی ٹولے) میں داخلہ لیا۔ وہاں پہلی بار میں نے ایک صاحب پر کچھ مزاحیہ رنگ میں شعر کہے ۔ جن کا خوب چرچا ہوا۔ اس کے بعد میں طبیب ہو کر فیض آباد کے قصبے ٹانڈہ آیا اور وہیں پریکٹس شروع کر دی۔ اس

زمانے میں مدح صحابہؓ بڑا زور تھا۔ ہمارے مولوی صاحبان نے کہا کہ تم مدح صحابہؓ لکھو۔ میری ابتدائی تحریر کچھ ایسی تھی۔

اٹھ نغمۂ توحید کا سرشار بنادے
طیبہ کے مکیں پھر کوئی آواز سنادے

میں مدح صحابہؓ میں زور وشور سے چل گیا، یہاں تک کہ میری گرفتاری کی نوبت آگئی۔ یہ سب میرے شعری سفر کی ابتدائی شکلیں ہیں۔ یہ چیزیں میں نے کبھی دنجیدگی سے نہیں لکھیں اور نہ ہی نوٹ کیں۔ ٹانڈہ ہی میں عشق ہوا۔۔۔۔۔۔۔رسوائی ہوئی اور میں ٹانڈہ سے سلطانپور منتقل ہونے پر مجبور ہوا۔

سلطانپور میں ہر ہفتے ایک طرحی مشاعرہ ہوتا تھا جہاں میں نے ایک غزل پڑھی۔ نہ جانے میری آواز کا جادو تھا یا غزل کا طلسم۔ اس چھوٹے سے مشاعرے میں خوب داد ملی تو نشہ چڑھا اور شعر و شاعری کے باقاعدہ دور کا آغاز ہوا۔ قصہ مختصر اس طرح ہم شاعر ہو گئے اور ہم نے اپنی پریکٹس کو لات ماری۔ سلطانپور میں ہی ایک مشاعرہ تھا جس میں قرب وجوار کے شہروں سے شعرا بلوائے گئے تھے۔ میں بھی مدعو تھا اور میری غزل حاصل مشاعرہ تھی۔ وہ غزل میری دوسری یا تیسری تھی۔ اس غزل کا مجھے یہ شعر آج تک یاد ہے۔

ہم ہیں کعبہ ہم ہیں بت خانہ ہمیں ہیں کائنات
ہو سکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجئے

اور چوتھی یا پانچوی غزل ہے جس کا شعر بھی انتخاب میں ہے اور میں اسے اپنے بہترین اشعار میں شمار کرتا ہوں ۔

وہ بعد عرض مطلب ہائے رے شوق جواب اپنا
کہ وہ خاموش تھے اور کتنی آوازیں سنیں میں نے

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں ۱۹۴۱ ہردوئی کے ایک مشاعرے میں یہ غزل پڑھ رہا تھا جس کی صدارت حضرت ثاقب لکھنوی فرما رہے تھے۔اس زمانے میں مشاعرے کی ایک تہذیب تھی۔تمام لوگ دوزانوں ہوکر بیٹھتے تھے۔ثاقب صاحب بھی اس طرح بیٹھتے تھے لیکن جب میں نے یہ شعر پڑھا تو وہ یہ کہتے ہوئے اچھل پڑے''واہ! صاحب زادے واہ!''

کچھ دنوں بعد کچھ دوستوں کے ہمراہ علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا جہاں رشید احمد صدیقی صاحب سے ملاقات کے لیے گیا تو جواب ملا مصروف ہیں ملاقات ممکن نہیں۔بہر حال میں نے ایک رقعہ لکھا۔ ملاقات کا اور کوئی مقصد نہ تھا۔آپ لوگوں سے ملنا ایک سعادت ہے اور وہ سعادت حاصل کرنے حاضر ہوا تھا۔بہر حال جا رہا ہوں۔''ابھی میں دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ آدمی بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا آپ کو بلایا جا رہا ہے۔

میں نے رشید احمد صدیقی صاحب سے ملاقات کی اور اپنا کلام سنایا۔انھوں نے مطالعے کے سلسلے میں دریافت کیا۔میں نے جواب میں کہا''مطالعہ تو کچھ بھی نہیں بس درس نظامیہ میں عربی فارسی اور کچھ شعرا کا کلام جو درس کے طور پر پڑھایا گیا ہے۔انھوں نے کہا کہ مطالعہ تو بہت ضروری ہے۔میں نے کہا کہ جناب سلطانپور میں تو مطالعہ کی کوئی شکل نہیں ہے۔وہ تھوڑی دیر چپ رہے اور پھر کہا''آپ

علی گڑھ آجایئے"۔ "میں نے کہا "غریب آدمی ہوں علی گڑھ کس طرح آؤں؟ میں میٹرک پاس بھی نہیں ہوں" انھوں شفقت آمیز لہجہ میں کہا "آپ میرے یہاں آجایئے"۔

اس طرح مجھے رشید صاحب کے یہاں تین سال قیام کا موقعہ ملا۔

رشید صاحب کے گھر آنے والوں میں جذبی، ڈاکٹر ذاکر حسینؔ۔ مولانا حسرت موہانیؔ، شیخ الجامعہ مجیب صاحب، ڈاکٹر عابد تھے جو اکثر میرا کلام سنتے تھے۔ اس وقت تک میں مشاعروں میں چھا چکا تھا۔ میں سوچا یہ مشاعروں وغیرہ کی داد بے معنی ہے، پس میرے ذہن میں خیال آیا کہ جو بھی کہوں دل کی گہرئیوں سے کہوں۔ اس سے قطع نظر کہ وہ اشعار لوگوں پر کیا تاثرات چھوڑتے ہیں اور لوگ اس پو داد دیتے ہیں یا نہیں۔

میری اچھی غزلوں میں ابتدائی غزلیں زیادہ تر علی گڑھ کے زمانے کی ہیں۔ ۱۹۴۵ میں ممبئ کے ایک مشاعرے میں آنے کا اتفاق ہوا۔ کار دار صاحب نے میرا کلام سنا۔ ان دنو ں وہ "شاہجہاں" بنا رہے تھے۔ انھوں نے ملازم رکھ لیا اور اس طرح میں ممبئ کا ہو کر رہ گیا اور اس کے بعد میں ۱۹۴۵ میں ترقی پسند مصنفین میں شامل ہو گیا۔

میں مسلسل چار ماہ جگرؔ صاحب کے ساتھ رہا اور اس زمانے میں کبھی جگرؔ صاحب نے یہ نہیں کہا کہ آپ نظمیں مت کہیئے غزل کہیے۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ میں صبح چھ بجے اٹھا، کوئی غزل کہہ رہا تھا، جگر صاحب میرے کمرے میں آتے اور جھانک کر چلے جاتے۔ یہ عمل کئی بار جاری رہا۔

بالآخر جگرؔ صاحب آئے اور کہنے لگے کہ کیا میاں؟ صبح سے مکھیوں کی طرح بھن بھن لگا رکھی ہے، میں نے کہا کہ جگرؔ صاحب ایک شعرا سے میں اپنی غزل میں کہنا چاہتا ہوں، انھوں نے کہا شعر کیا ہے؟ میں نے شعر سنایا تو بولے اسے کیوں کہنا چاہتے ہو؟ میں نے جواب دیا آپ لوگ بھی تو دوسرے اشعار کو اپناتے ہیں؟ انھوں نے بڑی خوبصورت بات کہی کہ آپ پہلے اپنا کہہ لیجیے اور پھر ایسا بھی کیجئے

اوراس کے علاوہ ایک بات انھوں نے اور کہی جو میرے لئے مثل ہدایت بن گئی وہ یہ کہ دیکھئے میں آپ سے واعدہ کرتا ہوں کہ آپ یہ شعر کہیں گے اور ضرور کہیں گے ہوسکتا ہے قافیے اور ردویف دوسرے ہوں، علامات دوسری ہوں اور وہ شعر آپ کا اپنا ہوگا مگر تب کہیں گے جب آپ ادھر سے گزریں گے۔ ان کی اس بات سے مجھ میں سرقے کا جو رجحان پیدا ہو رہا تھا وہ ختم ہو گیا۔ جگر صاحب نے میری اصلاح کی ہے میرے مصروں کی نہیں۔

جگر صاحب آخری دنوں جب بیمار تھے تو وہ میرے ہی گھر پر تھے۔ ایک دن میں نے ان سے دریافت کیا کہ جگر صاحب آپ کو کبھی یہ خیال آیا کہ میں آپ سے اصلاح نہیں لیتا۔ میں آپ کے چہیتوں میں کسی سے کم آپ کا چاہنے والا نہیں مگر میں نے آپ سے اصلاح کیوں نہیں لی؟

فرمانے لگے کہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اور نہ یہ ضروری ہے، تو میں نے پھر کہا کبھی خیال تو آیا ہوگا؟ تو انھوں نے کہا ہاں کبھی آیا۔ میں نے کہا جگر صاحب میں بتاؤں۔ انھوں نے کہا ''بتایئے۔'' میں نے کہا سارا ملک آپ کے لہجے میں چلا رہا ہے۔ ہر شخص آپ کے لہجے میں بول رہا ہے۔ میں اگر اصلاح لیتا تو آپ کا طرز بیان جو ہے وہ مجھے بھی Influenced کر جاتا۔ نتیجے کے طور پر میرے اپنے خیالات وافکار نہیں رہ جاتے۔ وہ میری اس بات پر بہت خوش ہوئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جگر صاحب نے میرے مصروں کے بجائے میری اصلاح کی ہے۔ جگر صاحب سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور وہ باتیں میرے کام آئی ہیں۔ میں جگر صاحب کو اور رشید صاحب کو اپنا ذہنی استاد مانتا ہوں۔

مجروح کی خوداعتمادی کا ہی یہ اثر ہے کہ انھوں نے پہلے اصلاح کی ہوئی غزل کو تسلیم نہیں کیا اور اپنے مطالعے کو جاری رکھتے ہوئے شاعری کے لئے زمیں ہموار کی اور رشید احمد صدیقی جیسی عظیم ہستی کے سرپرستی حاصل کی۔ انھیں مطالعے کا بے حد شوق تھا وہ نہایت خوددار انسان تھے۔ انھوں نے شاعری میں بھی اپنی انا برقرار رکھی۔

مجروح سلطانپوری کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نے انگریزی میں موصوف کا ایک خاکہ مرتب کیا، جس کے مطابق ان کی پیدائش یکم اپریل ۱۹۱۹ ہوتی ہے خلیق انجم نے اپنی مرتبہ کتاب ''گلکاری وحشت کا شاعر'' میں ایک سوانح خاکہ درج کیا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ مجروح نے خود خلیق انجم کو یہ بتایا تھا کہ ان کی پیدائش کا سال ۱۹۱۵ یا ۱۹۱۶ ہے۔ یہ بیان خلیق انجم صاحب کا ہے جس کی کوئی سند پیش نہیں کی گئی ہے۔ چونکہ مجروح نے ڈاکٹر ضیاالدین شکیب کو جو بیان دیا تھا اس سے اور ان کے صاحبزادے کی تحریر سے بھی ان کی پیدائش کا سال ۱۹۱۹ اور کالی داس گپتا رضا کے مطابق ۱۹۲۰ برامد ہوتا ہے اس لئے ۱۹۱۹ یا ۱۹۲۰ کو ہی ان کی پیدائش کا سال تسلیم کرنا چاہئے۔'' لیکن میرے خیال میں ۱۹۱۹ ہی سن ولادت درست ہے۔

مجروح اتر پردیش کے ضلع سلطانپور میں قصبہ کجہڑی میں میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں معروف نہیں ہے لیکن اب اس کی اہمیت یوں ہو جاتی ہے کہ یہ قصبہ مجروح کی جائے پیدائش ہے۔ مجروح کا پورا نام اسرار حسن خاں ہے۔ ان کے اسلاف راجپوت تھے چوں کہ یہ بیان خود مجروح کا ہے اس لئے یہ مان لینا چاہئے کہ مجروح نسلاً راجپوت تھے۔ مجروح کے والد محمد حسن خاں کے بارے میں خلیق انجم نے یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ وہ پولیس کے محکمے میں ملازم تھے۔ یہ بھی اطلاع ملتی ہے کہ ان کی مالی حالت معتدل سی تھی، نہ اچھی نہ بری۔ مجروح کے بیان کے مطابق تعلیم ان کی سات پشت میں نہ تھی، بہت ہوا تو کسی مڈل پاس کرلیا۔ درس نظامیہ کے طریق کار سے ان کی تعلیم ہو رہی تھی کہ انھوں نے بیچ میں ہی یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ کسی معاملے میں ان کے استاد ان سے خفا ہو گئے اور ان کی پٹائی کر دی۔ نتیجے میں مجروح بلکل دل برداشتہ ہو گئے اور اس حد تک کہ پڑھائی ہی ترک کر دی۔ وہ مزید دو سال رہ جاتے تو نظامیہ کا کورس مکمل کر لیتے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ مجروح مدرسے سے الگ ہو گئے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ موصوف کی آگے کی تعلیم کس حد تک ہوئی لیکن یہ طئے ہے کہ

۱۹۳۳ میں مجروح طبیہ کالج میں طب کی تعلیم کے لئے داخل ہوئے ۔ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مجروح نے طب کی تعلیم مکمل کی تھی اور اپنے وقت کے ایک ذہن طالب علم ثابت ہوئے تھے ۔ خصوصاً طبابت کے معاملے میں ۔ اس سلسلے میں خلیق انجم کا بیان ہے کہ طالب علمی ہی کے زمانے میں انھوں نے طب میں ایسی مہارت حاصل کر لی تھی کہ جھوئی ٹولے کے بڑے طبیب شفاالمسلمین حکیم عبدالمعید جب کسی علاج کے سلسلے میں باہر تشریف لے جاتے تو مجروح کو اپنی کرسی پر بٹھا کر جاتے ۔ خلیق انجم نے یہ بات کہاں سے اخذ کی ہے اس کی کوئی تفصیل نہیں بتاتے لیکن مجروح جس طرح بعد میں اس فن میں اپنی ذہانت کا پتہ دیتے ہے ہیں اس لئے اسے یقین کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا ۔ اب تفصیلات کی بات اور ہے ۔

مرزا سلیم بیگ نے مجروح سلطانپوری سے ایک انٹرویو لیا تھا جو ''مجروح سلطانپوری: مقام اور کلام'' (مرتبہ: ڈاکٹر فیروز) میں شائع ہوا ہے ۔ ایک سوال کے جواب مجروح کہتے ہیں کہ انہیں بچپن میں 'بابو' کہا جاتا تھا اور یہی لفظ بچوں کے لئے آعظم گڑھ میں جاری تھا ۔ ان کے والد پولیس سب انسپکٹر تھے ان کی والدہ گاؤں کی تھیں ۔ اعلیٰ تعلیم کی کوئی روایت خاندان میں نہ تھی ۔ بس مڈل کلاس تک تعلیم کا ریکارڈ تھا ۔ چونکہ عام طور سے لوگ سپہ گری سے تعلق رکھتے تھے اس لئے تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا ۔ ان کی تعلیم کے ابتدا کے وقت خلافت کی تحریک شروع ہو چکی تھی اور انگریزی کپڑے وغیرہ جلائے جا رہے تھے ۔ ویسے میں انہیں انگریزی تعلیم دلوانے کا سوال کہاں تھا ۔ ہاں انہیں مولوی بنانا مقصود تھا لیکن مجروح کا اپنا بیان ہے کہ میں مولوی ہوتے ہوتے بچ گیا شکر ہے خدا کا ۔ انھوں نے ابتدائی کتابیں جو پڑھی تھیں وہ ''اسباق النحو'' ''اسباق الصرف'' تھیں اور استاد مولوی مصطفیٰ تھے میرٹھ میں فارسی شروع کی تھی ۔ ٹانڈہ میں ان کی بہن کی شادی ہوئی تھی چناچہ اس جگہ کے مدرسے سے وابستگی کی وجہ یہی تھی ۔ ابتدا میں عربی کتابیں جو پڑھیں ان میں ''ہدایہ'' اور ''مقامات حریری'' اہم ہیں ۔ (۱)

---

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۶۱

بہر طور! مجروح ۱۹۳۸ میں باضابطہ طبیب ہو گئے اور انہیں یہ سند حاصل ہو گئی۔ پھر انھوں نے ٹانڈہ میں اپنا مطب قائم کیا۔ خلیق انجم کے خاکے میں ان کے ابتدائی عشق کے بارے میں چند جملے ملتے ہیں پہلے ان جملوں کو دیکھئے:

''مجروح نے خود مجھے مسکراتے ہوئے بتایا تھا کہ ٹانڈہ میں ایک بہت خوبصورت لڑکی سے ان کو عشق ہو گیا تھا۔ جس کا بعض لوگوں کو علم ہو گیا اس لئے وہ لڑکی کی رسوائی کے ڈر سے ٹانڈہ چھوڑ کر سلطان پور آ گئے۔''(۱)

یہ پورا بیان ان کی شرافت کی دلیل بھی ہے کہ عشق میں محض لڑکی کی رسوائی کے خوف سے مطب بند کر کے سلطان پور چلے آنا اہم بات ہے۔ یوں بھی عشق اور محبت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ عاشق اپنے اڈے پر جما رہے نہ کہ کسی کی رسوائی کے خوف سے وہ علاقہ ہی چھوڑ دے۔ ہوسکتا ہے کہ عشق کا چرچا ایسا ہوا ہو کہ مجروح کی حیثیت بھی بری طرح زد میں آ رہی ہو، جو اس زمانے کے معیار شرافت کے منافی ہو تو ممکن ہے مجروح نے ایسا کچھ کیا ہو۔ میر تقی میر کے ساتھ کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔

''چراغ'' کے مجروح نمبر میں یہ اطلاع بہم پہنچائی گئی ہے کہ مجروح لکھنؤ کے ایک میوزک کالج سے بھی وابستہ ہوئے تھے جہاں انھوں نے موسیقی کی باضابطہ تعلیم شروع کی تھی لیکن ان کے والدین کی افتادِ طبع سے ناخوش ہوئے نتیجے کے طور پر انہیں یہ سلسلہ بند کرنا پڑا۔

مجروح غالباً ۱۹۳۵ یا ۱۹۳۶ سے شاعری شروع کی تھی۔ میں ''گلکاریٔ وحشت کا شاعر'' ہی سے اس باب میں ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جو اصلاً رسالہ ''چراغ'' سے مستعار ہے

''مجروح کی طبیعت کو شاعری سے لگاؤ اور کافی مناسبت تھی۔ سلطان پر و میں ہی پہلی غزل کہی اور وہیں کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں سنائی۔ اس مشاعرے میں مولانا آسی الدنی شریک تھے۔ انھوں نے اپنی ایک غزل مولانا کی خدمت میں بغرض اصلاح روانہ کی، مولانا نے مجروح کے خیالات

(۱) گلکاریٔ وحشت کا شاعر مجروح سلطانپوری مرتب: خلیق انجم ص ۱۲

کو باقی رکھنے اور کسی صحیح مشورے کے بجائے ان کے اشعار ہی سر سے کاٹ دئے اور اپنے اشعار لکھ دئے۔ مجروح نے مولانا کو لکھا کہ مقصد اصلاح یہ ہے کہ اگر قواعد یا زبان یا بحر کی کوئی لغزش ہو تو آپ مجھے اس طرف متوجہ کریں، یہ نہیں کہ اپنے اشعار کا اضافہ کر دیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ اس قسم کی اصلاح کے لئے میرے پاس وقت نہیں، چنانچہ یہ سلسلہ بند ہو گیا۔''

عین ممکن ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو اس لئے کہ بعض اساتذہ اتنی تیزی سے شعر کہتے تھے کہ اصلاح دینا اور نئے شعر لکھنا دونوں ہی ان کے لئے آسان ہوتا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب کوئی شعر استاد کے مزاج کے مطابق نہ ہو اور وہ اس کی جگہ سرے سے نیا شعر تخلیق کرنے پر قادر ہو۔ مجروح کی طبیعت حساس تھی اور بہت حساس تھی ایسے میں اصلاح کا یہ طریقہ انہیں پسند نہ آیا ہوگا۔ عبدالقوی دسنوی نے مولانا آسی سے مجروح کے استادی اور شاگردی کے رشتے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مضمون ''ایک منفرد غزل گو'' میں لکھا ہے:

''مجروح سلطان پوری نے آسی مرحوم کو پہلا استاد قرار دیا اور یکے بعد دیگرے دو غزلیں ان کی اصلاح کے لئے پیش کیں۔۔۔۔۔ استاد نے استادانہ انداز دکھائے، الفاظ بدل دئے، خیالات تبدیل کر دئے۔ چنانچہ اشعار تو بن سنور گئے لیکن اس نوجوان شاعر کو کچھ جھٹکا لگا۔ اپنا اعتماد بکھرتا ہوا دکھائی دیا، اس لئے وہ استادی اور شاگردی کے اس رشتے سے بدک گئے جس میں اپنی پہچان باقی نہ رہے۔ پھر اپنی خوبیوں، خامیوں کے ساتھ اپنی ڈگر پر تن تنہا چل پڑے۔ اچھا برا جو کہتے اسی کو اپنی شاعری کا سرمایہ تصور کرتے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں حزف و اصلاح بھی کرتے جاتے۔ مجروح کی زندگی کا یہ پہلا لیکن نہایت اہم فیصلہ تھا۔''(۱)

مجروح زبان و بیان پر خاصی قدرت رکھتے تھے جس کا انداز ہر شخص کو ہے۔ شعری سج دھج اور رکھ رکھاؤ نیز زبان پر جیسی قدرت حاصل تھی اس کا اندازہ ان کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا

---

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۱۶۶

ہے کہ فطری طور پر ان کے یہاں شاعری کا ایک ایسا ملکہ تھا جو اشعار کے نوک پلک درست کرنے میں معاون بنتا تھا۔ چودھری محمد نعیم مجروح کی تعلیم طب وغیرہ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''اسرار الحسن خاں، مجروح سلطان پوری کی پیدائش ۱۹۱۹ میں ہوئی۔ عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے بعد انھوں نے طب پڑھی اور انیس برس کی عمر میں طبابت کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد کم از کم ایک سال مطب بھی کیا۔ ۱۹۳۹ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوتی ہے۔ یہی زمانہ ہے جب مجروح کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے اور بہت ہی کم عرصے میں وہ مشاعروں کے بہت ہی مقبول شاعر ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۴۲ میں ہندوستان کی جنگ آزادی ایک نیا رخ لیتی ہے اور تشدد اور دہشت انگیزی کے ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۴۳ میں بنگال میں قحط پڑتا ہے جس کی ذمہ داری فطرت پر نہیں بلکہ انگریزی حکومت اور ہندوستانی منافع خوروں پر عائد ہوتی ہے۔ ۱۹۴۵ میں جنگ عظیم ختم ہوتی ہے، لیکن اٹیمی ہتھیاروں کے استعمال کے بعد دنیا ایک ایسے خطرے سے دوچار ہوتی ہے جس کا سد باب ابھی تک نہیں ہو پایا ہے۔ ۱۹۴۶ سے فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۴۷ میں اور بھی بھیانک خوں ریزی کے ساتھ ملک کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ ۱۹۴۸ میں مزدور اور کسان تحریکوں میں نیا جوش پیدا ہوتا ہے جس کو دونوں نئے ملکوں کی جمہوری حکومتیں خطرناک سمجھتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اس صورت حال کے اثرات اردو کے ادیبوں پر بھی نافذ ہوتے ہیں۔ پاکستان میں راولپنڈی سازش کیس کا نام دے کر اور ہندوستان میں بغیر کوئی خاص نام دئے شاعر اور ادیب جیل میں بند کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۱ میں مجروح بھی ایک سال کے لئے داخل زنداں ہوتے ہیں۔'' (۱)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن شخصیات سے مجروح بہت متاثر تھے ان میں پروفیسر رشید احمد صدیقی خاصے نمایاں ہیں۔ موصوف نے ۱۹۴۳ میں انہیں علی گڑھ بلایا تھا جہاں باضابطہ طور پر مجروح ان کے گھر پر رہے، ان کے ماحول کے اثرات قبول کئے اور ان کے ذاتی کتب خانے سے فیض اٹھایا۔ میرے خیال

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۱۵۰

میں جوشائستگی وآراستگی مجروح کی شخصیت کا حصہ رہی ہے وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ میں نے ذاتی طور پر یہ بھی محسوس کیا ہے کہ مجروح کے اندر حد درجہ شائستگی تھی اور ایک ایسا رکھ رکھاؤ تھا کہ میں جب بھی ان سے ملا ایک خاص کیف کا احساس ہوا۔

اکثر لوگوں کو اس کی خبر ہے کہ مجروح، جگر مرادآبادی سے بھی خاصے قریب اور متاثر رہے تھے۔ مولانا آسی کے بعد ان کی شاعری کے استادوں میں جن کا نام آتا ہے وہ جگر ہی ہیں جنہوں نے ان کے شاعرانہ کیف وکم کو ایک شکل دینے میں خاصہ اہم رول انجام دیا تھا۔ مجروح کی ذہنی وفنی تربیت میں ان کا بھی ہاتھ رہا تھا۔ مجروح خود اس امر پر بار بار اظہار کرتے تھے اور جگر کی شفقتوں اور عنایتوں کے سلسلے میں رطب اللسان رہتے تھے۔ بہرحال! رشید احمد صدیقی سے ملاقات کا واقعہ ندیم صدیقی، رفیع نیازی کے انٹرویو میں ملتا ہے۔ وہیں سے ایک اقتباس دیکھئے:

کچھ دنوں بعد کچھ دوستوں کے ہمراہ علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا جہاں رشید احمد صدیقی صاحب سے ملاقات کے لیے گیا تو جواب ملا مصروف ہیں ملاقات ممکن نہیں۔ بہرحال میں نے ایک رقعہ لکھا۔ ملاقات کا اور کوئی مقصد نہ تھا۔ آپ لوگوں سے ملنا ایک سعادت ہے اور وہ سعادت حاصل کرنے حاضر ہوا تھا۔ بہرحال جارہا ہوں۔'' ابھی میں دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ آدمی بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا آپ کو بلایا جارہا ہے۔

میں نے رشید احمد صدیقی صاحب سے ملاقات کی اور اپنا کلام سنایا۔ انھوں نے مطالعے کے سلسلے میں دریافت کیا۔ میں نے جواب میں کہا ''مطالعہ تو کچھ بھی نہیں بس درس نظامیہ میں عربی فارسی اور کچھ شعرا کا کلام جو درس کے طور پر پڑھایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مطالعہ تو بہت ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ جناب سلطانپور میں تو مطالعہ کی کوئی شکل نہیں ہے۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہے اور پھر کہا ''آپ علی گڑھ آجایئے''۔'' میں نے کہا ''غریب آدمی ہوں علی گڑھ کس طرح آؤں؟ میں میٹرک پاس بھی

نہیں ہوں''انھوں شفقت آمیز لہجہ میں کہا'' آپ میرے یہاں آجائیے''۔(۱)

اس طرح مجھے رشید صاحب کے یہاں تین سال قیام کا موقعہ ملا۔

رشید صاحب کے گھر آنے والوں میں جذبی، ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مولانا حسرت موہانی، شیخ الجامعہ مجیب صاحب، ڈاکٹر عابد تھے جو اکثر میرا کلام سنتے تھے۔ اس وقت تک میں مشاعروں میں چھا چکا تھا۔ میں سوچا یہ مشاعروں وغیرہ کی داد بے معنی ہے، پس میرے ذہن میں خیال آیا کہ جو بھی کہوں دل کی گہرئیوں سے کہوں۔ اس سے قطع نظر کہ وہ اشعار لوگوں پر کیا تاثرات چھوڑتے ہیں اور لوگ اس پو داد دیتے ہیں یا نہیں۔ ''

مجروح نے زندگی ایک بڑا حصہ فلمی دنیا میں بسر کیا۔ ان کا سنجیدہ شعری کلام بہت مختصر ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی بتائی جاتی ہے کہ چونکہ موصوف فلموں سے ہی زیادہ دلچسپی لیتے رہے اس لئے ساری تخلیقی قوت وہیں صرف ہوتی رہی۔ چونکہ موصوف غزل گوئی میں اپنے امتیازات سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے تخلیقی سطح پر خود پر ایک پابندی لگا رکھی تھی۔ لیکن تخلیقی قوت نے ایک دوسرا رخ اختیار کیا اور وہ رخ تھا فلمی گیتوں کو ایک اعتبار دینا۔ اس میں وہ خاصے کامیاب بھی ہوئے۔

ابتدا میں جن شعرا سے وہ متاثر ہوئے وہ ان کے بیان کے مطابق مجاز، جاں نثار اختر، جگر، اصغر گونڈوی اور جوش تھے۔ لیکن مجروح جگر کے بارے میں خصوصیت سے یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے جونپور کے مشاعرے میں مجروح کو سنا تو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ تمہارے یہاں انفردیت ہے اسے گنوانا نہیں چاہئے۔ انہوں نے انہیں اپنے پاس بھی رہنے کی دعوت دی جس پر ان کا اپنا تاثر ان کے الفاظ میں یہ ہے کہ ظاہر ہے اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ لیکن جگر سے کبھی انہوں نے اصلاح نہیں لی۔

کہیں کہیں ان کے بعض جملے سے ان کے مزاج کی کیفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی شاعری خصوصاً غزل کے بارے میں وہ کیسی رائے رکھتے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ فراق کے بعد آپ غزل گو

---

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۸۵

شعرا میں کس کو اہمیت دیتے ہیں تو مجروح کا جواب تھا۔ ''غزل گو شعرا میں مجھے معاف کیجئے، میں اپنے علاوہ کسی کو نہیں سمجھتا (پاکستان کی بات نہیں کر رہا ہوں وہاں فیض بیٹھے ہوئے ہیں)'' پھر ایک سوال کہ جاں نثار اختر کی شاعری آپ کو کیسی لگتی ہے؟ جواب ہے جاں نثار اختر کی غزل کو میں دوسرے درجے کی بہت اچھی غزل کہتا ہوں۔ دوسرا درجہ جب میں کہہ رہا ہوں تو میرے نزدیک انتہائی اونچی سطح مراد ہے۔ میرا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ جو کہنا چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں آپ جو سمجھنا چاہتے ہیں سمجھ جاتے ہیں، کچھ بچتا نہیں۔ بہر طور! ان کے مزاج کے بارے میں بھی ایک سوال کیا گیا۔ وہ یہ تھا کہ آپ کی یہ شہرت کہ آپ سے کوئی ملنا چاہے تو آپ ملتے نہیں، آپ ایک مغرور انسان ہیں، آپ شاعری میں کسی کو اپنا حریف نہیں سمجھتے۔ ایک اور سوال تھا کہ آج کل ایک محدود حلقے میں سہی مگر یہ بات بار بار سننے میں آ رہی ہے کہ آپ فیض کو اپنے سے بڑا شاعر ہیں مانتے۔ ان کا جواب تھا وہی لوگ انہیں مغرور سمجھتے ہیں جنہیں انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ اور فیض کے سلسلے کے جواب میں ان کے اپنے الفاظ ہیں:

''فیض مجھ سے تو کیا بہتوں سے بڑے شاعر ہیں۔ میں نے تو صرف اتنا کہا ہے اور کہوں گا کہ ۱۹۴۵ تک ہندوستان میں فیض سے کوئی ترقی پسند غزل نہیں پہنچی تھی بلکہ شاید انہوں نے کہی بھی نہ ہو۔ اس وقت میں تنہا شخص تھا جس نے یہاں پر غزل دشمنی کے دکھ سہے۔ اس لئے غزل اور صرف غزل کی حد تک میں فیض کو پیش رو اور اپنے بڑا تسلیم نہیں کرتا۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں غزل میں انہیں اپنے سے چھوٹا کہنے کی جرات کر رہا ہوں۔ میں تو فیض، علی سردار جعفری۔ مجاز۔ جذبی، مخدوم ان سب کو اپنا پیش رو مانتا ہوں۔ ان میں سے ایک نہیں ہے جس سے بڑا میں اپنے آپ کو سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ میں تھوڑی سی بھی تہذیب ہے تو میں یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں۔'' (۱)

مجروح اور فیض کی غزل کے مرتبے کے سلسلے میں جہاں شاعری سے بحث کروں گا تفصیلی طور پر

---

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۹۴

اپنا جائزہ پیش کروں گا۔ فی الحال اس مسئلے کو یہیں چھوڑتا ہوں۔

مجروح سلطانپوری نے اپنے خاندان کے افراد کے بارے میں کوئی تفصیل بات کہیں نہیں لکھی اور اپنے اجداد کے نام تک رقم نہیں کیئے۔ اب یہ کام ریسرچ اسکالروں کا ہے کہ اس کی طرف توجہ کریں اور ان کے خاندانی سلسلے اہم لوگوں کی تفصیلات تلاش کریں۔ ان کی اہلیہ کے بارے میں نیز دوسرے ذاتی امور پر محترمہ قراۃ العین حیدر کی ایک تفصیلی رائے درج ملتی ہے، جسے میں یہاں قلمبند کرتا ہوں:

''مجھے مجروح صاحب کا وہ زمانہ دھندلا سا یاد ہے جب وہ میرے چچا سید نثار حیدر زیدی کے یہاں مقیم تھے۔ چچا جان ہونہار شاعروں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور مجروح صاحب بھی اسی نوجوان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ غالباً آزادی سے قبل ہی ممبئی چلے گئے تھے جہاں وہ ترقی پسند شعرا کی صف اول میں شامل ہوئے۔ اسی زمانے سے انہوں نے فلموں کے لئے نغمہ نگاری شروع کی۔ اس وقت سے ساحؔر اور مجروحؔ نے فلمی گانوں کا معیار اتنا بلند کر دیا کہ گیتوں کو ادبی اہمیت حاصل ہوئی۔ ہمارے ہندوستانی سنیما کو ہندی فلم کہا جاتا ہے لیکن ان کی بے پناہ مقبولیت کی ایک وجہ ان کے اردو مکالے اور اردو نغمے ہی ہیں جو شکیلؔ بدایونی، نقشؔ لائل پوری، کیفی آعظمی، علی سردارؔ جعفری، ساحرؔ لدھیانوی، مجروحؔ سلطانپوری نے لکھے۔ آپ دنیا کے کسی گوشے میں چلے جایئے جہاں ہندوستانی آباد ہیں وہاں آپ کو دور دراز کی پہاڑیوں اور گاؤں اور شہروں میں لتا کی آواز میں گائے ہوئے مجروح کے نغمے سنائی دیں گے۔ آج کی سائنس اور ٹکنالوجی کے ترقی یافتہ دور سے قبل کسی شاعر یا نغمہ نگار کو ایسی عالمگیر شہرت حاصل ہونی ممکن نہیں تھی۔ ممبئی میں ایک طویل عرصہ گزانے کے باوجود مجروح صاحب نے اودھ کے کلچر کو اپنے گھر میں زندہ رکھا تھا۔ وہ ایک نہایت مہذب اور وضع دار انسان تھے۔ مجروح صاحب سے ممبئی کی محفلوں میں اکثر ملاقات ہوتی تھی اور وہ بہت ہی شفقت سے ملتے تھے۔ ان کی بیگم فردوسؔ فردوس بھی ایک بڑی خلیق اور ملنسار خاتون ہیں۔ میں

شاعروں اور ادیبوں کی ناونوش کی محفلوں میں جانے سے احتراز کرتی ہوں لیکن مجروح صاحب کے یہاں میں کئی بار گئی کہ ان کے یہاں کا رکھ رکھاؤ قابل تعریف تھا۔ ان سے آخری ملاقات دہلی میں ہوئی جب میں نے انہیں اور چند دوستوں کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ اسی میں اردوداں امریکن خاتون بھی شامل تھیں۔ انہوں حکمت پڑھی تھی اور عربی فارسی تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ لیکن ممبئی میں انہوں نے خود انگریزی پڑھنی شروع کی اور انگریزی بولنے میں بھی مہارت حاصل کرلی۔ ان کی وفات کی خبر سن کر مجھے یہ شعر یاد آرہا ہے ۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی (۱)

مجروں سلطانپوری کو ان کی شعری و ادبی خدمات کے سلسلے میں غالب ایوارڈ، امتیاز میر، یوپی اردو اکادمی کے انعامات کے علاوہ اردو کا اعلیٰ ترین ایوارڈ ''اقبال سمان'' دیا گیا جو ان کی شعری و ادبی خدمات کا کھلا اعتراف ہے۔ انہیں فلم کا بھی سب سے بڑا انعام دادا صاحب پھالکے ایوارڈ ملا۔ یہ ایوارڈ اس بات کا ثبوت ہے کہ مجروح نے فلمی گیتوں اور نغموں کو بھی ایک اعلیٰ معیار عطا کیا ہے۔

مجروح پھیپھڑوں کی تکلیف میں ایک عرصے سے مبتلا تھے جب یہ تکلیف حد سے سوا ہوئی تو انہیں ممبئی کے لیلاوتی اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں ۲۴/۲۵ مئی ۲۰۰۰ کی درمیانی شب میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ۲۵ مئی کو ساڑھے گیارہ بجے سانتا کروز ویسٹ کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

ٹانڈہ کے رنگ ریز محلے سے ان کا تعلق تھا۔ پاکیزہ فلم کا یہ گیت 'ہمری نہ مانو رنگ ریجوا سے پوچھو'، میں اس محلے کی طرف ان کا اشارہ ہے۔ اور آج بھی لوگ خوشی کے واقعہ پر اس گیت کو بڑے فخر

(۱) گلکاری وحشت کا شاعر مجروح سلطانپوری مرتب: خلیق انجم ص ۳۶۸

کے ساتھ گنگناتے ہیں۔

مجروح کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کا سوال اٹھا تو انہوں نے اس ذہن بیداری کے ساتھ اپنے اقتسابات کی چھان بین کی کہ پورا مجموعۂ کلام ایک مختصر انتخاب کے آگے نہ بڑھ سکا۔

پروفیسر علی احمد فاطمی رقمطراز ہیں:

اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر مجروح سلطانپوری کا اصل نام اسرار حسن خان تھا۔ وہ ۱۹۲۱ میں سلطانپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پولس کے شعبہ میں ملازم تھے۔ اچھا خاندان تھا اور اچھی ملازمت چنانچہ مجروح کا بچپن اچھا گزرا۔ والد سرکاری ملازم ضرور تھے لیکن ان کے اندر وطن دوستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ۱۹۲۱ میں رونما ہونے والی خلافت تحریک میں وہ اس قدر ملوث ہوئے کہ انھوں نے فیصلہ لیا کہ وہ اپنے بیٹے کو انگریزی تعلیم نہیں دلوائیں گے چنانچہ مجروح کی ابتدائی تعلیم گھر میں اردو، عربی اور فارسی سے ہوئی۔ ۱۹۲۸ میں والد کا تبادلہ ٹانڈہ (فیض آباد) ہوگیا۔ وہاں مجروح کا داخلہ ایک مدرسے میں کرادیا گیا تاکہ درس نظامیہ کی تعلیم مکمل ہوسکے۔ ابھی اس مدرسے میں تعلیم چل ہی رہی تھی کہ مدرسے کی سختیوں کو لیکر ایک حادثہ ہوگیا جس کی وجہ سے وہ مدرسے سے نکال دئے گئے۔ (۱)

ڈاکٹر شیما رضوی کے مطابق اسرالحسن خان مجروح سلطانپوری پیدائش ۱۸ جون ۱۹۲۰ وفات ۱۹ مئی ۲۰۰۰ ہے۔ (۲)

جہاں تک مجروح کے ادبی سفر کے آغاز کا سوال ہے وہ یہ کہ انسان کی شہرت کے دو طریقے میں پہلا یہ کہ اس میں خود وہ ہنر ہو جس سے وہ مقبول ہو جائے مجروح سلطانپری کے ساتھ دونوں ہنر تھا جس کو دبانا مشکل تھا۔ جہاں تک مخالفت کا تعلق ہے جب تک وہ سلطانپور میں رہے، ان کے مخالفین میں ان کے مدمقابل ایک دوسرے شاعر جن کا تخلص جراح تھا، آگے بڑھانے کی کوشش کیا۔ ان میں یہ خوبی تھی کہ وہ مجروح کے گیتوں، غزلوں کی پیروڈی کیا کرتے تھے چونکہ اصل خیال تو مجروح کا ہوا کرتا تھا۔

---

(۱) تین ترقی پسند شاعر مصنف: پروفیسر علی احمد فاطمی ص ۶۵ (۲) مجروح سلطانپوری "غزل" کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۱۵

اس لئے جراح بہت دنوں تک نہیں چل سکے اور بعد میں جراح صاحب پاکستان چلے گئے۔

پیدائش کے سلسلے میں دانش وروں کے مختلف خیالات میں کوئی انھیں اعظم گڑھ میں پیدا ہونے کی بات کرتا ہے تو کوئی سلطانپور کے موضع گنجہڑی میں پیدا ہونے کی دلیلیں پیش کرتا ہے مگر اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کے والد ضلع سلطانپور کے ریاست کڑوار کے موضع گنجہڑی کے رہنے والے تھے۔اور مجروح نے خود اپنے سلطانپوری ہونے پر فخر کیا ہے۔

ان کے ادبی سفر کے ضمن میں ان کے داستوں کا ذکر لازمی ہے۔ جناب تفضّل حسین ایڈوکیٹ، محبوب حسن ،توکل حسین نیر ،عبدالعزیز (ایڈوکیٹ منے گھائی)،عبدالحیٔ ایڈوکیٹ۔ تاجر مرلی وایثار احمد ایڈوکیٹ مجروح کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ اتفاق سے جناب ایثار احمد ایڈوکیٹ کے علاوہ ان کے سبھی دوست اللہ کے پیارے ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمنان کہتے ہیں کہ انھیں بہت سی جانکاری ایثار احمد ایڈوکیٹ ،محبوب حسین کے صاحبزادے شبیہ الحسن ایڈوکیٹ جناب رفیع اللہ ایڈوکیٹ وڈاکٹر نیر رضا زیدی سے حاصل ہوئی ہے جن کے والدین کا تعلق مجروح سے تھا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی لازمی ہے کہ ان دوستوں کے علاوہ مجروح نے اپنی زندگی کے آخری دس برسوں میں سلطانپور میں کئی لوگوں کے پاس خطوط بھی بھیجے تھے، جن میں جاہل سلطانپوری ڈاکٹر عبدالباری وکنور کرشن بھی شامل ہیں ۔اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں سے بھی مجروح کے تعلقات تھے۔

اابتدائی تعلیم موضع گنجہڑی میں ہی ہوئی ان کے والد جو کہ پولیس محکمہ میں ہیڈ کانسٹیبل تھے،انہیں حکیم ومولوی بنانا چاہتے تھے لیکن ان کا شوق موسیقی اور شاعری کی طرف تھا۔ والد نے انہیں مولوی اور حکمت کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے ٹانڈہ، لکھنؤ وآعظم گڑھ بھی بھیجا حکمت کی ڈگری تو انہوں نے حاصل کر لی لیکن مولوی نہ بن سکے۔لکھنؤ میں کسی بات پر مدرسے سے نکال دئے گئے تھے،تو انہوں نے

لکھنؤ کے بھات کھنڈے سنگیت کالج میں داخلہ لے لیا تھا کچھ دنوں تک انہوں نے ٹانڈہ میں حکمت کی بھی پریکٹس کی تھی۔ مولوی نہ ہونے کے باوجود مذہب سے کافی لگاؤ تھا۔ گنجہڑی کی مسجد میں تراویح بھی پڑھا دیا کرتے تھے۔ گنجہڑی اور سلطانپور سے انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ سلطانپور میں وہ ہمیشہ گنگیو ہاؤس میں ہی رہا کرتے تھے جو آج بھی نارمل چورا ہے پر واقع ہے کنہیں وجوہات کی بنا پر حملے کے خوف سے یہ ایک بار ایک ماہ تک لگاتار سید وجاہت حسین ایڈوکیٹ کے بنگلے میں چھپے رہے۔

سلطانپور کا ادبی ماحول مجروح کے لئے بہت خوشگوار تھا۔ یہ بہت ہی صاف ستھرے اور جاذب نظر شخص تھے۔ ترنم بھی اچھا تھا۔ شاعری ومشاعرں کے اعتبار ۱۹۴۵۔۱۹۶۵ کا دوران کے نام رہا۔ یہ جب ۲۴۔۲۵ سال کے تھے تو ایک مشاعرے میں جگر مرادآبادی کا سلطانپر رآنا ہوا جس میں جگر نے مجرو ح کی صلاحیتوں کو قریب سے دیکھا اور اسے ابھارنے ونکھارنے کوشش کی۔ رشتے اس قسم کے ہوئے کہ وہ اپنے ساتھ مشاعروں میں بھی لے جانے لگے۔ اسی درمیان جگر صاحب کو ممبئی کے ایک مشاعرے کا دعوت نامہ ملا وہ مجروح کو بھی اپنے ساتھ ممبئی لے گئے۔ اس مشاعرے میں فلم ڈائرکٹر عبد الرحمٰن کار دار بھی شریک ہوئے۔ انہوں نے مجروح کی صلاحیتوں کو پرکھ لیا اور اپنی فلم شاہ جہاں میں گیت لکھنے کی پیش کش کی۔ شروع میں تو مجروح نے انکار کیا لیکن جگر صاحب کے حکم کو ٹال نہ سکے۔ یہیں سے ان کی فلمی زندگی کا آغاز ہوا اور وہ ممبئی کے ہی ہو کر رہ گئے۔ ممبئی کے ہونے کے باوجود ان کا سلطانپور سے ہمیشہ رشتہ قائم رہا۔ انہوں نے سلطانپور کے موضع گنجہڑی میں ایک اسکول بھی کھولا تھا، مجلس انتظامیہ سے وہ امید کرتے تھے وہ ان کے مزاج ومعیار پر کھری نہیں اتری۔ مجروح نے وہ اسکول بھی بند کر دیا اور اپنی زمین بھی بیچ دی۔

بنگلے میں رہنے والے وگاڑی میں ممبئی کی سڑکوں پر گھومنے والے مجروح سلطانپوری کو گھمنڈ چھو بھی نہیں گیا تھا اور جب بھی وہ سلطانپور آتے تو اپنے گاؤں گنجہڑی یا تو یکے سے جاتے یا تو کسی کی

سائیکل پر پیچھے بیٹھ جاتے ۔سائیکل پر بیٹھتے وقت شیروانی کو پیچھے سے سمیٹ لیتے تھے۔اور سفر ان کا مجبوری کا نہیں بلکہ فخر کا ہوتا تھا۔آج کے دور کے انسانوں سے ان کا مزاج بالکل الگ تھا آج انسان کو کہیں چھوٹا سا بھی عہدہ مل جاتا ہے تو وہ اپنے کو بھول جاتا ہے اور یہاں تک کہ وہ اپنے ہی شہر میں اپنے گھر میں نہیں بلکہ ڈاک بنگلے میں رہنا پسند کرتا ہے۔

پان کھانے کا شوق بچپن سے حد درجہ تک تھا اس کے ساتھ ہی انہوں نے کبھی اپنے کرتے پر دھبہ لگنے دیا منھ میں تو ان کے پان رہتا تھا لیکن ہاتھ میں دودھ سے ڈوبی ہوئی روئی بھی رہتی تھی اگر کرتے میں گفتگوں کے دوران کہیں سے پان کا چھینٹا پڑ جاتا تو وہ فوراً اس روئی سے اسے صاف کرنے لگتے تھے گفتگوں میں بھی خندہ شرافت ٹپکتی تھی۔سلطانپور کے کھانے کے بڑے شوقین تھے۔

جہاں تک ان کے ہمیشہ صاف ستھرا رہنے کا تعلق ہے ایک مثال اور حاضر خدمت ہے۔ایک بار سلطانپور آئے اور گنگیو ہاؤس میں ہی رکے اس وقت ضلع جج جناب ڈی آر سنگھ صاحب تھے انہیں بھی اردو ادب سے لگاؤ تھا وہ مجروح صاحب کو اپنے بنگلے پر نشست کے لئے مدعو کیا اور یہ دعوت نامہ انہوں نے میزبان شبیہ الحسن کو و ایثار احمد ایڈوکیٹ کو بھی مدعو کیا۔یہ لوگ ایک ساتھ گاڑی میں جج صاحب کے یہاں گئے گاڑی سے اترتے وقت مجروح صاحب کا پیر ذرا سا پانی پر پڑ گیا جس کا چھینٹ ان کے پاجامے پر بھی پڑ گیا۔یہ چھیٹ انھیں برداشت نہیں ہوئی۔انھوں نے فوراً ڈرائیور کو حکم دیا کہ گاڑی کو موڑ کر گھر لے چلو وہاں سے کپڑے بدل کر آتا ہوں اور ویسا ہی کیا۔اسی طرح جب انھوں نے سلطانپور گنجہڑی کی اپنی زمین کو بیچنے کا ارادہ کیا اور جب Sale Deed بعینامہ تیار ہو گئی اور رجسٹرار کے سامنے پیش ہوئی تو رجسٹری قانون کے مطابق اس پر دستخط کے ساتھ ساتھ انگوٹھا نشانی بھی لگایا جاتا ہے۔رجسٹری خادم نے ان کے سامنے انگوٹھے کے لئے پیڈ والا ڈبہ پیش کیا۔اسے دیکھتے ہی مجروح نے کہا کیا اتنا پڑھنے لکھنے کے باوجود مجھے یہ کالکھ پوتنی پڑے گی؟ سب رجسٹرار مختار احسن صاحب

مجروح صاحب کو پہچانتے تھے۔ انھوں نے اپنے خصوصی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے انھیں انگوٹھا لگانے سے منع کر دیا اور ان کے دستخط کی پہچان خود کی۔ شاید یہ رجسٹری کا پہلا عوامی کیس تھا جس میں صرف دستخط سے ہی رجسٹری مکمل کی گئی تھی۔ یوں تو سلطانپور میں مجروح کی کوئی نشانی باقی نہیں رہی لیکن پچھلے برس صحافی و دانشور ہاشم عبداللہ کے ذریعہ سلطانپور کلب کے بغل ایک بڑا سا پارک ہے اس سے ضلع مجسٹریٹ نے مجروح پارک ہونے کا اعلان کیا اور اس کے سلسلے میں مجروح کی یاد میں ایک مشاعرہ بھی ہوا تھا جس کے کنوینر ہاشم عبداللہ ہی تھے۔

ڈاکٹر فہمیدہ خاتون کی تحریر کے مطابق مجروح سلطانپوری ۱۹۳۵ یا ۱۹۳۰ میں شاعری کی مجروح کی شاعری کے آغاز کے بارے میں مجروح کے لڑکپن کے دوست حکیم ابن نے ''چراغ'' مجروح نمبر میں لکھا ہے۔

''مجروح کی طبیعت کو شاعری سے فطری لگاؤ اور کافی مناسبت تھی۔ لہٰذا سلطانپور میں ہی پہلی غزل کہی اور وہیں کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں سنائی۔ اسی مشاعرے میں مولانا آسی الدنی شریک تھے۔ مجروح نے اپنی ایک غزل مولانا کی خدمت میں بہ غرض اصلاح روانہ کی۔ مولانا نے مجروح کے خیالات کو باقی رکھنے اور کوئی صحیح مشورے کے بجائے ان کے اشعار ہی سرے سے کاٹ دئے چنانچہ یہ سلسلہ بند ہو گیا۔''(۱)

ان کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۵ تک ہے۔

ڈاکٹر بشریٰ بانو کے مطابق''

مجروح سلطانپوری کی پیدائش ۱۹۱۹ میں اعظم گڑھ میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم سلطانپور اور ٹانڈہ میں مدرسہ کنزل العلوم میں حاصل کی۔ کنزل العلوم میں مولانا علیم اللہ صاحب ان کے آئیڈیل استاد تھے۔ اس کے بعد الہٰ آباد کے مدرسہ مصباح العوم سے دینی تعلیم لینے کے بعد

(۱) مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۴۰

لکھنؤ سے علم طب حاصل کی۔''(۱)

ہاشم عبداللہ صحافی فرماتے ہیں

''مجروح کی جائے پیدائش سلطانپور ہی ہے۔''(۲)

معشوق علی ایڈوکیٹ کا کہنا ہے کہ اس طالب علم کو پندرہ سال کی عمر میں ہی مجروح صاحب کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ اور مجروح صاحب کے دوستوں وساتھیوں میں خصوصی لوگوں سے ملنے وان سے پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ جس میں خصوصیت سے ماسٹر توکل حسین، نیر ولکھپت رائے محور جو میرے استاد بھی تھے۔ حاجی نظیر عطار صاحب، بشیر احمد عطار۔ عبدالخالق صاحب جیوری ممبر اور سابق نگر پالیکا ممبر سلطانپور تھے واپنے والد صاحب معین الدین صاحب و دادا جان وغیرہ کی صحبت سے حاصل ہوا۔''(۳)

(۳،۲،۱) مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۸۱،۷۹،۴۵

باب دوم

مجروحؔ کے عہد کا ادبی اور تہذیبی پس منظر

پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں "دراصل مجروح کے سامنے ایک نئی للکار تھی۔ جدید غزل جدید دور کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے؟ مخالفین کا اصرار تھا کہ اول تو غزل کی ریزہ خیالی حامل ہوگی۔ دوسرے اس کی مخصوص لفظیات اور علامتوں پر جاگیردارانہ نظام کی چھاپ لگی ہے۔ وہ اسے عصر حاضر کی انقلابی حسیت کو اپنانے میں حارج ہوگی۔ تیسرے قافیے ردیف کی مجبوریاں راہ روکیں گی۔(۱) پروفیسر محمد حسن آگے لکھتے ہیں جذبی غزل میں سیاسی رمزیت کو سموہ ہی رہے تھے، پھر فیض کی غزل آئی۔"(۲)

پروفیسر محمد حسن صاحب مزید رقمطراز ہیں "غزل کو سیاسی رمزیت دینے کا یہ کام یوں تو بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اقبال سہیل اپنی غزلوں میں سیاسی رمزیت کا استعمال برملا کرتے آئے ہیں۔ جگر مرادآبادی نے اپنے آخیر دور کی غزلوں میں سیاسی رمزیت کو واضح طور پر اپنایا۔ خود تر
قی پسند شاعروں کی صف میں جذبی نے سیاسی رمز وایما کو برتا، البتہ مجروح اور فیض کے ہاں یہ رمزیت نئی بلندیوں تک پہنچی۔ دونو ں کے ہاں اس کی نوعیت مختلف ہے، مجروح کے ہاں یہ لے بی۔ٹی رندیوے اور تلنگانہ تحریک کے دوران ابھری اور ۱۹۶۲ کے ہند چین مناقشے تک تقریباً ختم ہوگئی (دو چار شعر اس کے بعد ملیں تو ملیں) اس دوران مجروح کو جیل جانے کا تجربہ بھی ہوا، اور سر پر ہوائے ظلم کے سوجتن کے ساتھ چلنے کا بھی۔ مگر فیض کے ہاں یہ تجربہ (اور لہٰذا یہ لہجہ) پوری زندگی بن گیا۔

جس زمانے میں مجروح نے غزل کو اپنایا اس وقت ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۵ تک یہ تحریک پورے شباب پر پہنچ چکی تھی۔ فیض، ساحر، کیفی، جوش، سردار جعفری، ندیم قاسمی، جاں نثار اختر وغیرہ ترقی پسند شعرا نظموں کے ذریعے عوام میں ترقی پسندی کا صور پھونک کر بیدار کر رہے تھے چونکہ ترقی پسندوں نے ادب کو کمٹ منٹ کی زنجیروں سے جکڑ دیا تھا، غزل کو نیم وحشی

(۱،۲) مجموعہ "غزل" ص ۸،۲

صنف سخن کہ کر رجکٹ کر دیا تھا اور با قاعدہ شاعروں کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ غزل کہنے میں اپنا وقت برباد نہ کریں بلکہ مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں کے مسائل پر نظمیں لکھیں۔

۱۹۳۵ تک ممبئ ترقی پسندوں کی آماجگاہ بن گئی تھی چونکہ ترقی پسند کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے نظریاتی پیروکار تھے۔اس لئے اسی سال مجروح صاحب نے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ پارٹی کی رکنیت بھی اختیار کرلی۔تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد بھی مجروح کے علاوہ نذیر بنارسی، وامق جونپوری وغیرہ بہت سے شعرانے ترقی پسندوں کی ادب میں اس تانا شاہی کو قبول نہیں کیا جس ترقی پسند مصنفین مجروح کو سرخ ادب سے وابستہ ہونے کے لئے دباؤ ڈال رہے تھے۔مگر مجروح نے سیاسی اور سماجی مسائل کو غزل کے ذریعے نظم سے بہتر طریقہ سے پیش کیا اور یہ کہہ کر کہ:

''ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

مجروح نے اپنے عہد کے سماجی حالات میں اپنے ذاتی غم کو شامل کیا علی سردار جعفری فرماتے ہیں''مجروح نے اپنی چھوٹی چھوٹی ذاتی خوشیوں اور ذاتی غموں کو سماجی زندگی کی خوشیوں اور غموں کے سمندر میں ملایا ہے اور پھر اس سمندر سے اپنی شاعری کے جام بھرے ہیں یہی وجہ ہے کہ مجروح ہر شعر بیک وقت ان کے اپنے دل کی آواز بھی ہے اور زمانے کے دل کی دھڑکن بھی۔''(۱)

یہ وہ زمانہ ہے جب حالی اور آزاد کی کوششوں کے بعد نظم کو زیادہ فروغ دیا گیا اور یہ تسلیم کیا گیا

---

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۷

کہ مسائل کا واضح اور مسلسل اظہار نظم میں ہی ممکن ہے۔اس کے سبب غزل کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور شاعری کی سب سے مقبول صنف سخن کو دوسرے درجے کی صنف قرار دیا گیا۔ایسے ماحول میں جو غزل کے لئے سازگار نہیں تھا مجروح نہ صرف غزل کو اپنے شعری تجربے کے اظہار کے لئے منتخب کرتے ہیں بلکہ غزل کی بنیادی شرائط کے ساتھ منفرد انداز میں نمودار ہوتے ہیں۔ان تمام مخالف صورت حال کے باوجود، اور نئی اصناف کے ادب میں شامل ہونے اور مقبول ہونے کے بعد بھی کچھ شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے میدان میں طبع آزمائی کی اور ایسے پس منظر میں جانے سے نہ صرف بچایا بلکہ اسے نئے لب و لہجے اور لفظیات سے روشناس کرایا۔ان شعرا میں فراقؔ، ساحرؔ، مجازؔ، جذبیؔ، فیضؔ، اور مجروحؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

فیضؔ کے بعد مجروح ہی ایسے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے روایتی مزاج کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے لب و لہجے میں نیا پن پیدا کیا اور اسے نئے افق سے روشناس کرایا۔انہوں نے شعری اظہار کے لیے منفرد انداز اختیار کیا جس کا شعری احساس اس شعر میں محسوس کیا جا سکتا ہے:

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں
نہ ہم قفس میں رکے مثل بوئے گل صیاد
نہ ہم مثال صبا حلقہ رسن میں رہے

مجروح کے بچپن کے دینی مدارس کے تعلیمی اور تہذیبی طور کا ایک واقعہ مجروح کی زبانی:

''مدرسے کا ماحول عجیب تھا۔ پاجامہ ٹخنے سے نیچا نہ ہو، والی بال ناجائز، ہا کی ناجائز کسی سے مذاق جائز نہیں۔ میں نے کسی لڑکے سے یوں ہی مذاق کیا تو اس نے مولوی صاحب سے شکایت کردی اور مولوی صاحب نے بیت سنبھالا اور گرجدار آواز میں کہا ''کون مذاق کررہا ہے''۔ میں نے کہا کچھ نہیں مولوی صاحب میں نے یوں ہی ہنسی مذاق کرلیا تو اس میں برائی کیا ہے،۔اس پر انہوں نے بیت اٹھالیا۔اس کے بعد کیا ہوا اسے جانے دیجیے۔میرا ایک ہاتھ ان کی بیت پر تھا اور دوسرے میں ان کی گردن تھی۔وہ نیچے میں اوپر۔نتیجہ میں مدرسے سے خارج کردیا گیا''(۱)

اس کے بعد مجروح لکھنؤ آگئے۔انھوں نے طبیہ کالج میں داخلہ لے لیا اور دو سال میں طب کی تعلیم مکمل کرلی۔یہاں مجروح نے اپنی ذہانت کا ثبوت پیش کیا اور اپنے بزرگوں و استادوں کو متاثر کیا۔

انہیں دنوں مجروح ایک عشق میں گرفتار ہوئے اور بات اتنی بڑھی کہ انھیں ٹانڈہ چھوڑنا پڑا اور وہ سلطانپور واپس آگئے۔سلطانپور میں پریکٹس تو چلی نہیں البتہ شاعری چل پڑی۔ہوا یوں کہ اس شہر میں پابندی سے شعری نشستیں ہوتی تھیں، مجروح اس میں شریک ہوتے۔

ایک مشاعرہ کا ذکر مجروح کی زبانی ہی سنئیے:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے میں ۱۹۴۱ہردوئی کے ایک مشاعرے میں یہ غزل پڑھ رہا تھا جس کی صدارت حضرت ثاقب لکھنوی فرمارہے تھے۔اس زمانے میں مشاعرے کی ایک تہذیب تھی۔تمام لوگ دوزانوں ہوکر بیٹھتے تھے۔ثاقب صاحب بھی اس طرح بیٹھتے تھے لیکن جب میں نے یہ شعر پڑھا:

---

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۸۴

وہ بعد عرض مطلب ہائے رے شوق جواب اپنا

کہ وہ خاموش تھے اور کتنی آوازیں سنیں میں نے

''واہ! صاحب زادے واہ!'' تو وہ یہ کہتے ہوئے اچھل پڑے ۔''(۱)

نوجوان ناقد راشد انور راشد لکھتے ہیں :

''کسی بھی لڑکے کے لئے اپنے والد کی ایسی سند ہزار انعام و اکرام بڑھ کر ہوگی ۔ حد درجہ اطاعت اور فرمابرداری کے بعد بھی ایسی سعادت بہت کم بیٹوں کو نصیب ہوتی ہے اور مجروح نے یہ اعزاز اپنی شاعری کے بل پر حاصل کیا جو اپنے آپ میں ایک خاص اہمیت حامل ہے۔''(۲)

علی گڑھ میں رشید صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے یہ تین سال مجروح کی ذاتی اور تخلیقی دنیا میں بیحد اہمیت رکھتے ہیں۔ مجروح خود کہتے ہیں:

مجھے رشید صاحب کے یہاں تین سال قیام کا موقعہ ملا۔ رشید صاحب کے گھر آنے والوں میں جذبی، ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مولانا حسرت موہانی، شیخ الجامعہ مجیب صاحب، ڈاکٹر عابد تھے جو اکثر میر اکلام سنتے تھے۔ اس وقت تک میں مشاعروں میں چھا چکا تھا۔ میں سوچا یہ مشاعروں وغیرہ کی داد بے معنی ہے، پس میرے ذہن میں خیال آیا کہ جو بھی کہوں دل کی گہرئیوں سے کہوں۔ اس سے قطع نظر کہ وہ اشعار لوگوں پر کیا تاثرات چھوڑتے ہیں اور لوگ اس پو داد دیتے ہیں یا نہیں۔ میری اچھی غزلوں میں آئیڈل غزلیں زیادہ تر علی گڑھ کے زمانے کی ہیں۔''(۳)

رشید صاحب کے توسط سے ہی جگر مرادآبادی سے ربط ضبط بڑھا۔ اس زمانے میں شعر و شاعری کی دنیا میں جگر صاحب چھائے ہوئے تھے، جگر نے مجروح کے یہاں چنگاری دیکھ کر ان کی معاونت و

مقام اور کلام مرتب ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۸۵ (۲) (مجروح سلطانپوری ایک مطالعہ ۲۸ (۳) ندیم صدیقی۔ چراغ کا مجروح سلطانپوری نمبر ص ۲۰۵ (انٹرویو سے)

رہنمائی فرمائی۔ وہ اپنے ساتھ نہ صرف مشاعروں میں لے جاتے بلکہ شاعری کی نوک پلک زبان و بیان پر بھی تبادلہ خیال کرتے۔ ۱۹۴۵ میں جگر کے ساتھ ہی انھیں ممبئی کے ایک مشاعرے میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ بس اس سفر اور اس مشاعرے نے ان کی زندگی ہی بدل کر رکھ دی۔ ممبئی میں اقبال ڈے کے موقع پر پنجاب مسلم ایسوسی ایشن کی جانب سے ہر سال بڑے پیمانے پر ہونے والے مشاعرے میں پہلی بار مجروح جگر کے ساتھ شریک ہوئے اور اپنے عمدہ کلام اور مترنم آواز کی وجہ سے خاصے کامیاب رہے۔

۱۹۴۵ کے آس پاس ممبئی ترقی پسند شاعروں کی آماجگاہ تھا۔ سردار، کیفی، ساحر، منٹو، کرشن، اشک، بیدی سبھی موجود تھے، کمیونسٹ پارٹی کا زور تھا چنانچہ اسی سال وہ ترقی پسند تحریک سے تو وابستہ ہوئے ہی باقاعدہ پارٹی کے ممبر بھی ہو گئے۔ ان دونوں وابستگیوں نے مجروح کی ذہنی اور فکری دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ جگر کے چہیتے ہونے کے باوجود ترقی پسندوں میں شامل ہو گئے۔ دوسرے ترقی پسندوں نے دیکھا کہ یہ تو محض غزل گو ہیں تو انھیں قبول کرنے میں ہچکچائے اس لئے کہ ترقی پسند فکر غزل کو اپنا موافق نہیں سمجھتی تھی۔

کچھ اس عہد کے اساتذہ مثلاً حسرت، اصغر، فراق نے تہذیب عاشقی کے آداب مرتب کر رکھے تھے۔ کچھ پریم چند نے بھی حسن کے معیار کی بات اٹھا رکھی تھی۔ جگر کا یہ شعر بھی مشہور ہو چکا تھا۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

مجروح غالباً ۱۹۳۵یا۱۹۳٦ سے شاعری شروع کی تھی۔ میں ''گلکاریٔ وحشت کا شاعر'' ہی سے اس باب میں ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جو اصلاً رسالہ ''چراغ'' سے مستعار ہے۔

''مجروح کی طبیعت کو شاعری سے لگاؤ اور کافی مناسبت تھی۔ سلطان پور میں ہی پہلی غزل کہی اور وہیں کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں سنائی۔ اس مشاعرے میں مولانا آسی الدنی شریک تھے۔ انھوں نے اپنی ایک غزل مولانا کی خدمت میں بغرض اصلاح روانہ کی، مولانے مجروح کے خیالات کو باقی رکھنے اور کسی صحیح مشورے کے بجائے ان کے اشعار ہی سر سے کاٹ دئے اور اپنے اشعار لکھ دئے۔ مجروح نے مولانا کو لکھا کہ مقصد اصلاح یہ ہے کہ اگر قواعد یا زبان یا بحر کی کوئی لغزش ہو تو آپ مجھے اس طرف متوجہ کریں، یہ نہیں کہ اپنے اشعار کا اضافہ کردیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ اس قسم کی اصلاح کے لئے میرے پاس وقت نہیں، چنانچہ یہ سلسلہ بند ہوگیا۔''(۱)

عبدالقوی دسنوی نے مولانا آسی سے مجروح کے استادی اور شاگردی کے رشتے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مضمون ''ایک منفرد غزل گو'' میں لکھا ہے:

''مجروح سلطان پوری نے آسی مرحوم کو پہلا استاد قرار دیا اور یکے بعد دیگرے دو غزلیں ان کی اصلاح کے لئے پیش کیں۔۔۔۔۔ استاد نے استادانہ انداز دکھائے، الفاظ بدل دئے، خیالات تبدیل کردئے۔ چنانچہ اشعار تو بن سنور گئے لیکن اس نوجوان شاعر کو کچھ جھٹکا لگا۔ اپنا اعتماد بکھرتا ہوا دکھائی دیا، اس لئے وہ استادی اور شاگردی کے اس رشتے سے بدک گئے جس میں اپنی پہچان باقی نہ رہے۔ پھر اپنی خوبیوں، خامیوں کے ساتھ اپنی ڈگر پر تن تنہا چل پڑے۔ اچھا برا جو کہتے اسی کو اپنی شاعری کا سرمایہ تصور کرتے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں حزف و اصلاح بھی کرتے جاتے۔ مجروح کی

(۱) مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۴۰

زندگی کا یہ پہلا لیکن نہایت اہم فیصلہ تھا۔''(۱)

اسرار الحسن خاں، مجروح سلطان پوری کی پیدائش ۱۹۱۹ میں ہوئی۔عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے بعد انھوں نے طب پڑھی اور انیس برس کی عمر میں طبابت کی سند حاصل کی۔اس کے بعد کم از کم ایک سال مطب بھی کیا۔۱۹۳۹ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوتی ہے۔یہی زمانہ ہے جب مجروح کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے اور بہت ہی کم عرصے میں وہ مشاعروں کے بہت ہی مقبول شاعر ہو جاتے ہیں۔۱۹۴۲ میں ہندوستان کی جنگ آزادی ایک نیا رخ لیتی ہے اور تشدد اور دہشت انگیزی کے ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں۔۱۹۴۳ میں بنگال میں قحط پڑتا ہے جس کی ذمہ داری فطرت پر نہیں بلکہ انگریزی حکومت اور ہندوستانی منافع خوروں پر عائد ہوتی ہے۔۱۹۴۵ میں جنگ عظیم ختم ہوتی ہے، لیکن ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کے بعد دنیا ایک ایسے خطرے سے دوچار ہوتی ہے جس کا سد باب ابھی تک نہیں ہو پایا ہے۔۱۹۴۶ سے فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔۱۹۴۷ میں اور بھی بھیانک خوں ریزی کے ساتھ ملک کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔۱۹۴۸ میں مزدور اور کسان تحریکوں میں نیا جوش پیدا ہوتا ہے جس کو دونوں نئے ملکوں کی جمہوری حکومتیں خطرناک سمجھتی ہیں۔رفتہ رفتہ اس صورت حال کے اثرات اردو کے ادیبوں پر بھی نافذ ہوتے ہیں۔پاکستان میں راولپنڈی سازش کیس کا نام دے کر اور ہندوستان میں بغیر کوئی خاص نام دئے شاعر اور ادیب جیل میں بند کئے جاتے ہیں۔چنانچہ ۱۹۵۱ میں مجروح بھی ایک سال کے لئے داخل زنداں ہوتے ہیں۔

فیسر رشید احمد صدیقی خاصے نمایاں ہیں۔موصوف نے ۱۹۴۳ میں انہیں علی گڑھ بلایا تھا جہاں باضابطہ طور پر مجروح ان کے گھر پر رہے، ان کے ماحول کے اثرات قبول کئے اور ان کے ذاتی کتب

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۱۲۶

خانے سے فیض اٹھایا۔ میرے خیال میں جو شائستگی وآراستگی مجروح کی شخصیت کا حصہ رہی ہے وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ میں نے ذاتی طور پر یہ بھی محسوس کیا ہے کہ مجروح کے اندر حد درجہ شائستگی تھی اور ایک ایسا رکھ رکھاؤ تھا کہ میں جب بھی ان سے ملا ایک خاص کیف کا احساس ہوا۔ اکثر لوگوں کو اس کی خبر ہے کہ مجروح، جگر مرادآبادی سے بھی خاصے قریب اور متاثر رہے تھے۔ مولانا آسی کے بعد ان کی شاعری کے استادوں میں جن کا نام آتا ہے وہ جگر ہی ہیں جنہوں نے ان کے شاعرانہ کیف وکم کو ایک شکل دینے میں خاصہ اہم رول انجام دیا تھا۔ مجروح کی ذہنی وفنی تربیت میں ان کا بھی ہاتھ رہا تھا۔

رفیع نیازی کے انٹرویو میں ملتا ہے۔ وہیں سے ایک اقتباس دیکھیئے:

کچھ دنوں بعد کچھ دوستوں کے ہمراہ علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا جہاں رشید احمد صدیقی صاحب سے ملاقات کے لیے گیا تو جواب ملا مصروف ہیں ملاقات ممکن نہیں۔ بہرحال میں نے ایک رقعہ لکھا۔ ملاقات کا اور کوئی مقصد نہ تھا۔ آپ لوگوں سے ملنا ایک سعادت ہے اور وہ سعادت حاصل کرنے حاضر ہوا تھا۔ بہرحال جارہا ہوں۔" ابھی میں دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ آدمی بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا آپ کو بلایا جارہا ہے۔

میں نے رشید احمد صدیقی صاحب سے ملاقات کی اور اپنا کلام سنایا۔ انھوں نے مطالعے کے سلسلے میں دریافت کیا۔ میں نے جواب میں کہا "مطالعہ تو کچھ بھی نہیں بس درس نظامیہ میں عربی فارسی اور کچھ شعرا کا کلام جو درس کے طور پر پڑھایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مطالعہ تو بہت ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ جناب سلطانپور میں تو مطالعہ کی کوئی شکل نہیں ہے۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہے اور پھر کہا "آپ

علی گڑھ آجایئے۔''میں نے کہا''غریب آدمی ہوں علی گڑھ کس طرح آؤں؟ میں میٹرک پاس بھی نہیں ہوں''انھوں شفقتاً آمیز لہجہ میں کہا''آپ میرے یہاں آجایئے''۔ اس طرح مجھے رشید صاحب کے یہاں تین سال قیام کا موقعہ ملا۔

رشید صاحب کے گھر آنے والوں میں جذبی، ڈاکٹر ذاکر حسینؔ۔ مولانا حسرت موہانیؔ، شیخ الجامعہ مجیب صاحب، ڈاکٹر عابد تھے جو اکثر میرا کلام سنتے تھے۔ اس وقت تک میں مشاعروں میں چھا چکا تھا۔ میں سوچا یہ مشاعروں وغیرہ کی داد بے معنی ہے، پس میرے ذہن میں خیال آیا کہ جو بھی کہوں دل کی گہرئیوں سے کہوں۔ اس سے قطع نظر کہ وہ اشعار لوگوں پر کیا تاثرات چھوڑتے ہیں اور لوگ اس پو داد دیتے ہیں یا نہیں۔ ''(۱)

ابتدا میں جن شعرا سے وہ متاثر ہوئے وہ ان کے بیان کے مطابق مجازؔ، جانثار اخترؔ، جگرؔ، اصغرؔ گونڈوی اور جوشؔ تھے۔ لیکن مجروح جگر کے بارے میں خصوصیت سے یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے جونپور کے مشاعرے میں مجروح کو سنا تو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ تمہارے یہاں انفردیت ہے اسے گنوانا نہیں چاہئے۔ انہوں نے انہیں اپنے پاس بھی رہنے کی دعوت دی جس پر ان کا اپنا تاثر ان کے الفاظ میں یہ ہے کہ ظاہر ہے اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ لیکن جگر سے کبھی انھوں نے اصلاح نہیں لی۔

کہیں کہیں ان کے بعض جملے سے ان کے مزاج کی کیفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی شاعری خصوصاً غزل کے بارے میں وہ کیسی رائے رکھتے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ فراقؔ کے بعد آپ غزل گو شعرا میں کس کو اہمیت دیتے ہیں تو مجروح کا جواب تھا۔''غزل گو شعرا میں مجھے معاف کیجئے، میں اپنے علاوہ کسی کو نہیں سمجھتا (پاکستان کی بات نہیں کر رہا ہوں وہاں فیض بیٹھے ہوئے ہیں)''پھر ایک سوال کہ

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۸۵

جاںنثار اختر کی شاعری آپ کو کیسی لگتی ہے؟ جواب ہے جاںنثار اختر کی غزل کو میں دوسرے درجے کی بہت اچھی غزل کہتا ہوں۔ دوسرا درجہ جب میں کہہ رہا ہوں تو میرے نزدیک انتہائی اونچی سطح مراد ہے۔ میرا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ جو کہنا چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں آپ جو سمجھنا چاہتے ہیں سمجھ جاتے ہیں، کچھ بچتا نہیں۔ بہر طور! ان کے مزاج کے بارے میں بھی ایک سوال کیا گیا۔ وہ یہ تھا کہ آپ کی یہ شہرت کہ آپ سے کوئی ملنا چاہے تو آپ ملتے نہیں، آپ ایک مغرور انسان ہیں، آپ شاعری میں کسی کو اپنا حریف نہیں سمجھتے۔ ایک اور سوال تھا کہ آج کل ایک محدود حلقے میں سہی مگر یہ بات بار بار سننے میں آ رہی ہے کہ آپ فیض کو اپنے سے بڑا شاعر ہیں مانتے۔ ان کا جواب تھا وہی لوگ انہیں مغرور سمجھتے ہیں جنہیں انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ اور فیض کے سلسلے کے جواب میں ان کے اپنے الفاظ ہیں:

''فیض مجھ سے تو کیا بہتوں سے بڑے شاعر ہیں۔ میں نے تو صرف اتنا کہا ہے اور کہوں گا کہ ۱۹۴۵ تک ہندوستان میں فیض سے کوئی ترقی پسند غزل نہیں پہنچی تھی بلکہ شاید انہوں نے کہی بھی نہ ہو۔ اس وقت میں تنہا شخص تھا جس نے یہاں پر غزل دشمنی کے دکھ سہے۔ اس لئے غزل اور صرف غزل کی حد تک میں فیض کو پیش رو اور اپنے بڑا تسلیم نہیں کرتا۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں غزل میں انہیں اپنے سے چھوٹا کہنے کی جرات کر رہا ہوں۔ میں تو فیض، علی سردار جعفری۔ مجاز۔ جذبی، مخدوم ان سب کو اپنا پیش رو مانتا ہوں۔ ان میں سے ایک نہیں ہے جس سے بڑا میں اپنے آپ کو سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ میں تھوڑی سی بھی تہذیب ہے تو میں یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں۔''(۱)

ن کی اہلیہ کے بارے میں نیز دوسرے ذاتی امور پر محترمہ قراۃ العین حیدر کی ایک تفصیلی رائے

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۹۴

درج ملتی ہے، جسے میں یہاں قلمبند کرتا ہوں:

''مجھے مجروح صاحب کا وہ زمانہ دھندلا سا یاد ہے جب وہ میرے چچا سید نثار حیدر زیدی کے یہاں مقیم تھے۔ چچا جان ہونہار شاعروں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور مجروح صاحب بھی اسی نوجوان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ غالباً آزادی سے قبل ہی ممبئی چلے گئے تھے جہاں وہ ترقی پسند شعرا کی صف اول میں شامل ہوئے۔ اسی زمانے سے انہوں نے فلموں کے لئے نغمہ نگاری شروع کی۔ اس وقت سے ساحرؔ اور مجروحؔ نے فلمی گانوں کا معیار اتنا بلند کر دیا کہ گیتوں کو ادبیاہمیت حاصل ہوئی۔ ہمارے ہندوستانی سینما کو ہندی فلم کہا جاتا ہے لیکن ان کی بے پناہ مقبولیت کی ایک وجہ ان کے اردو مکالے اور اردو نغمے ہی ہیں جو شکیلؔ بدایونی، نقشؔ لائل پوری، کیفیؔ آعظمی، علی سردار جعفری، ساحرؔ لدھیانوی، مجروحؔ سلطانپوری نے لکھے۔ آپ دنیا کے کسی گوشے میں چلے جایئے جہاں ہندوستانی آباد ہیں وہاں آپ کو دور دراز کی پہاڑیوں اور گاؤں اور شہروں میں لتا کی آواز میں گائے ہوئے مجروح کے نغمے سنائی دیں گے۔ آج کی سائنس اور ٹکنالوجی کے ترقی یافتہ دور سے قبل کسی شاعر یا نغمہ نگار کو ایسی عالمگیر شہرت حاصل ہونی ممکن نہیں تھی۔ ممبئی میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے باوجود مجروح صاحب نے اودھ کے کلچر کو اپنے گھر میں زندہ رکھا تھا۔ وہ ایک نہایت مہذب اور وضع دار انسان تھے۔ مجروح صاحب سے ممبئی کی محفلوں میں اکثر ملاقات ہوتی تھی اور وہ بہت ہی شفقت سے ملتے تھے۔ ان کی بیگم فردوسؔ فردوس بھی ایک بڑی خلیق اور ملنسار خاتون ہیں۔ میں شاعروں اور ادیبوں کی ناونوش کی محفلوں میں جانے سے احتراز کرتی ہوں لیکن مجروح صاحب کے یہاں میں کئی بار گئی کہ ان کے یہاں کا رکھ رکھاؤ قابل تعریف تھا۔ ان سے آخری ملاقات دہلی میں

ہوئی جب میں نے انہیں اور چند دوستوں کو اپنے یہاں مدعو کیا۔اسی میں اردو داں امریکن خاتون بھی شامل تھیں ۔انہوں حکمت پڑھی تھی اور عربی فارسی تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی ۔لیکن ممبئی میں انہوں نے خود انگریزی پڑھنی شروع کی اور انگریزی بولنے میں بھی مہارت حاصل کرلی ۔ان کی وفات کی خبر سن کر مجھے یہ شعر یاد آرہا ہے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی''(۱)

سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے۔ان کا خیال تھا کہ ادیبوں کو وطن کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینا چاہئے اور عوام کی حالت کو سدھارنے کی تحریکوں سے وابستہ ہونا چاہئے۔ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ادیبوں کو بھی کوشش کرنی چاہے کہ وہ حتی المقدور اپنی صلاحیتوں کے مطابق آزادی کے حصول میں معاون ثابت ہوتے رہیں۔

ہماری تنظیم کوئی سیاسی تنظیم نہیں ہوگی۔ہمارا مقصد ادب کے ذریعہ اپنے خیالات کی ترویج ہے ۔ادیبوں میں خیالات کے اعتبار سے اختلاف ہوسکتا ہے اور ضروری ہے اور یہ ختلاف ایک تنظیم کے اند رره کر بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور ان میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ ان ک اظہار جمہوری طریقے سے ہو۔ہم کو اپنے اختلافات کم کرنے ہیں اور مشترکہ باتوں کو لے کر آگے بڑھنا ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں مجروح سلطانپوری کا ذہن مرتب ہوا ہے۔

گلکاری وحشت کا شاعر: مجروح سلطانپوری مرتب خلیق انجم ص ۳۶۷

مجروح سلطانپوری چونکہ غزل کے شاعر تھے اس لئے عمومی طریقے پر اس اسکول کے بنیاد گزاروں کی نظر میں اتنے احترام کے قابل نہیں تھے۔ان کے خیال میں غزل کی تنگ دامانی تحریک کی بہت سی باتوں کو اپنے دامن میں نہیں سمیٹ سکتی تھی۔ پھر غزل لکھنا اس دور میں گھاٹے کا سودا تھا یہ اور بات ہے کہ فیض ہوں کہ سردار جعفری دونوں ہی غزل کہتے رہے تھے۔ کچھ دوسرے شاعر مجاز، جاں نثار اختر وغیرہ بھی غزلیں کہ رہے تھے لیکن فضا ایسی تھی کہ جہاں نظم پر بہت زیادہ زور تھا اور عم خیال یہ تھا کہ نظم نگاری کے بغیر کوئی شاعر پنپ نہیں سکتا۔ ایسے میں غزل سے وابستہ رہنا بڑے حوصلے کا کام تھا۔

ادائے طول سخن کیا وہ اختیار کرے
جو عرض حال بطرز نگاہ یار کرے

مجروح کے سامنے حسرؔت کی یہ غزل ضرور رہی ہوگی:

وہ عرض حال بطرز نگاہ ناز کرے
تری نگاہ جسے آشنائے راز کرے

واضح رہے کہ مجروؔح کی یہ غزل اس وقت چھپی تھی جب ظ انصاری ''شاہراہ'' میں غزل کے خلاف باضابطہ مہم ''انسداد غزل'' چلائے ہوئے تھے اور نظم کا جھنڈا بلند کئے ہوئے تھے۔ حسرؔت ہی کے

زبان میں کہنا چاہیئے کہ ''اک طرف تماشا ہے ظ انصاری کی طبیعت بھی'' ایک طرف وہ کلاسیکی شاعر کے مزاج داں، لفظوں کے پارکھ ہیں، دروبست معانی کے رمزشناس ہیں اور دوسری طرف در تقلید جوشؔ غزل کے مخالف بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی غزل شکنی یگانہ کی غالبؔ شکنی کی طرح غالبؔ شناسی (یا غزل شناسی) کا نتیجہ ہے، لیکن اس رویے نے مجروح سے ایسی غزل کہلوائی جو بعد کے برسوں میں غزل کے احیاء کی تمہید بنی۔

فیضؔ، جنھوں نے مجروحؔ سے زیادہ لکھا ہے، ان کی لفظیات بھی محدود ہیں۔ چند نظموں کا ڈکشن، غزلوں کی لفظیات پر ہی مشتمل ہے لیکن فیضؔ کے یہاں نظم اور غزل دونوں میں یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر بہت ہی پرتکلف ماحول میں بڑی آہستگی نرم وشیریں، حسین ولطیف، تراشیدہ اور مرصع لفظوں اور ترکیبوں کی زبان میں بات کررہا ہے۔ صرف کہیں کہیں فیضؔ کے یہاں بلند آہنگ، رجزیہ لہجہ ملتا ہے، ورنہ وہ قاتل، جابر، اور صیاد وگلچیں سے بھی غزل کی عاشقانہ زبان میں ہی مخاطب ہوتے ہیں۔

۱۹۴۰ کے آس پاس جو غزل کے مستند اور مشہور شعرا تھے، انھوں نے غزل کی دنیا کو بے حد محدود کررکھا تھا۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ بس ذاتی مسائل کی حد تک خارجی دنیا اور اس کے ہنگاموں سے تعلق رکھنا چاہتے ہیں، ویسے حسرتؔ، جگرؔ، آثرؔ لکھنوی، فراقؔ، روشؔ صدیقی اور اخترؔ انصاری وغیرہ بیدار مغز لوگ تھے اور ترقی پسندوں کے جلوس میں شریک بھی ہوتے تھے، ان میں سے فراقؔ اور اخترؔ انصاری نے تو تحریری طور سے بھی ادب اور سیاست کے پر روشنی ڈالی ہے۔ خاص کر فراقؔ نے تو بعد میں ایک ناقابل فراموش رول غزل کی اہمیت اور بازیافت کے سلسلے میں ادا کیا، پھر

بھی مجموعی حیثیت سے اس وقت ان تمام شعرا کی غزلوں کا مواد بھی یا شعری مزاج ایسا نہ تھا کہ قومی بیداری کے موڈ سے ہم آہنگ کہا جا سکے۔ اس موڈ سے کچھ ہم آہنگ یگانہؔ کا انداز سخن تھا لیکن وہ الگ تھلگ ہی رہے۔ اس وقت کے تازہ فکر شعرا میں مجازؔ اور جذبیؔ نظم و غزل دونوں میں اپنی انفرادیت اور خوش نوائی کے باعث تیزی سے اپنا مقام بنانے لگے تھے۔ اور جس رنگ تغزل کو بعد میں عروج حاصل ہوا، اس کے اولین نقوش ان ہی کے یہاں ملتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں بھی یہ رویہ رہا کہ غزلوں میں ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا جائے جس سے تغزل کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہو، مثلاً:

بہت مشکل ہے دنیا کا سنور نا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
(مجازؔ)

یا

کیا تجھ کو خبر، کیا تجھ کو پتہ دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکل گیتی ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں
(جذبیؔ)

ان اشعار میں دردمندی، خلوص کی آنچ، فنی حسن اور تھوڑی بہت تہداری بھی ہے لیکن گرمی سخن یہاں بھی نہیں ہے۔ مختصراً یہی غزل کا منظر نامہ تھا جب مجروحؔ کو سلطانپوری بساط غزل پر وارد ہوئے اور

چند ہی برسوں میں اپنے منفرد تیور اور انداز تغزل کے باعث ایک نئے انقلابی آہنگ کی علامت بن کر ہندوستان گیر شہرت حاصل کر لی۔

فضیل جعفری لکھتے ہیں:

''کم لکھنے اور اچھا لکھنے کے مقابلے میں زیادہ لکھنا اور اچھا لکھنا یقیناً کسی شاعر اور اس کی شاعری کے عمومی مرتبے کے لیے دور رس نتائج اور اثرات کا حامل ہوتا ہے لیکن چونکہ اردو میں شروع سے ہی زیادہ لکھنے اور برا لکھنے والوں کا پلہ بھاری رہا ہے اس لیے قارئین کے نزدیک مجروحؔ جیسے کم گو مگر اچھے غزل گو کی اہمیت اور وقعت بیک نظر بڑھ جاتی ہے۔ غزل گو کی حیثیت سے ان کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے یعنی یہ کہ اب سے کوئی چالیس برس پہلے جس زمانے میں جوشؔ ملیح آبادی جیسے بزرگوں سے قطع نظر خود مجروحؔ کے کئی ہم عصر اور کئی ہم عمر، غزل کو ماضی کی بے مصرف اور بے مایہ صنف سخن سمجھ کو اسے نظر انداز کرنے اور طرح طرح سے اس کی مذمت کرنے میں مصروف تھے، مجروحؔ نے اپنی شخصیت کے شعری اظہار کے لیے بنیادی طور پر اسی صنف کا انتخاب کیا اور کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کر دکھایا کہ غزل اپنی مخصوص ہیئت کی تمام تر پابندیوں اور قیود و حدود کے باوجود نہ صرف ہر قسم کے خیالات و جذبات کے اظہار پر قادر ہے بلکہ ہر دور کے بدلتے ہوئے رجحانات و معیارات کا بھی ساتھ دے سکتی ہے۔

ستم! کہ تیغ قلم دیں اسے جوائے مجروحؔ
غزل کو قتل کرے نغمے کو شکار کرے

جیسے اشعار صنف غزل سے مجروحؔ کے تعلق خاطر اور غزل دشمنوں پر ان کی سخت تنقید کی مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔"(۱)

دراصل وہ زمانہ یعنی دوسری جنگ عظیم سے فوراً پہلے اور فوراً بعد کا زمانہ ہی ایسا تھا جب نہ صرف اردو یا ہندوستان سے تعلق رکھنے والے بلکہ ساری دنیا کے نوجوان ادیب، شاعر اسی نہج پر سوچ اور لکھ رہے تھے۔ عالمی سطح پر خطرناک معاشی بحران، کولونیل راج کے مظالم، فاشزم کا عروج اور اس کے مضر اثرات وغیرہ ایسے سیاسی وسماجی عوامل تھے جنھوں نے ساری دنیا کے بیشتر نوجوان ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور دانشوروں کو مارکسزم اور نظریۂ اشتراکیت کی شکل میں ایک موثر اور پرکشش انقلابی ہتھیار عطا کر دیا تھا اور تقریباً سبھی لوگوں کو جلد ہی ساری دنیا میں معاشی انقلاب آنے اور تقریباً سبھی حقیقی معنی میں عوامی اور جمہوری حکومتوں کے قیام کی مارکسی پیشین گوئی کے سچ ہونے کا یقین سا تھا۔ مجروحؔ کی شاعری میں بھی جابجا وہ تمام ذہنی اور جذباتی انسلاکات موجود ہیں جو ان کے اور ان کے ہم عصر فنکاروں کے درمیان نقطہ ہائے اشتراک کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن مجروحؔ کا شعری اسلوب نہ صرف منفرد بلکہ ان کے ممتاز ہم عصروں کے اسالیب سے اتنا مختلف ہے کہ بیشتر موقعوں پر یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ مجروحؔ اور فیضؔ، یا مجروحؔ اور جذبیؔ شعر میں دراصل ایک ہی قسم کے سماجی یا سیاسی ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔

فیضؔ، مجازؔ، جذبیؔ، جمیلؔ، روشؔ، مجروحؔ، پرویزؔ، ملاؔ سبھی کا فنی رویہ غزل گوئی میں وہی نظر آیا جو اقبالؔ نے اختیار کیا تھا۔ فراقؔ جیسے رومانی غزل گو نے میر کی روایت کے احیا کا جو دعویٰ کیا تھا۔ وہ غلط ثابت ہوا اور جو کچھ فی الواقع ظاہر ہوا وہ صرف خام ذاتیات و جنسیات کا معجون مرکب تھا۔

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۱۰۳

اقبالؔ کے بعد اور انھیں کی لیکر پر ابھرنے والی اردو تغزل کی جن نئی صلاحیتوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان میں مجروحؔ سلطانپوری اپنا ایک خاص مقام اور انداز رکھتے ہیں۔

تغزل کی خصوصیات مجروحؔ کو ان کے ہم مشرب معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ مجازؔ کی ترقی پسندی ان کی نظموں تک محدود ہے، جب کہ ان کی غزل گوئی نئی حسیت کے باوجود کلاسیکی ہے۔ تقریباً یہی حال جذبیؔ کا ہے۔ فیضؔ کی رومانیت ان کی انقلابیت پر اتنی حاوی ہے کہ نظموں کی ترقی پسندی بھی موضوعات کے باعث ہے، جب کہ وہاں بھی اندازِ نظر اور طرزِ بیان میں رومانی ابہام کافی نمایاں ہے ۔ پرویزؔ شاہدی، مخدومؔ محی الدین اور سردار جعفری ضرور ایسے شعرا ہیں جن کی اشتراکیت ان کے کلام کا نمایاں عنصر ہے، لیکن آخری دو شاعر اصلاً نظم نگار ہیں، غزل گو نہیں۔ اس لحاظ سے صرف پرویز شاہدی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی غزل کی ترقی پسندی کا موازنہ مجروحؔ کی غزل گوئی کی انقلابیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اشتراکیت مجروحؔ کے تغزل کی خصوصیت نہیں ہے، صرف ایک سطحی کیفیت ہے، فنی اعتبار سے میرے نزدیک یہ مجروحؔ کا ہنر ہے۔ وہ نہ صرف غزل کے اداشناس ہیں بلکہ اپنے شاعرانہ مزاج کا بھی شعور رکھتے ہیں اور اس کی حدود سے واقف ہیں۔

مجروحؔ ترقی پسند قبیلے سے تعلق رکھنے والے غزل گو شاعر ہیں۔ ترقی پسند شاعروں میں کچھ غزل کے حامی رہے ہیں اور کچھ اس کے شدید مخالف۔ مولانا حسرتؔ موہانی ترقی پسند شاعر تھے لیکن نہ صرف غزل کے حامی بلکہ اس کو ایک نیا موڑ دینے والے بھی تھے۔ ترقی پسند شاعروں میں اور لوگوں نے بھی غزلیں کہیں اور خوب کہیں مثلاً فیضؔ، فراقؔ، جذبیؔ اور جاں نثار اختر نے اپنی عمر کے آخری دور میں۔

انھوں نے اپنے حالیہ مسائل اور پریشانیوں کا اظہار غزل کی زبان میں شروع کر دیا اور غزل کی

نئی شکل ''جدید غزل'' کے نام سے موسوم ہوئی اور تقریباً اسی دور میں ترقی پسند تحریک اردو ادب میں در آئی تھی۔ چنانچہ نوجوان شعرا اردو کا ایک عظیم کارواں ترقی پسندی کا پرچم لے کر ایک نئی اور خوبصورت دنیا تعمیر کرنے کے لیے جادہ حیات پر گامزن ہوگیا۔

مجروحؔ ہندوستان کی آزادی اور آزادی کے بعد ملک کے لیے جس نظام زندگی کو پسند کرتے ہیں وہ اشترا کی نظام میں ہے، اوراس لحاظ سے وہ سرخ پرچم کے نغمہ خواں ہیں۔

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروحؔ
وہ سر زمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

یہ وہ زمانہ تھا کہ اس ملک میں سوویت یونین اور اشترا کی نظام کو بہت مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ مجروحؔ اور اسی قبیلے کے دوسرے شعرا کے یہاں اس ضمن میں جو اتنی شدت ہے وہ شاید اس شک اور پابندی کا سخت ردعمل ہے۔

عندلیب شادانی نے ۱۹۳۷ میں ماہ نامہ ''ساقی'' میں وہ مہم چلائی کہ خدا کی پناہ۔ فراقؔ نے اسی پر تو جھنجھلا کر ''دور حاضر اور اردو غزل گوئی'' کے عنوان سے جولائی ۱۹۳۷ میں رسالہ ''نگار'' میں ایک مضمون لکھا۔

یہ سمجھنا سخت گمرہی ہے کہ دور حاضر میں اردو نظم نے تو ترقی کی ہے لیکن اردو غزل محض جھک مار رہی ہے۔ اور قحبہ چوں پیر شود، پیشہ کند والی، کے مصداق بن رہی ہے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے وار کیا۔

اس میں (غزل میں) ایک بڑی سہولت یہ ہے کہ تھوڑی سی موزونیٔ طبیعت سے غزلوں کا پورا دیوان تیار ہو جاتا ہے۔ نہ تخیل کی ضرورت نہ مشاہدہ و مطالعہ کی احتیاج، ہر قسم کے الفاظ و مضامین کا وافر ذخیرہ موجود ہے، کسی مخصوص وزن پر الفاظ جوڑ لیے اور غزل بن گئی۔ سننے والوں نے یار فروشی کی خاطر یا اپنی خوش فہمی کا ثبوت دینے کے لیے زبانی یا تحریر میں اس زور وشور سے ''واہ واہ'' کی کہ شعر کا صحیح ذوق رکھنے والے مبہوت ہو کر رہ گئے اور انھیں اپنی سلامتیٔ ذوق پر شبہ ہونے لگا۔

غزل پر ایک نئے زاویے سے اعتراض کیا جا رہا تھا۔ محض عشق، خواہ وہ کتنا ہی صالح کیوں نہ ہو، زندگی کی واحد حقیقت تو نہیں تھا، اعتراض یہ تھا کہ تنگ نائے غزل زندگی کے نئے مضامین کے اظہار کی متحمل نہ تھی۔ اس لیے ترقی پسندوں میں غزل سے انحراف اور نظم کی طرف بڑھنے کا زبردست رجحان تھا، خود جگر نے گھبرا کر کہہ دیا۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

دوسری طرف ایسے بھی لوگ تھے جو غزل کے اندر ہی روایت بھی اور روایت سے بغاوت کی رو بھی جاری و ساری دیکھتے تھے، خود فراق نے اپنے مضمون ''غزل کی ماہیت و ہیئت'' میں کہا۔ ''زندگی کے مرکزی اور اہم حقائق و مسائل غزل کے موضوع ہوتے ہیں۔ ان حقائق میں واردات عشق کو اولیت

حاصل ہے کیوں کہ انسانی تہذیب کے ارتقا میں جنسیت نے اندھے طوفان کو توازن بخشا یعنی تہذیب جنسیت تاریخ کا بہت بڑا کارنامہ رہا ہے۔ ہم محبوب سے محبت کر کے اور محبت کو رچا سنوار کے اپنی زندگی کو رچاتے اور سنوارتے ہیں۔ حیات و کائنات سے محبت کرنا سیکھتے ہیں اور زندگی کی دھار کو کند ہونے سے بچاتے ہیں۔ غزل ہمیں جنسیت کی اہمیت کا احساس کراتی ہے، اور جنست جب داخلی اور غیبی طریقوں سے عشق بن جاتی ہے تو اس عشق کے لامحدود امکانات کی طرف اس عشق کے ذریعے سے تعمیر انسانیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ عشق کا پہلا محرک محبوب کی شخصیت ہے، پھر یہی عشق حیات و کائنات سے ایک ایسا والہانہ لگاؤ پیدا کر دیتا ہے کہ جنسیت کے حدود سے نکل کر عشق ایک ہمہ گیر حقیقت بن جاتا ہے۔"

کسی اور مقام پر فراق ہی نے کہا ہے کہ عشق اپنے اعلیٰ مقام پر پہنچ کر "شعور، تحت الشعور اور لاشعور" کے درمیان کڑی بن جاتا ہے۔

عرفی نے غم عشق اور غم دنیا کے اسی ربط کو ایک اور انداز میں بیان کیا ہے۔

اسی بحث اور پس منظر میں مجروحؔ سلطانپوری کا شعری ذوق پروان چڑھ رہا ہے۔ غالباً وہ ۱۹۴۰ ہی سے شعر کہتے تھے۔ ۱۹۴۱ میں ان کے ان اشعار سے:

اللہ رے وہ عالم رخصت کہ دیر تک
تکتا رہا ہوں یوں ہی تری رہ گزر کو میں
یہ شوق کامیاب یہ تم یہ فضا یہ رات
کہہ دو تو آج روک دوں بڑھ کر سحر کو میں

۱۹۴۶ کے اس شعر کا مقابلہ کیجیے:

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

تو اس سفر کا پتہ چلے گا جو مجروح کے ساتھ اردو غزل نے شروع کیا تھا۔ یہاں عرفی کے شعر کی تصدیق ہوتی ہے۔ مجروح کے دل کے شیشے میں غم عشق کی شراب خام، غم زندگی کی آگ میں تپ کر مئے دو آتشہ بن جاتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جب معشوق کا ہاتھ مل جاتا ہے تو زندگی کی تاریک راہوں میں امید کے چراغ جل اٹھتے ہیں۔

۱۹۵۲ سے ہندوستان کے لیل ونہار کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ ہندوستان کا اپنا ایک آئین ہے پارلیمنٹ ہے۔ چناؤ ہیں۔ اب زندگی کی کشمکش کے تیور اور ہیں۔
مجروح نے پھر شعر میں اس نئے پن اور اس نئے دور کی انفرادیت کو ڈھال لیا ہے۔ ۱۹۵۲ میں یوں کہتے ہیں:

دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آکر
سوچتا ہوں یہ تری راہگذر ہے کہ نہیں

خدا کرے غم گیتی کا پیچ و تاب اے دوست
کچھ اور بھی تری زلفوں کو تابدار کرے

۱۹۹۳میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوتی ہے۔یہی زمانہ ہے جب مجروحؔ کی شاعری کا آغاز ہوتا ہےاور بہت ہی کم عرصے میں وہ مشاعروں کے بہت ہی مقبول شاعر ہو جاتے ہیں۔۱۹۴۲میں ہند وستان کی جنگ آزادی ایک نیا رخ لیتی ہےاورتشدداوردہشت انگیزی کےہتھیاراستعمال کیے جاتے ہیں۔۱۹۴۳میں بنگال میں قحط پڑتا ہے جس کی ے داری فطرت پر نہیں بلکہ انگریزی حکومت اور ہند وستانی منافع خوروں پر عائد ہوتی ہے۔۱۹۴۵میں جنگ عظیم ختم ہوتی ہے،لیکن اٹیمی ہتھیاروں کے استعمال کے بعد دنیاایک ایسے خطرے سے دوچار ہوتی ہے جس کا سدباب ابھی تک نہیں ہو پایا ہے۔ ۱۹۴۶سے فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوجاتے ہیں۔۱۹۴۷میں اور بھی بھیانک خونریزی کے ساتھ ملک کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔۱۹۸۴میں مزدوراورکسان تحریکوں میں نیا جوش پیدا ہوتا ہے جس کو دونو ں نئے ملکوں کی جمہوری حکومتیں خطرناک سمجھتی ہیں۔رفتہ رفتہ اس صورت حال کے اثرات اردو کے ادیبوں پر بھی نافذ ہوتے ہیں۔پاکستان میں راولپنڈی سازش کیس کا نام دے کراور ہندوستان میں بغیر کوئی خاص نام دیے شاعراورادیب جیل میں بند کیے جاتے ہیں۔چناچہ۱۹۵۱میں مجروحؔ بھی ایک سال کے لیے داخل زنداں ہوتے ہیں۔اسی زمانے کا ایک مطلع ان کے ذہنی سفر کی کہانی کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد وگیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

ان کا تعلق سیاست سے تھا۔ اب کچھ یادیں ادب اور بالخصوص اردو غزل کے تعلق سے تازہ کر لیں ۔۱۹۳۸میں اقبال کی وفات ہوتی ہے ،وہی اقبال جن کی غزل کو لکھنؤ والوں نے ''وبال جبریل'' کہا مگر جنھوں نے غزل کی زبان اور اس کی ذہنی فضا کو اپنے جذبے کی صداقت، اپنے شعور کی پختگی اور اپنے فن کی صلابت سے ہمیشہ کے لئے متاثر کر کے ہی چھوڑا۔ اقبال کی وفات سے دو سال قبل ۱۹۳۶میں ترقی پسند ادبی تحریک کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا اور دھیرے دھیرے اس سے متاثر نئے شعرا اور افسانہ نگار سامنے آرہے تھے۔ ۱۹۴۰میں لاہور میں ''حلقۂ ارباب ذوق'' قائم ہوتا ہے جو غالباً ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی ادبی انجمن تھی اور چونکہ اس کے جلسے اب بھی پابندی سے اور خاص اہتمام سے ہوتے ہیں، اس لئے یقیناً دنیا میں اپنی نوعیت کی سب سے قدیم فعال انجمن ہے۔ ''تحریک'' اور ''حلقہ'' دونوں کے اثر سے اردو میں آزاد نظم کا رواج تیزی سے پھیلتا ہے اور یوں بھی نئے شعرا میں غزل کے مقابلے میں نظم زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ ۱۹۴۳میں فیض کا پہلا مجموعۂ کلام ''نقش فریادی'' شائع ہوتا ہے جس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ شاعر نے اسے دو حصوں میں بانٹ دیا تھا اور اس طرح غم جاناں اور غم دوراں کی ثنویت کو ایک باقاعدہ مرحلہ بنا کر پیش کیا تھا۔ اس ثنویت نے دوسری شکلیں بھی اختیار کیں مثلاً داخلی شاعری بنام معروضی شاعری، افادی ادب بنام غیر افادی ادب، فن برائے حیات بنام فن برائے فن۔

مجروح نے جو دیوان شائع کیا تھا اس میں وہ تمام غزلیں اور متعدد ایسے اشعار نہیں شامل کئے جن کے سلسلے میں انھیں لوگوں کے طعنے سننے پڑے تھے۔ (مثلاً رشید احمد صدیقی نے لکھا تھا کہ مجروح تو ''شاعری کو کاٹ کھانے پر اتر آتے ہیں'') ایسا کرنے سے مجروح کا دیوان تو منتخب ہو گیا مگر ایک رخ

سے دیکھئے تو وہ خود بھی ان طعنہ دینے والوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ بعض اشعار مضامین میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ دو مطلعے حاضر ہیں۔

لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا
ہو کے رہے گی دھرتی اپنی دیس ہمارا ہو کے رہے گا
امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

تمام ترقی پسند شاعروں نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں سیکڑوں مشاعروں میں نظمیں پڑھی ہیں اور تقریریں کی ہیں، لیکن وہ ذوق وشوق اور وہ اثر نہیں دیکھا جو مزدوروں کے مجمع میں نظر آیا۔ مجروح سلطانپوری نے جب مزدوروں کے سامنے اپنی ایک غزل پڑھی:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

مجروحؔ سلطانپوری کی زندگی میں تین نہایت اہم شخصیتیں آئیں جنھوں نے ان کی شاعری اور اندازفکر کو سنوارنے، نکھارنے اور خوب سے خوب تر بنانے میں دانستہ یا نادانستہ بڑے اہم فرائض انجام دئے۔ پہلی شخصیت آسی الدنی کی ہے، دوسری رشید احمد صدیقی کی اور تیسری جگر مرادآبادی کی۔

مجروح سلطانپوری اردو زبان سے اپنی جذباتی وابستگی، فلمی دنیا میں اردو کے حال زار اور اس کے استحال پر اپنی تشویش اور اپنے تردد کا اظہار کیا۔ ایسے ہی ۲۱ر جولائی ۱۹۹۴ کے خط میں وہ لکھتے ہیں:

''حکومت کی طرح اور یقیناً اسی کی اخلاقی شہہ پر ہمارے سنسر بورڈ والے اردو فلم کو بھی ہندی کا سرٹیفکٹ دیتے ہیں۔ یہ روایت بیسوں سال سے چلی آرہی ہے مگر ادھر سات آٹھ سال سے فلموں میں ہماری زبان حد درجہ بے آبرو ہورہی ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ مکالمہ نگاری سے لے کر مکالمے ادا کرنے والے کردار جس قدر غلط زبان اور دانستہ اس کے لب ولہجہ کا مثلہ کررہے ہیں اسے دیکھ کر دل خون ہوتا ہے اور اس پر ہم جو یہاں بھی اقلیت میں ہیں، ہماری بے دست وپائی بھی دیدنی ہے۔ انا اللہ!۔''

گلکاری وحشت کا شاعر: مجروح سلطانپوری مرتب خلیق انجم ص ۲۲۳

مجروح سلطانپوری نے آسی مرحوم کواپنا پہلا استاد قرار دیا ہے اور ایک کے بعد دیگرے دو غزلیں ان کی اصلاح کے لئے پیش کیں...استاد نے استادانا انداز دکھائے، الفاظ بدل دئے، خیالات تبدیل کر دئے چنانچہ اشعار تو بن سنور گئے لیکن اس نوجوان شاعر کو جھٹکا لگا۔ اپنا اعتماد بکھرتا ہوا دکھائی دیا، اس لئے وہ استاد اور شاگردی کے اس رشتہ سے بدک گئے جس میں اپنی پہچان باقی نہ رہے۔ پھر اپنی خوبیوں، خامیوں کے ساتھ اپنی ڈگر پر تنہا چل پڑے۔ اچھا برا جو کچھ کہتے اسی کو اپنی شاعری کا سرمایا تصور کرتے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں حذف واصلاح بھی کرتے جاتے۔ مجروح کی زندگی کا یہ پہلا لیکن نہایت اہم فیصلہ تھا۔

دوسری اہم شخصیت پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تھی، جنھوں نے مجروح کو ۱۹۴۳ میں علی گڑھ بلایا تا کہ وہاں کے ماحول اور کتب خانے سے علمی وادبی فیض حاصل کرنے کا موقع ملے، جس نے انھیں کیا سے کیا بننے میں بڑی مدد کی۔

اعتراف کرتے رہے اور ان سے متعلق مختلف قسم کے واقعات سناتے رتیسری محترم شخصیت جگر مرادآبادی کی تھی، جنھوں نے مجروح کے کلام پر اصلاح کبھی نہیں کی لیکن وہ استاد سے پڑھ کر ان کی ذہنی تربیت سے دلچسپی لیتے رہے اور مختلف انداز سے رہنمائی کرتے رہے۔ چناچہ ان کی شفقت، محبت دلچسپی اور گہرے تعلق کا آخیر دم تک مجروح نہایت والہانہ انداز سے۔

انھیں حضرات کے ہلکے، گہرے اور دیرپا نقوش کے ساتھ خود ان کی فکر شعر گوئی، غم دوراں اور غم جاناں سے تپتی، پگھلتی، ڈھلتی اور نکھرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی....کبھی غم دوراں کی ترجمانی کی تو وقت اور اس کے تقاضوں سے ہمعصروں کو آگاہ کیا اور زلف گیتی کے سنوارنے کی سعی کی اور کبھی گیسوئے محبوب کے خیال میں کھو گئے، تو ایسی غزل چھیڑ دی کہ سب چونک پڑے، اس لئے کہ آواز بھی نئی محسوس ہوئی اور خیالات بھی مختلف نظر آئے۔

لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مجروح سلطانپوری نے جب شاعری شروع کی تو ابتدا نظم گوئی سے ہوئی تھی۔ کچھ مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا، پھر غزل کی طرف متوجہ ہوئے تو نظم گوئی سے دلچسپی کم ہونے لگی۔ شاید انھیں احساس ہوا کہ نظم کے میدان میں کچھ اضافہ نہ کرسکیں گے اس لئے غزل کو ہی اپنے احساسات، جذبات اور افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

مجروحؔ سلطانپوری کی ۱۹۴۵ میں ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود نظم گوئی سے بے تعلقی کا اور معتوب صنف غزل سے گہری وابستگی کا فیصلہ ان کی آئندہ زندگی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ مجروحؔ جس عہد کی پیداوار ہیں اس میں حالیؔ اور اقبالؔ کی وجہ سے اردو ادب کے ایوان میں نظم گوئی بلند مرتبہ ہو چکی تھی اور اس کے برخلاف الزمات تراشے جارہے تھے اور فتوئے سنائے جارہے تھے۔ جگرؔ جیسے غزل گو حالات اور ماحول سے متاثر ہوکر یہ کہنے لگے تھے:

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

مجروحؔ سلطانپوری کی زندگی میں ۱۹۴۵ اس لیے اہم ہے کہ وہ اس سنہ میں عروس البلاد ممبئی تشریف لے گئے تھے۔ اسی زمانے میں فلم سے ان کا تعلق پیدا ہوا تھا اور اسی دور میں وہ ترقی پسند ادب سے وابستہ ہوئے تھے اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ ۱۹۴۵ نے ان کی زندگی کو نئے نئے تجربات سے ہمکنار کرنے، نئے نئے فیصلے سنانے میں مدد کی، تو درست ہوگا۔ اسی کے بعد سے وہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ عملی سیاست سے بھی قریب ہوئے۔

وہ غم جاناں کی زبان میں غم دوراں سے بھی باخبر کرنا چاہتے ہیں۔

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاش دست رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقش پا سے راہیں

یا

بچالیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

یہ وہ زمانہ ہے جب مجروحؔ سلطانپوری کا تعلق فلم سے بھی ہو گیا تھا، اور ہندوستان کی جنگ آزادی فاتحانہ اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی اور انگریزوں کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئی تھیں اور سارا ہندوستان آزادی کی نعمت پا کر رقص کرنے لگتا ہے اور آزادی کے ترانے میں محو ہو جاتا ہے۔ اس رقص و سرور میں ہر طبقہ اور ہر مذہب و ملت اور ہر خطہ اور ہر پیشہ کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔

محرکات و عوامل نے چونکہ ہماری ساری زندگی کو متاثر کیا ہے اس لیے دوسرے جذبوں کے ساتھ جذبۂ محبت پر بھی اس کا اثر پڑا ہے چنانچہ آج کی محبت کی غایت اور اس کے اقدامات و اثرات کی نوعیت کل کی زندگی سے بالکل جدا ہے۔ پہلے کی طرح دنیا آج بھی اہل دل سے خالی نہیں ہے لیکن اب ان کے نزدیک محض ''فنا آمادگی'' اور ''وصال محبوب'' محبت کی معراج و مقصود نہیں رہے۔

بقول فراقؔ:

اہل دل تم کو مبارک یہ فنا آمادگی
لیکن ایثار محبت جان دے دینا نہیں

ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست
وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بنا

عشق کی اس بدلتی ہوئی نوعیت کے اسباب کیا ہیں؟ اس کا جواب مشکل نہیں ہے۔ جو لوگ زندگی کی حرکی اور نامیاتی قوت پر نظر رکھتے ہیں ان کے لیے یہ کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ حالیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ اور ہمارے دور کے کسی شاعر کے کلام سے اس کا جواب دیا جاسکتا ہے۔ فیض احمد فیضؔ کے یہاں تو یہ بدلتا ہوا رجحان جگہ جگہ نمایاں ہے۔ ایک نظم کا صرف آخری بند دیکھیے:

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے

اور بھی دکھ ہے محبت میں زمانے کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

جذبیؔ کے یہاں بھی اس قسم کے اشارے ملتے ہیں:

کیا خبر تھی کہ ترے پھول سے بھی نازک ہونٹ
زہر میں ڈوبیں گے کمھلائیں گے مرجھائیں گے

کوئی الجھاہوا نغمہ کوئی سلجھاہو ا گیت
کون جانے لب شاعر کی نوا کیا ہوگی
ہاں مگر دل ہے کہ دھڑکے ہی چلا جاتا ہے
اس سے بڑھ کر کوئی توہین و فا کیا ہوگی

بدلتی ہوئی دنیا کے سانحہ کے ساتھ وقت کے ہاتھوں محبت کا رخ کدھر سے کدھر مڑ رہا ہے۔کل محبت کا تصور محض جمالیاتی اور شخصی تھا آج اس میں جلالی و اجتماعی شان بھی نمایاں ہے۔کل تک محبت جنسی لذت کشی کے سوا کچھ نہ تھی اور آج وہ ایک بڑے مقصد سے ہم آہنگ ہے۔اب اس میں وہ افادی اور سماجی روح بھی نمایاں ہے جو پہلے انفرد یت کے خول میں گھٹ کر رہ گئی تھی

مجروحؔ سلطانپوری نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اسے ایک طرف غزل کی کلاسیکی روایت کا آخری دور کہا جاسکتا ہے تو دوسری طرف بدلتی ہوئی زندگی کی لے پر ترتیب ایک نئے شعری آہنگ اور اسلوب کی تلاش کا وقفہ بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔مجروحؔ سلطانپوری نے نئے تقاضوں کی جانب تغزل ہی کے راستے سفر کیا۔چونکہ ان کا خیال تھا کہ بعض ترقی پسند نقادوں نے نئے شعری مواد کے لیے نئے ہیئتی پیکروں پر اصرار کر کے ایک نوع کے Formalism ہی کی تائید کی تھی۔شاید یہ حضرات اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ غزل سے تغزل منہا کر کے سب کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن تغزل برقرار رکھتے ہوئے کھر درے حقائق کا بیان نہ صرف بہت مشکل ہے بلکہ جوکھم کا کام ہے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب کلاسیکی غزل کی روایت کا سماجی و معاشی اور سیاسی تاریخ کے سیاق میں مطالعہ کیا جائے۔آزادی کی تحریک اور آزادی کے بعد کے تعمیر نو کے دور میں کلاسیکی سرمایہ کی جانب جس بے توجہی کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور اب یہ حالت ہے کہ اس بے توجہی کے باعث کلاسیکی روایت میں گندھے ہوئے شعرا بھی بذات خود کلاسیکی شعرا کی صف میں آ کھڑے ہوئے ہیں وہ انتہائی افسوس ناک ہے۔آزادی بذات خود

ایک نعمت ہے بشرطیکہ یہ واقعتاً آزادی ہو۔ لیکن آزادی کا ایک مفہوم اپنی روایت کے سوتوں کی زیادہ بہتر طور پر دریافت اور نئے دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی روشنی میں ''روایت'' کے زندہ عناصر کی ازسرنو دریافت بھی ہے۔

مجروحؔ نے جس دور میں شاعری شروع کی وہ آزادی کی عظیم الشان تحریک کا زمانہ تھا۔ یہ قوم پرستی سے بین الاقوامیت، ذات سے اجتماعیت اور ذاتی مسرت سے اجتماعی مسرت کی جانب سفر کا زمانہ تھا۔ ہر دور نئی حقیقتوں اور مماثلتوں کا ادراک لایا تھا۔ شاعروں نے اسی دور کی مناسبت سے مختلف تجربات کیے۔ بعض غزل گو شاعروں نے بعض استعارات کو خفیف سے فرق کے ساتھ اس درجہ ہمعصری بنانے کی سعی کی کہ وہ روایت سے درایت کی منزل پر جا پہنچے۔ فیضؔ نے اپنی Image کے ذریعے اکثر و بیشتر مغربی شاعری کے ارتعاشات کو ''اردودانے'' کے رجحان کی ابتدا کی اور یہ کام اس قدر مہارت سے کیا کہ ان کے استفادہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ فیض، سوئن برن، روسی ٹی، نیرودا اور لورکا سے بے حس متاثر ہیں اور انھوں نے جا بجا، ان شاعروں کے مخصوص رویوں سے استفادہ کیا ہے۔

اس صدی کے تیسرے عشرہ میں رونما ہونے والی معاشی اتھل پتھل نے اس صدی کے انسان کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا جب اخبارات کے تجارتی اور مالیاتی امور سے متعلق صفحات یک بیک اہم ہو گئے۔ کلاسیکی معاشیات کے بڑے بڑے ستون تیزی سے گرنے لگے اور اس کی شکست و ریخت کے پس پشت سیاسی ہاتھ اس درجہ واضح نظر آنے لگے کہ ادب کی وہ ساری تعریفیں جو غزل میں تغزل اور مواد (Content) کو ہیئت (Form) سے علیحدہ خیال نہ کرتی تھیں غلط ثابت ہونے لگیں۔ ایک طرف یوروپ میں تھامس مان نے کہا کہ ''اس دور کا مقدر سیاسی ہے'' تو دوسری طرف منشی پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ (۱۹۳۶) میں اس خیال افروز حقیقت کا اعلان کیا کہ ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔'' ترقی پسندوں کے اثرات زائل کرنے کے لئے حلقۂ ارباب ذوق وجود میں آیا۔ ترقی

پسند ہوں یا حلقۂ ارباب ذوق کے وکلا غزل بلکہ تغزل سے ہر دو جانب سے زد پڑی۔ یہ وہ دور تھا جب اصغر، فانی، حسرت اور جگر، ثاقب، یاس، یگانہ، جمیل مظہری اور در جنوں کم اہم غزل گو تغزل کا جادو جگائے ہوئے تھے۔

یہ ادبی قدروں کے تیزی سے بدلنے کا زمانہ تھا، اور ترقی پسند تحریک اپنی پوری توانائی کے ساتھ ادبی فضا پر چھانے لگی تھی۔ اس تحریک کی سیاست زدگی اور بعد میں جدیدیت کی عدم غنائیت اور نثری اور غیر رومانی انداز نے متذکرہ بالا عاشقانہ طرز کو نئے رجحان کے خلاف ٹھہرایا۔ گویا جو شعری آہنگ تھا اسی کو خارج آہنگ قرار دے دیا۔

مجروحؔ کی غزل جگرؔ اور بالواسطہ اصغرؔ سے متاثر ہے، لیکن وہ ان استادان فن کی نقل نہیں بلکہ فکری اعتبار سے کئی جہتوں میں ان سے آگے نکل گئی، جیسے ارسطاطالیس اپنے استاد افلاطون سے مختلف ہو گیا تھا۔ افسوس ہے مجروحؔ کا سرمایہ سخن مختصر ہے ورنہ ان کا کلام رشید احمد صدیقی کے ''بادشاہان تغزل'' پر ایک اضافہ ہوتا۔

نظیریؔ نے مستوری، رموزیت اور سریت سے عشق کا بھی رشتہ تصوف کے علاوہ جوڑ دیا ہے۔ غزل میں یہ وصف عاشقانہ مزاج کی پیدائشی سعادت کے ساتھ بزرگ صوفیوں اور شاعروں کی صحبت سے اور ان کا کلام پڑھنے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مجروحؔ کے یہاں یہ عمل ۱۹۴۵ سے پہلے پورا ہو چکا تھا۔ ان کی شخصیت میں اودھ کے کسی شہر سبا کی بلقیس نے ''بنائے خون جگر'' ڈال دی تھی اور جگر اور اصغر جیسے بلند پایہ صوفی شاعروں نے اسی خون جگر میں گرمی و شورانگیزی پیدا کر دی تھی۔ پھر فارسی کے عظیم شاعروں کے مطالعہ نے ان کے طرز سخن میں بندشوں، استعاروں اور علامتوں کا حیرت انگیز سلیقہ پیدا کر دیا اور ان کے قلم کو الفاظ کی تراش خراش کا ہنر سکھلا دیا۔ مجروحؔ کی شاعری میں ہنر یا فن کا بہت دخل رہا ہے۔

مجروحؔ کی جوانی کے زمانے میں ادبی تنقید صحافت کے بہت قریب آ گئی تھی اور ادب کے وسیع تاریخی تناظر میں دیکھنے کے بجائے دس، دس بلکہ پانچ، پانچ سال کے ادبی ارتقاء کے بہی کھاتے تیار کیے جاتے تھے۔ انھیں اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ ہزار سالہ عجمی روایت کے مزاج اور اس کی رمزیت و اشاریت پر غور کرتے اور ہم عصر شاعری میں اس کی شناخت و دریافت کرتے۔ ان دانشوروں نے جب سیاسی رمزیت کی اصلاح نکالی تو یہ بھی نہ سوچا کہ سیاست اور رمزیت میں دور کا بھی واسطہ نہیں ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ چنانچہ اس اصطلاح کی بڑی گرم بازاری رہی۔ عام طور سے اس کا سہرا فیض کے سر رہا۔

مجروح نے ترقی پسند شاعری کو سنوارا ہے۔ شروع میں تو وہ اصغر اور جگر کی میراث لے کر اودھ سے علی گڑھ ہوتے ہوئے ممبئی پہنچے، مگر بعد میں وہ اس عروس البلاد میں رہ کر نئے افکار و نظریات سے اس طرح بہرہ ور ہوئے جیسے غالب دہلی سے کولکاتا جا کر ہوئے تھے۔ بلکہ مجروح کا ممبئی غالب کے کولکاتا سے زیادہ روشن خیال اور سخن پرور تھا اور اردو کے ممتاز شاعروں کے علاوہ دوسری زبانوں اور تہذیبوں کے بہترین دماغ وہاں موجود تھے۔ ظاہر ہے کہ مجروح کے ذہنی ارتقا میں اس ماحول سے بہت مدد ملی لیکن اس سے پہلے وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے غزل کے عارف اور رمز شناس کے مہمان رہ چکے تھے، جہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ادیبوں اور دانش وروں کی آمد و رفت رہتی تھی، جو ترقی پسند تحریک کے علاوہ عالمی ادب کی زیادہ کشادہ اور معتبر فضا میں رچے بسے تھے۔

مجروح کی غزل کے بارے میں جو رویہ ان کے ہمعصروں، ہم مشربوں اور بعد میں جدیدیوں کا رہا، اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں ذرا رک کر پیچھے مڑ کر دیکھنا ہوگا۔ یگانہ کی طرف ..... یگانہؔ شاعری کا البیلا پن، کاٹ، مردانگی اور حوصلے کے ساتھ زبان و بیان پر ان کی خلاقانہ قدرت سے کون صاحب نظر انکار کر سکتا ہے، لیکن ہوا یہی کہ انھیں ٹاٹ باہر کر دیا گیا۔ نہ ان کے ہم عصروں نے انھیں قابل اعتبار

سمجھا اور نہ بعد میں ترقی پسندوں اور جدیدیوں نے ان کی عظمت کا صحیح اعتراف کیا۔ چونکہ اس اعتراف سے ان کے ریت کے گھروندے زمین بوس ہو جاتے۔ اور چونکہ مجروح بھی اسی مردانہ قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اور تو اور ان کے ترقی پسند معاصرین نے بھی ان کی شاعری کی ویسی پذیرائی نہیں کی جس کی وہ مستحق تھی۔ بلکہ اس کے مقابلے میں دوسرے درجے کے شاعروں کو بانس پر چڑھا دیا بلکہ مداہد اور نہ جانے کیا کیا بنا دیا۔

مجروح نے ۱۹۴۵ میں ترقی پسند غزل کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے انھوں نے جگر صاحب کے فیض صحبت سے اردو اور فارسی کی غزل کی بہترین روایات سے ایک زندہ آگہی حاصل کر لی تھی۔ اس آگہی سے ان پر یہ راز منکشف ہو گیا تھا۔

مجروح نے ایوان شاعری میں اس وقت قدم رکھا جب شاخ غزل پر زرد موسم کی دست کاریاں نمایاں ہونا شروع ہو گئی تھیں اور وہ کافر صنف، جو ایک مدت سے حاصل فکر وفن اور متاع سخن خیال کی جاتی تھی، داغ داغ پیرہن اور زخم زخم بدن لئے مقتل نقد ونظر میں سرنگوں اپنی شہادت کا مظہر نامہ سننے کی منتظر کھڑی تھی۔ فرد جرم یہ تھی کہ اس کے دامن میں سوائے حسن وعشق، گل وبلبل، نامہ و پیام اور بادہ و جام کے اور کچھ نہیں۔ نیز اس کی کوتاہ دامنی قافیوں کی فصیل میں قید طائر خیال اور کرب انفاس کی شکار فکر جمیل۔ سب اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ وہ ایک ایسا مقتل ہے جہاں معانی ومفاہیم کا لہو ایک مدت سے بہایا جا رہا ہے۔ صدیوں پرانے بازاری ہرجائی و آوارہ محبوب اور اس سے بھی صدیوں پرانے بے غیرت، بے ضمیر، بے حوصلہ عاشق کا احوال دل..... غرض اس نیم وحشی صنف سخن کو گردن زدنی قرار دد دینا علمی دہشت گردی کی دلیل خیال کیا گیا۔ نہ ادبی بے رحمی و شقا کی کی مثال۔ فیصلی صاف اور قطعی تھا۔ یعنی غزل کو بہر حال قتل ہونا تھا۔ سو تیغ تنقید کی آب داری ضروری تھی اور اس کو حالی پہلے ہی جلا دے چکے تھے۔ ان کی تنقیدی عدالت میں تو ''مقدمہ شعر و شاعری'' پہلے ہی چل چکا

تھا۔ البتہ اس شمشیر کو میان سے باہر نکالنے کا کام، ترقی پسند تحریک کے نظریات اور تبلیغی ڈھانچے نے، انقلاب کی نعرہ زنی نے، انگریزی ادب کے زیر اثر نظم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے اور سب سے بڑھ کر ہندوستان کی معاشرت اور معشیت نے جو غزل کو شاہی دربار سے سر بازار لے آئی۔ ایسے میں سرمایہ دار اور صنعت کار ''مائی باپ'' کے روپ میں ''منعم دریا دست'' ٹھہرے اور کسان اور مزدور کاسۂ گدائی لئے اپنے اپنے حصے کی بھیک کے منتظر۔ بقیہ عوام محض تماشائی، دور کے جلوے اور مفت کے حلوے کے طلب گار و تمنائی۔ حسرت نے جو یہ صورت حال دیکھی تو غزل کو دلکش بنانے کے شوق میں داغ اور امیر کا جھوٹا پیانہ حلقوم تک چڑھا گئے۔ بدمستی لازمی تھی۔ رند، ثاقب اور صفی نے صفائے غزل کا علم اٹھانا چاہا تو زبان کے عزاخانوں کے ماتم کناں بن بیٹھے۔ نتیجے میں غزل نوحہ وسلام بن گئی۔ ایسے میں اقبال نے جرائت رندانہ اور جوش قلندرانہ سے کام لیا اور اسے ایک نئی ڈگر پر لا کھڑا کیا۔ تیور تیکھے اور رنگ گہرے۔ مگر ترقی پسندوں کے ایک طاقت ور گروہ یعنی اشتراکی شعرا کو یہ بات پسند نہ آئی کیوں کہ ان کے قبلہ وکعبہ کے خطابات تو اپنی انشراح وابلاغ کے لئے نظم کا پیکر چاہتے تھے۔ لہٰذا ایک بار پھر ''مارو مارو'' کی صدا بلند ہوئی، اور اب کے پتھر ان کے ہاتھوں میں تھے جو غزل کی سنگ ساری کی سند حاصل کرنے کے لئے اپنی معصومیت کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ یوں غزل پر پیمبری وقت آ چکا تھا اور مسیحائی ضروری تھی۔ فیض چارہ گر ضرور بنے مگر انھیں یہ خوف بھی رہا کہ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، پھر ناحق ٹکڑے چن چن کر سجانے کا فاعدہ کیا؟ مجاز کا دل اس ''شہناز لالہ رخ'' پر آیا ضرور مگر بہت جلد وہ آوارگی کا شکار ہو گئے۔ مخدوم رات بھر دیدہ نمناک میں اس عکس کو چھپائے رہے مگر صبح ہوتے ہوتے وہ بھی اشتراکی چمن کے منڈوے تلے جا بیٹھے۔ پھر جذبی ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کیا کرتے البتہ سردار جعفری نے غزل کی شہزادی کے زخموں پر گاہے بہ گاہے مرہم ضرور رکھا مگر مکمل طور پر جاں نثاری وخود سپردگی کا اظہار وہ بھی نہ کر سکے کہ دل تو سلطانۂ نظم کی اداؤں کا اسیر تھا۔

پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کہتے ہیں ''مجروح سلطانپوری ہمارے شعرا کی جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، میری مراد فانی، یگانہ، حسرت، اصغر، جگر، فیض اور جذبی وغیرہ سے ہے۔

مرزا سلیم بیگ (پاکستان) کے ایک انٹرویو سے: (۱)

مجروح: ہمارے ہندوستان میں تو اردو ختم ہو رہی ہے، ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں اس کو بچانے کی، اس لئے ہمارے یہاں اردو میں وہ اپچاؤ نہیں ہے جو شعرا کو واقعی بلند بنا سکتا ہے، تو نیچورل ہمارے یہاں وہ اپچاؤ نہیں ہے، وہ رواج کم ہو گیا ہے تو آپ کے یہاں اچھے شعرا تعداد میں ہم سے زیادہ ہیں لیکن اردو میں ہمارے یہاں بھی اچھے شعرا ہیں، ہمارے گروپ کو چھوڑ دیجئے، ہمارے بعد جو شعرا ہیں، وہ اچھے شعرا ہیں، ہم کو لکھنؤ میں مل جاتے ہیں، ہم کو بمبئی میں مل جاتے ہیں، کلکتہ میں مل جاتے ہیں، مدراس اور حیدرآباد میں مل جاتے ہیں، جیسے آپ کے یہاں لیکن اردو چونکہ آپ کے یہاں قومی زبان ہے اور ہمارے یہاں اردو کی تعلیم ہی ختم ہو گئی ہے اس لئے ظاہر ہی کہ تعداد میں ہم کم ہو گئے۔ بڑا ملک ہونے کے باوجود آپ کے مقابلے میں ہماری تعداد کم ہو گئی اور آپ یہاں جو شاعری ہو رہی ہے اس میں ایک ایکسپریشن کی جو ایک الگ تازگی ہے جس پر لکھنؤ اور دلی کی چھاپ اب تک پڑی ہوئی تھی اس سے ذرا الگ محسوس ہوتی ہے اور اچھی لگتی ہے۔

تابش دہلوی کو میں تسلیم کرتا ہوں اور تابش دہلوی مجھ سے سینئیر بھی ہیں۔ تابش دہلوی جب پڑھتے ہیں تو میں نہ صرف یہ دیکھتا ہوں کہ شعر کیا ہے بلکہ یہ بھی دیکھتا ہوں کہ لفظوں کا استعمال کس طرح کیا گیا ہے۔

تابش ان اساتذہ میں ہیں جن سے کوئی سیکھنا چاہے تو سیکھ سکتا ہے۔ میں تو ان کی بڑی عزت

---

(۱) مقام اور کلام مجروح سلطانپوری مرتب ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۶

کرتا ہوں۔

سوال: نثری شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کے جواب سے بھی اس وقت کے ادبی ماحول کا پتہ چلتا ہے ۔جواب درج ذیل ہے:

جواب: دیکھئے صاحب! شاعری ہوگی یا نثر ہوگی،نثری شاعری اور غزلیہ نثر اور نثریہ غزل یہ تو مہمل سے جملے اور باتیں ہیں۔ میں اس کو قطعی نہیں مانتا ہوں۔ یہ چیزیں جو ہیں وہ خوبصورت عبارت آرائی کا نام ہے جسے انشا پردازی کہ لیجئے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ایک ہوتی ہے انشا پردازی تو یہ نثری شاعری جو ہے وہ انشا پردازی ہے،اور نثر میں بھی شاعری ہوتی ہے بھائی!

غالب کے خطوط، ہماری داستانیں،فسانۂ آزاد، قصہ چہار درویش وغیرہ جو ہماری داستانیں ہیں یا طلسم ہوشربا یہ سب نثری شاعری۔لیکن نثری شاعری آج کل جس چیز کا نام ہے وہ صرف شاعر نہ ہوسکنے کی وجہ سے اپنی ہوس مٹانے کا نام ہے کہ مجھے بھی شاعری کہا جائے۔

میں اپنا گھر بھی چلانا چاہتا ہوں، میں اپنے بچے اور بیوی کے بارے میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ حریص نہ بنیں، یہ حاسد نہ بنیں ،جب تک معاشی آسودگی نہیں ملے گی یہ سب نہیں ہوگا۔

ایک پہلو میرا یہ بھی ہے کہ میں نے کم کہا ہے مگر دوسروں کے مقابلے میں بہت اچھا کہا ہے ۔لیکن یہ کافی تو نہیں ہے نا۔ وہ جو غالب نے آموں کے بارے میں کہا تھا کہ ''بھئی میٹھے ہوں اور بہت ہوں'' یہی فن کے بارے میں ہے کہ اچھا ہو اور بہت سا ہو تب جا کے بنتی ہے بات۔

مجھے تو بہت بیوقوف لگتے ہیں ایسے لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ''ایک شعر سنیے یہ مجھے بہت پسند ہے۔'' میں اسے بہت جہالت سمجھتا ہوں۔ایسا ہرگز نہیں کہنا چاہیے۔ مجھے تو جو شعر پسند ہوگا میں کہوں گا، حضرت ایک شعر عرض ہے توجہ چاہتا ہوں شاید آپ پسند آئے۔

ندیم صدیقی اور رفیع نیازی کا مجروح سے لئے گئے انٹرویو سے

مجروح کہتے ہیں کہ میں طبیب ہو کر فیض آباد کے قصبہ ٹانڈہ آیا اور وہیں پریکٹس شروع کر دی۔ اس زمانے میں مدح صحابہ کا بڑا زور تھا۔ ہمارے مولوی صاحبان نے کہا کہ تم مدح صحابہ لکھو۔ میری ابتدائی تحریر کچھ ایسی تھی ۔

اٹھ نغمۂ توحید کا سرشار بنا دے
طیبہ کے مکیں پھر کوئی آواز سنا دے

میں مدح صحابہؓ میں زور شور سے چل گیا، یہاں تک کہ میری گرفتاری کی نوبت آ گئی۔ یہ سب میرے شعری سفر کی ابتدائی شکلیں ہیں۔

سلطانپور میں ہر ہفتے طرحی مشاعرہ ہوتا تھا جہاں میں نے ایک غزل پڑھی۔ نہ جانے میری آواز کا جادو تھا یا غزل کا طلسم۔ اس چھوٹے سے مشاعرہ میں خوب داد ملی تو نشہ چڑھا اور شعر و شاعری کے باقاعدہ دور کا آغاز ہوا۔ قصہ مختصر اس طرح ہم شاعر ہو گئے اور ہم نے اپنی پریکٹس کو لات ماری ۔ سلطانپور میں ہی ایک مشاعرہ تھا جس میں قرب و جوار کے شہروں سے شعرا بلاوائے گئے تھے۔ میں بھی مدعو تھا اور میری غزل حاصل مشاعرہ تھی۔ وہ غزل میری دوسری یا تیسری تھی۔ اس غزل کا مجھے یہ شعر آج تک یاد ہے ۔

ہم ہیں کعبہ ہم ہیں بت خانہ ہمیں ہیں کائنات
ہو سکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجئے

مجھے رشید صاحب کے یہاں تین سال قیام کا موقعہ ملا۔

رشید صاحب کے گھر آنے والوں میں جذبی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا حسرت موہانی، شیخ الجامعہ مجیب صاحب، ڈاکٹر عابد تھے جو اکثر میرا کلام سنتے تھے۔ اس وقت تک میں مشاعروں میں چھا چکا تھا۔ میں نے سوچا یہ مشاعروں وغیرہ کی داد بے معنیٰ ہے، بس میرے ذہن میں خیال آیا کہ جو کہوں دل کی گہرائیوں سے کہوں۔ اس قطع نظر کہ وہ اشعار لوگوں پر کیا تاثرات چھوڑتے ہیں اور لوگ اس پر داد دیتے ہیں یا نہیں۔

میری اچھی غزلوں میں ابتدائی غزلیں زیادہ تر علی گڑھ کے زمانے کی ہیں۔

ندیم صدیقی کے ایک سوال کے جواب میں مجروح فرماتے ہیں: (۱)

اپنے ابتدائی دور میں مجاز، جاں نثار اختر کی نظموں سے اور جگر صاحب و اصغر گونڈوی سے بہت زیادہ متاثر تھا اور جوش صاحب میرے پسندیدہ شاعر تھے۔

ایک دوسرے سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ جگر صاحب نے مجھکو جونپور کے ایک مشاعرے میں سنا، اپنے پاس بلایا اور کہا کہ آپ میں انفرادیت ہے اسے مت گنوایئے اور اس کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ میرے پاس کچھ دنوں رہیے۔ ظاہر ہے اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔

ایک اور سوال کے جواب میں کیا کہتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

جاں نثار کی غزل کو میں دوسرے درجے کی بہت اچھی غزل کہتا ہوں۔ دوسرا درجہ جب میں کہ رہا ہوں، تو میرے نزدیک انتہائی اور نچلی سطح مراد ہے۔ ان کی شاعری پر میرا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ جو کہنا چاہتے ہیں، کہ جاتے ہیں، آپ جو سمجھنا چاہتے ہیں، سمجھ جاتے ہیں۔ کچھ بچتا نہیں۔ جیسے ان کا یہ شعر ؎

---

(۱) مقام اور کلام مجروح سلطانپوری مرتب ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۸۷

انقلابوں کی گھڑی ہے

ہر نہیں ہاں سے بڑی ہے

اس شعر میں سننے کے بعد بھی بہت کچھ بچتا ہے۔ان کی عام غزل میں یہ بات نہیں ہے۔ مثلاً یہ مطلع:

ہم سے بھاگا نہ کرو دور غزالوں کی طرح

ہم نے چاہا ہے تمہیں چاہنے والوں کی طرح

ندیم صدیقی کے ایک اور سوال کے جواب میں مجروح کہتے ہیں" اسکرپٹ کے پیچھے نہ معلوم آپ کی کتنی روایتیں وابستہ ہیں، کتنی تہذیبی رویے وابستہ ہوتے ہیں، یہ کوئی معمولی سی بات نہیں ہے۔ تارخی طور پر، انسانی طور پر وہ تمام رشتے جو آپ کے جڑے ہوئے ہیں معلوم اور نا معلوم، تب کہیں جا کر ایک اسکرپٹ کو بدل دیا جائے تو دھیرے دھیرے اس کے بارے میں آپ کا ذہنی رویہ بدلنے لگتا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اردو رسم الخط نہ بدلا جائے۔ جو رسم الخط بدلنے کو کہتا ہے وہ بڑا احمق ہے"۔(۱)

ندیم صدیقی کے دوسرے سوال کے جواب میں مجروح کہتے ہیں:

میں بھی اسی زد میں آتا ہوں۔آپ سبھی کے بچے ہیں۔آپ کو پتہ ہوگا کہ ہمارا نظام تعلیم کتنا ناقص ہے۔ ہمارے بچے اپنا بستہ تک نہیں اٹھا پاتے اور ٹیچرس جان بوجھ کر ادھوری تعلیم دیتے ہیں کہ ان کو ٹیوشن ملے گا۔ اچھا اب اردو کیوں نہیں؟'' تو ابھی تک ہمارے معاشرے میں اردو کا رشتہ روٹی سے نہیں جڑا ہے۔اردو پڑھ کر کوئی شخص اچھی زندگی نہیں گزار سکتا۔ ہم جب اپنے بچے کے مستقبل کے

(۱) مقام اور کلام مجروح سلطانپوری مرتب ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۹۱

بارے میں سوچتے ہیں تو پھر ہمیں اردو کے ساتھ یہ غداری کرنی پڑتی ہے اور ہم یہ غداری کرنے پر مجبور ہیں۔ یا تو ہم بچے کو اردو پڑھا کر کانجی ہاؤس کا منشی بنائیں۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے اردو کی بدولت ملا ہے مگر میں اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھا سکا۔ ایسا نہیں کہ میں اردو کو گرا ہوا سمجھتا ہوں کہ میرا بچہ مجھے پہچانے ایک باپ کی حیثیت سے ہی نہیں، ایک شاعر کی حیثیت سے بھی۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ حکومت کہا کرتی ہے کہ آپ ہر بات حکومت سے چاہتے ہیں آپ خود کچھ نہیں کرتے تو میرا ایک سوال ہے حکومت سے کہ حکومت نے جو نظام تعلیم مقرر کیا ہے وہ کس حد تک ہمارے بچوں کے لئے ہے؟ اور وہ نظام تعلیم کس حد تک اس کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اس نظام تعلیم کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہ سیکھ سکے۔"(۱)

اردو کو نظام تعلیم کا ایک حصہ ہونا چاہیے، اور جس دن ایسا ہوگا تو شاید ہم ہی سب سے زیادہ اردو پڑھائیں گے اپنے بچوں کو۔ اگر آپ میرے اس جواب سے مطمئن ہیں تو ٹھیک۔ ورنہ میں اور کیا کہوں۔

رفیع نیازی کے ایک سوال کے جواب میں مجروح کہتے ہیں:

"بلاشبہ فیض کی غزلیں ان کی نظموں کی طرح اردو ادب کے لئے ایک تحفہ ہیں۔"

یعنی غزل دشمنی کی آواز کو دبانے میں فیض کی غزلوں نے کیا کچھ کم کردار ادا کیا ہے؟

☆☆☆

---

(۱) مقام اور کلام مجروح سلطانپوری مرتب ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۹۱

باب سوم

مجروحؔ کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی

مجروحؔ کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی

پروفیسر محمد حسن رقمطراز ہیں:

''مجروح سلطانپوری غزل کے قتیل ہیں حق یہ ہے کہ دور حاضر میں ان جیسا سجیلا اور طرح دار غزل گو نایاب ہے۔ انھوں نے غزل کو سیاسی رمزیت ہی نہیں ترقی پسند حیثیت سے روشناس کیا، دو چار براہ راست قسم کے شعر بھی کہہ ڈالے۔ مثلاً اس طرح کا برملا مصرعہ ؎

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں (۱)

اور ان کو لے کر ایسا ہنگامہ مچا کہ ان کی غزل کی طرح داری اور سجیلا پن اس شور میں دب گیا۔

مجروحؔ نے غزل میں جن تقاضوں کو برتا، دراصل وہ تقاضے تھے کیا؟ ترقی پسند تحریک شاعری سے کس قسم کے تقاضے کر رہی تھی اور ترقی پسندی کی پہچان کیا تھی؟ سوال خاصا الجھا ہوا ہے۔ مگر بنیادی مسئلہ ان تقاضوں کی شناخت ہی کا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے بعض علم بردار ترقی پسندی کی پہچان سمجھتے تھے:

(۱) براہ راست (خطیبانہ یا بیانیہ) انداز کو۔

(۲) ہنگامی سیاست کے موضوعات پر اظہار خیال یا ان کے ذکر اور ان کے بارے میں پیغام عمل کو (یعنی ان کا تعلق ترقی پسند فکر کے بجائے وسیع تحکمت عملی (STRATEGY) اور

سجیلا غزل گو (مجموعہ غزل) ص ۲

وقتی طریق کار (TACTICS) سے تھا)

(۳) بعض موضوعات کے تصورات کے دھرانے کو۔

اگر ترقی پسندی کی یہی پہچان ہے (اور مدتوں بعض نقادوں کو اسی پر اصرار رہا) تو غزل تو کیا کسی بھی تخلیقی فن پارے میں اسے پوری طرح برتنا اور برتتے رہنا ناممکن تو نہیں دشوار ضرور ہے۔ کیونکہ اس فارمولے میں فکر کا عنصر دبا ہوا ہے۔ داخلی احساس اور نجی تاثر کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے اور شعری حسن کی لطیف رمزیت ناپید ہے۔

اس کے مقابلے میں اگر ترقی پسندی نام ہے براہ راست یا بالواسطہ رمزیہ یا علانیہ انداز ہیں:

(۱) فکر و احساس کے ایسے اظہار کا جو انسان میں سماجی تبدیلی کی خواہش پیدا کرے اور

(۲) زندگی اور کائنات کی طرف صحت مند رویہ پیدا کر سکے۔

تو یقیناً یہ ترقی پسندی وسیع تر آگہی سے عبارت ہوگی۔ صرف قحط بنگال یا ویت کے نام کے موضوع پر مشق سخن کافی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات سے جو مجموعی تصور حیات سے ابھرتا ہے وہ حیات آفرین ہے یا زہر قاتل اور یہی مجموعی نظریۂ حیات یا زندگی کی طرف رویہ کسی فن کار کی عظمت کی پہچان ہے:

ان بجلیوں کی چشمک باہم تو دیکھ لیں
جن بجلیو ں سے اپنا نشیمن قریب ہے

پروفیسر محمد حسن صاحب مزید رقمطراز ہیں:

''غزل کو سیاسی رمزیت دینے کا یہ کام یوں تو بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اقبال سہیل اپنی

غزلوں میں سیاسی رمزیت کا استعمال برملا کرتے آئے ہیں ۔جگر مرادآبادی نے اپنے آخیر دور کی غزلوں میں سیاسی رمزیت کوواضح طور پراپنایا۔خودترقی پسند شاعروں کی صف میں جذبی نے سیاسی رمزو ایما کو برتا،البتہ مجروح اور فیض کے ہاں یہ رمزیت نئی بلندیوں تک پہنچی ۔دونوں کے ہاں اس کی نوعیت مختلف ہے،مجروح کے ہاں یہ لے بی۔ٹی رندیوے اور تلنگانہ تحریک کے دوران ابھری اور ۱۹۶۲ کے ہند چین مناقشے تک تقریباً ختم ہوگئی (دوچار شعراس کے بعدملیں تو ملیں)اس دوران مجروح کو جیل جانے کا تجربہ بھی ہوا،اور سر پرہوائے ظلم کے سوجتن کے ساتھ چلنے کا بھی ۔مگرفیض کے ہاں یہ تجربہ (اور لہٰذا یہ لہجہ)پوری زندگی بن گیا۔''(۱)

مجروح سلطانپوری ایک بے باک غزل گوشاعر تھےاوروہ اپنے مخصوص لب ولہجہ کی وجہ سے ترقی پسند شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔انہوں نے غزلوں ہی میں ترقی پسند خیالات کواپنے نئے انداز کے ساتھ پیش کیا۔

پروفیسر ملک زادہ منظوراحمد کہتے ہیں:

''مجروح سلطانپوری ۱۹۴۵ میں ممبئی چلے گئے اوردوبرس کا ایک عبوری دورگزارنے کے بعدوہ باضابطہ طریقے پر ۱۹۴۷ میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے اوران کی غزلوں میں سیاست کاعمل دخل ہوناشروع ہوگیا۔''(۲)

کسی ۔نے مجاز کے بارے میں کے بارے میں کہ اردوشاعری میں ایک کیٹس (Keats) پیدا ہوا تھا جسے ترقی پسند بھیڑیے اٹھالے گئے ۔یہ بات کہاں تک درست ہے فی الحال زیر بحث نہیں لیکن محروح کے بارے میں پورے اعتماد اوریقن کے ساتھ کہاجس سکتا ہے کہ جگر مرادآبادی کے تغزل اور علی سردار جعفری کے تفکر کا ایک عطر مجموعہ مجروح کی شکل میں سامنے آیا تھا۔وہ فلم انڈسٹری کی مصروفیات

---

(۱) بجیلا غزل گو(مجموعہ غزل)ص ۸ (۲) مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۴

میں کم گوئی کا شکار ہو گیا ہے۔ ایک ایسا ذہن باشعور شاعر جس کا سلسلہ قد و گیسو سے دار و رسن تک رہا ہو، جس نے ''صرف موسم'' ، ''بند بہاراں'' ،رقص ناتمام'' اور شراب خام جیسی نادر اور چونکا دینے والی تراکیب اپنی شاعری میں استعمال کی ہوں اور جو مجموعی طور پر اپنی کم گوئی کے باوجود ترقی پسند تحریک کا سب سے اچھا غزل گو رہا ہو۔ اس کی کم گوئی شعر و ادب کے پرستاروں پر گراں گزر رہی ہے۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے ۷رجنوری ۱۹۵۳ کو یہ لکھا تھا:

''مجروحؔ کی منزل کتنی دور ہے یہ تو میں نہیں کہہ سکتا ہوں، مگر میں بڑی ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ مجروحؔ اپنی کم گوئی کے باوجود ترقی پسند غزل کی سب سے اہم شخصیت ہیں۔''(۱)

پروفیسر علی احمد فاطمی بتاتے ہیں کہ: ''۱۹۴۵ کے آس پاس ممبئی ترقی پسند شاعروں کی آماجگاہ تھا۔

سردار، کیفی، ساحر، منٹو، کرشن، اشک، بیدی سبھی موجود تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کا زور تھا چناچہ اسی سال وہ ترقی پسند تحریک سے تو وابستہ ہوئے ہی باقاعدہ پارٹی کے ممبر بھی ہو گئے۔ ان دونوں وابستگیوں نے مجروحؔ کی ذہنی اور فکری دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ جگر کے چہیتے ہونے کے باوجود ترقی پسندوں میں شامل ہو گئے۔ دوسرے ترقی پسندوں نے دیکھا کہ یہ تو محض غزل گو ہے تو انہیں قبول کرنے میں ہچکچائے۔ اس لئے کہ ترقی پسند فکر غزل کو اپنا موافق نہیں سمجھتی تھی۔ مجروحؔ نے اس کشمکس کو چیلنج کی طرح قبول کیا۔ مجروحؔ غزل میں سیاسی رنگ کے شعر کہنے شروع کیے''۔(۲)

جب اس طرح کے شعر کہے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

(۱،۲) مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۶، ۹

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

تو مجروحؔ کی دھوم مچ گئی اور وہ ترقی پسند تحریک میں ہاتھوں ہاتھ لئے جانے لگے۔ اس کے بعد جب ان کا مجموعہ 'غزل' چھپ کر منظر عام پر آیا تو مجروحؔ ترقی پسند غزل کے ایک بڑے اور مستند غزل گو شاعر بن چکے تھے۔ 'غزل' کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ دوسرا مجموعہ نہ آنے کی وجہ ان کی کم گوئی اور فلمی مصروفیات کہی جاتی رہی اور یہ سچ بھی ہے۔ تاہم ایک عرصہ دراز کے بعد 'مشعل جاں' ۱۹۹۱ میں شائع ہوا۔ اس وقت تک مجروحؔ نہ صرف ترقی پسند غزل بلکہ اردو غزل اور کلاسیکی غزل کے آخری شاعر کی حیثیت سے تاریخ کا روشن باب بن چکے تھے۔

مجروحؔ لکھتے ہیں:

> ''میں ترقی پسندوں میں تو شامل ہوگیا اور ترقی پسندوں کا یہ رویہ رہا کہ یہ غزل گو ہیں۔ غزل زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس وقت ہم جس پلیٹ فارم پر آئے وہاں ہمیں شاعر تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ کیونکہ ہم نے غزل کی صنف اپنائی تھی اور جب غزل شاعری نہیں ہو تو ہم شاعر نہیں۔ چنانچہ مجھے ضد ہوگئی کہ میں کہوں گا۔'' (۱)

مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۱۲

مجروحؔ کی صلاحیت اور انانیت نے یہ کارنامہ انجام دے ڈالا۔ مجروحؔ باقاعدہ مزدوروں اور عوام کی تحریکوں سے جڑے اور جیل بھی گئے۔ نتیجہ اس قسم کے اشعار کا خلق ہونا عین فطری تھا:

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

ستوں دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

ان اشعار کا مطالعہ کیجئے تو ان میں انسانی ہمدردی، زندگی سے وابستگی تو ہے ہی مجروحؔ کی اسلوب ولہجہ میں ایک خاص قسم کا شان اور وقار دکھائی دیتا ہے۔ اس نوع کی شاعری میں جب فکر وفن

اپنے نکتۂ عروج پر پہنچتا ہے تو مجروحؔ کے قلم سے وہ اشعار نکلتے ہیں جس پر صرف مجروحؔ ہی نہیں پوری ترقی پسند شاعری فخر کرتی ہے اور جو صرف ترقی پسند شاعری کا ہی نہیں اردو کی غزلیہ شاعری کا عزیز تین سرمایہ ہے۔ کچھ اس نوع کا بھی شعر ملاحظہ کیجیے:

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشن چراغاں تم سے زیادہ

ہے یہی ایک کاروبار نغمہ و مستی کہ ہم
یاز میں پریاسر افلاک ہیں چھائے ہوئے

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

حادثے اور بھی گذرے تری الفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے اب مری تصویر نہ دیکھ

مجھ سے کہا جبرئیل جنوں نے یہ بھی وحی الٰہی ہے

مذہب تو بس مذہب دل ہے باقی سب گمراہی ہے

ڈاکٹر زیبا محمود کہتی ہیں:

''اردو زبان وادب میں ایسے رجحانات ومیلانات رہے ہیں جن سے شعر وادب کی فعالی اور گرمی رفتار کا پتہ چلتا ہے لیکن تحریکیں صرف دو تھیں، ایک علی گڑھ تحریک اور دوسری ترقی پسند تحریک۔ ان میں منظّم اور مربوط تحریک ترقی پسند تحریک تھی۔ اس تحریک نے جہاں مختلف نثری اصناف سخن کو متاثر کیا وہیں دوسری طرف شاعری کو بھی معراج کمال تک پہنچایا۔ مجروح صاحب ترقی پسند ذہن رکھتے تھے۔ انسان کی عظمت کے شدید احساس کے ساتھ آپ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے۔''

مجروحؔ صاحب نے ترقی پسندی کے ابتدائی دور میں نہایت بے باکی، بہادری اور ثابت قدمی سے ہر وار کا مقابلہ کیا نیز یلغار کو پسپا کیا اور نامناسب حالات میں غزل کی روح کو مجروح ہونے سے بچایا اور اس کو تقویت بخشی: (۱)

ہم قفس صیاد کی رسم زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی انداز کلام آہی گیا

مجروحؔ کی غزلیں بڑی مرصع ہیں ان کی شاعری میں کلاسیکیت اور ترقی پسندی کا حسن امتزاج ملتا ہے۔

مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۲۱

مجروحؔ صاحب کا قول ہے:

''میرے نزدیک شاعری کی پہلی اور آخری شرط یہ ہے کہ سامع وقاری کے خیالات وجذبات کی رفیق ہواس کے بغیر نہ تو اسے قبول عام کی سند مل سکتی ہے اور نہ ہی اسے معتبر کہا جاسکتا ہے جس نے صنف غزل کو اپنے لئے اس لحاظ سے اس لئے بہتر جانا کہ اس کا ایک کامیاب شعر اختصار ودلنشینی کے باعث ابلاغ وترسیل کی سہولتیں زیادہ رکھتا ہے۔''(۱)

''اگر شاہجہاں نے ممتاز کی محبت سے سرشار ہوکر اور اس کی ناگہانی موت سے رنجیدہ ہوکر حسین تاج محل بنوایا اور ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی تو مجروحؔ سلطانپوری نے آزاد، حالی، اور کلیم الدین احمد کے بعد ترقی پسندوں کے درمیان معتوب ہوچکی، بستر مرگ پر کراہتی غزل کو اپنے کلاسیکی ادب کے گہرے مطالعے اور جگر، رشید احمد صدیقی اور علی سردار جعفری کی صحبت اور قربتوں سے اپنے خیالات کے سنگ مرمر تراشے اور اس کے ذریعے کم گوئی کے باوجود غزل کو ممتاز کیا، اس کے حسن کا لوہا منوایا اور ترقی پسند تحریک کو غزل کا بہترین تاج محل عطا کیا۔'' (دانش الہٰ بادی)(۲)

(۱) مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۲۹ (۲) مدیر ''سبق اردو'' بھدوہی

مجروحؔ سلطانپوری نے کہا اور خوب کہا ۔ زندگی کے رموز ونکات ،فکر وفلسفہ، تضاد وتصام سے متعلق اردو شاعری کا دامن ہمیشہ وسیع رہا ہے۔ زنجیر، گریباں، مقتل، شورش دوراں، آتش زیر پا وغیرہ کا ذکر تو اردو شاعری میں ہوتا ہی آیا ہے۔ لیکن راست طور پر عہد حاضر کی سیاست اور سیاسی گرم بازاری۔ تحریک اور آندولن وغیرہ کا ذکر غزلیہ انداز میں کہہ پانا مشکل کام تھا۔ لیکن مجروحؔ کی صلاحیت اور انانیت نے یہ کارنامہ انجام دے ڈالا۔ مجروحؔ با قاعدہ مزدوروں اور عوام کی تحریکوں سے جڑے اور جیل بھی گئے نتیجہ اس قسم کے اشعار کا خلق ہونا عین فطری تھا۔

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ

جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

سوئے مقتل کہ پئے سیر چمن جاتے
اہل دل جام بکف سر بہ کفن جاتے ہیں

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

وہ ترقی پسند شاعروں کے اس گروہ میں شامل ہیں جو قدیم استعارہ، قدیم زبان اور کلاسیکل اظہار کو کافی سمجھتا ہے کہ یہی زبان قابل اعتماد اور مؤثر ہے اور روایت سے گندھا ہوا ہونے کی وجہ سے آزمودہ بھی۔ حالانکہ ترقی پسندوں کا ایک گروپ اس سے اختلاف رکھتا تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ قدیم شعری استعارہ نئے اظہار کے لئے ناکافی ہے۔

اور اب جدید استعارہ کا تراشنا از حد ضروری ہے۔ مجروح اکثر اپنے قبیل کے ایسے شاعروں کی لعن طعن کرتے اور احمد فراز، قتیل شفائی، ندا فاضلی وغیرہ سے اسی لئے اکثر ناراض رہتے تھے کہ ان کو شاعری کی زبان نہیں آتی۔

شمس الرحمٰن فاروقی سے بھی وہ اسی لئے ناراض رہتے تھے کہ ان کی امت زبان بگاڑ رہی ہے جس کے جواب میں فاروقی صاحب کا یہ کہنا ہے کہ جو غلط زبان لکھے وہ میری امت میں نہیں ہے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب سے سوال وجواب (۱):

ایک بار ہم نے سوال کیا کہ مجروحؔ صاحب آپ تو اپنی غزلوں کے ذریعہ تحریک میں شامل

تین ترقی پسند شاعر مصنف پروفیسر علی احمد فاطمی ص ۸۳

ہوئے اس وقت تحریک میں نظم گوئی کا زور وشور تھا تو پھر آپ کو اور آپ کی کس طرح لیا گیا۔تو جواب ملا: ''شروع میں ضرور دقت ہوئی۔۔۔یہ ۴۹ء کے آس پاس کی بات ہے کہ جب میں بمبئی پہنچا ہوں ہم سے کچھ سینئر شعرا میں سے اکثر کے دیوان شائع ہو چکے تھے۔فیض کا نقش فریادی وغیرہ چھپ کر مقبول عام ہو چکے تھے۔میں غزل کا شاعر تھا اور اس وقت زور تھا نظموں کا شاید اسی لئے میرے استقبال میں گرم جوشی نہ تھی لیکن اسی عہد میں جو کشاکش تھی جو رستخیز تھی اور شعرا جس طرح کمندیں پھینک رہے تھے وہ سب مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بڑا رومان پرور سا لگا چنانچہ میں نے وہی بات جو لوگ نظموں میں کہہ رہے تھے اپنی غزلوں میں کہنی شروع کیں۔ ہماری اصناف ضرور الگ الگ تھیں لیکن جذبات و کیفیات الگ الگ تھوڑی تھے۔لہٰذا ہماری غزلوں میں بھی ایک خاص رنگ سے ترقی پسند موضوعات آنے لگے اور ہم پسند کئے جانے لگے،لیکن یہ پسندیدگی ہمارے لئے چیلنج کا کام کرتی گئی اور میں اس چیلنج کو قبول کرتا گیا اور رفتہ رفتہ مجھے خود محسوس ہونے لگا کی میں اپنی اصل آواز کو دریافت کر رہا ہوں یا یوں کہئے کہ میں نے اپنی ایک راہ بنالی ہے، ہمارے ہم عصر پیش رو نہ صرف ہماری طرف متوجہ ہو رہے ہیں بلکہ ہم سے متاثر بھی ہو رہے ہیں.........''

''متاثر او ہ کیسے.........؟''

''جی متاثر بھی ہوئے....ایک واقعہ سنیئے۔ایک مرتبہ سردارؔ جعفری نے ایک مصرعہ پڑھا:

''دگرگوں ہے جہان تاروں کی گردش تیز ہے ساقی''

اور مجھ سے پوچھا کہ کیسا مصرعہ ہے۔میں نے کہا کہ زوردار مصرعہ اس کے بعد انھوں نے دوسرا مصرعہ پڑھا: ''دل ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی'' میں نے صاف کہہ دیا کہ دوسرا مصرعہ پہلے کے مقابلے میں کم تر درجے کا ہے۔سردارؔ نے اعتراف کیا لیکن ساتھ بولے دراصل یہ تمہاری غزل کی لعنت ہے غزل کی یہی مصیبت ہوتی ہے کہ بات ہزار پہلے مصرعہ میں مکمل ہو جائے لیکن دوسرا مصرعہ کہنا

ضروری ہے۔اسی دن میں نے سردارؔ سے غزلگوئی کے معاملات کو لے کر بہت بہت باتیں کیں بلکہ بحثیں کیں لیکن سردارؔ کا بڑکپن تھا کہ وہ میری بہت سی باتوں کو مان لیتے تھے لیکن یہ بھی ہے کہ انھیں دلیلوں سے منوانا بھی آتا تھا۔خیر سردارؔ کا معاملہ تو ہم لوگوں سے بہت مختلف تھا۔''

ہم جب جلسہ گاہ پہونچے تو اچھے خاصے لوگ جمع تھے۔اسٹیج پر سردارؔ جعفری۔مجروحؔ سلطانپوری، کالی داس گپتا رضا، ندا فاضلی، قتیل شفائی وغیرہ موجود تھے۔ہم لوگ نیچے فرش پر بیٹھ گئے۔جلسہ شروع ہوااور درمیان میں مجروحؔ کی نظر مجھ پر پڑی، وہ اسٹیج پھلانگتے ہوئے مائک پر آئے اور مداخلت کے لئے معذرت کرتے ہوئے بولے۔

''حضرات ہمیں بے حد خوشی ہے کہ آج اس محفل میں ایک ایسا نوجوان آیا ہوا ہے جس پر ہم لوگ ناز کرتے ہیں وہ اردو کا سپاہی تو ہے ہی ہماری انجمن کا بھی سپاہی ہے۔شمالی ہند میں اور بالخصوص اتر پردیش میں اردو کی کسی تقریب کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں۔وہ اردو کا استاد ہے ادیب و ناقد بھی اور الہ آباد یونیورسٹی میں پرفیسر بھی۔میری مراد پروفیسر علی احمد فاطمی سے ہے۔منتظمین سے بھی بھول ہوگئی اسے اسٹیج پر ہونا چاہئے بہرحال میں اسے دعوت دیتا ہوں کہ وہ اسٹیج پر آئے اور آپ تالیوں سے اس کا خیر مقدم کریں........''

مجروحؔ سلطانپوری کے یہ جملے۔پھر تالیاں اور ان تالیوں میں سردارؔ جعفری۔یوسف ناظم اور ندؔا فاضلی کی بھی تالیاں۔میرے پیر من من بھر ہوگئے۔مجروحؔ سلطانپوری کے اس غیر متوقع حملے سے میں لہولہان ہو گیا۔تھوڑی دیر تک سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ کس کے لئے کہا جا رہا ہے۔مجھے یقین ہی نہ آیا کہ یہ سب میرے لئے تھا۔عجیب سی نا قابل یقین سی حالت میں میں اسٹیج پر بٹھیا رہا۔تقریب چلتی رہی، پھر مجھے بولنے کو بھی کہا گیا۔تقریر کرنا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے لیکن اس دن میں ٹھیک سے بول نہ سکا۔مجروحؔ سلطانپوری کے جملے۔سردارؔ کی موجودگی۔عروس البلاد کا جلسہ، دوستوں کی شرکت یہ سب کچھ پہلی

بارہوا تھا اس لئے عجیب سا تھا۔ یہ سب کچھ عجیب وغریب میری اپنی ذات سے متعلق ہرگز نہ تھا۔ مجھے اپنی حیثیت کا اندازہ ہے اور شاید یہی میرے اندر اکلوتی خوبی ہے کہ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں ہے۔ دراصل یہ سارا جادو مجروحؔ کی شخصیت کا تھا جس میں ان کی انجمن سے وابستگی، خوردنوازی تو تھی ہی لیکن اس سے زیادہ ان کی شخصیت کی پاکیزگی۔ سادگی اور بے باکی دخل ہے۔

میں نے ایک بار لکھنؤ میں انجمن کی کانفرنس میں بعض بزرگوں سے جن میں مجروحؔ سلطانپوری بھی شامل تھے شدید اختلاف کیا شاید زبان کا ہی مسئلہ تھا۔ مائک پر اپنے تئیں زوردار تقریر کرڈالی۔ جب اسٹیج سے نیچے اترا تو مجروحؔ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے اپنے پاس بلایا اور پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''جب تم جیسے جوشیلے لوگ انجمن میں ہیں یہ انجمن مرنہیں سکتی۔'' ذرا سوچئے کہ ایسا نوجوان کہ جس کی کوئی حیثیت نہیں، کوئی شناخت نہیں۔ مجروحؔ کے یہ جملے کیا معنی رکھتے ہیں۔ اور لوگ بھی وہاں تھے لیکن ایسا کسی نے نہیں کیا۔ یہ کام مجروحؔ جیسی صاف ستھری شخصیت ہی کرسکتی ہے۔ جس کے پاس کوئی مصلحت نہیں۔ جو لوگ ادب کو۔ انجمن کو تحریک کو صدیوں اور نسلوں کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں انھیں ہی نئی نسل کی فکر ہوتی ہے اور وہ اپنے ہر علم وعمل سے اسے پروان چڑھانے کا دم خم رکھتے ہیں۔ جو ظرف نقادوں میں نہیں ہوا کرتے۔

میں نے ایک بار ان سے عرض کیا کہ آپ کا کارنامہ تو ہے کہ کلاسیکی زبان اور قدیم اصطلاحات میں نئے معنی جذب وپیوست کئے وہ معنوی نظام دیا جس کا تعلق براہ راست عصری سیاست اور آج کے کھردرے سماج سے ہے۔ آپ یہ بڑا کام کرگئے اس کے لئے آپ کی پذیرائی بھی ہوئی لیکن یہ بھی توہو تا ہے کہ لسانی نظام۔ استعارے محاورے تخلیقی سطح پر وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ جیسے تزکیر و تانیث کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں اگر آپ ترقی پسند ہیں تو اس تبدیلی کو قبول کرنا ہی ہوگا۔ یہ سوال تو پہلی بار ان کے سامنے نہ آیا ہوگا لیکن پھر بھی انھوں نے غور کیا اور پوری سنجیدگی سے فرمایا...

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں کچھ تبدیلی تو فطری طور پر ہوتی ہے کچھ فیشن میں اور کچھ مخالفت میں اور کچھ ضد میں۔ میں فیشن اور ضد کے خلاف ہوں چونکہ یہ مہاورے اور اصلاحیں ترقی پسندوں نے استعمال کئے ہیں لہذا ہم اس میں توڑ پھوڑ کریں گے اور نئی نئی بات کریں گے خواہ وہ کتنا ہی غیر تخلیقی شاعرانہ ہو جدیدیوں نے یہی تو کیا... خیر وہ اپنے انجام کو پہنچے۔ دیکھئے شعر کہنا الگ بات ہے لیکن شعری مزاج میں ڈھل جانا، غیر فصیح خیال اور اس سے زیادہ غیر فصیح الفاظ میں شعریت و نغمگی پیدا کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ ہم ترقی پسندوں نے کیا فیض اس کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ وہ مزاجاً نرم اور مدھم لہجے کے انسان تھے میں تو تیز دماغ مشہور ہوں لیکن میں نے بھی کوشش کی، شاعری میں صرف لفظ کا انتخاب ہی اہم نہیں ہوتا بلکہ اس کا انتہائی مناسب اور تخلیقی استعمال بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میر کا ڈھلا ہو مصرع دیکھئے۔

دل ہوا چراغ مفلس کا

اب اس میں ایک لفظ بھی ہٹا دیجئے پورا مصرع غارت ہو جائے گا۔ میرا اعتراض نئے لوگوں سے ہے کہ وہ لفظ کے دروبست سے واقف نہیں ہیں اور ہونا بھی نہیں چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری فکری اعتبار سے جو بھی ہو لیکن اسلوب و آہنگ کے اعتبار سے ناقص ہے۔''(۱)

مجروح سلطانپوری خالص ترقی پسند شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل کی پر وقار روایت کو نہ صرف زندہ رکھنے میں مدد کی بلکہ غزل میں استعمال ہونے والوں لفظوں کو نئی معنویت بھی عطا کیا۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ غزل ترقی پسندوں کے درمیان مرگئی ہوتی اگر مجروح اسے سینے سے نہ لگاتے۔

---

(۱) تین ترقی پسند شاعر مصنف پروفیسر علی احمد فاطمی ص ۸۳

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس انتشاری ماحول میں مجروحؔ نے اپنے ترقی پسند فکر و احساس کو خاصی تقویت پہنچائی اور یہ احساس ان کی مزاجی و طبعی فکر میں ایسا ڈھلا کہ شراب دو آتشہ کا کام کر گیا اور ان کے ترقی پسند کردار میں خاصا کھرا پن آ گیا اور ایسے اشعار ہونے لگے:

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

لیکن انھیں دنوں مجروحؔ نے پنڈت نہرو کے سوشلزم پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ انھیں ان کے سوشلزم میں مشترقیت کم اور ڑھی ہوئی مغربیت زیادہ نظر آئی۔ ان کا خیال تھا کہ ہر ملک کی اشتراکیت کو اسی ملک کی ا ضیت اور ثقافت سے پھوٹنا چاہئے۔ نہرو ایسا نہیں سوچ پا رہے تھے وہ جلد از جلد ہندوستان میں سوشلزم کی روشنی پھیلا کر اندھیرے کو دور کرنا چاہ رہے تھے خواہ وہ روشنی مانگے کی ہی کیوں نہ ہو، ترقی پسندوں کو نہرو کا یہ انداز پسند نہ آیا چناں چہ انھوں نے اس سے اختلاف کیا۔ مجروح نے ایک جوشیلی نظم کہی جس کا عنوان تھا ''مارلے ساتھی جانے نہ پائے۔'' جس کا ایک شعر یوں تھا:

کامن ویلتھ کا داس ہے نہرو اور تباہی لانے نہ پائے
یہ بھی ہے ہٹلر کا چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

ہر چند کہ یہ نظم مجروحؔ کے شاعرانہ مزاج کے خلاف تھی لیکن بہر حال اس نے اپنا اثر دکھایا اور جو

سیدھے نہرو کے سینے میں کانٹے کی طرح گڑ گئی۔اس زمانے میں مرار جی دیسائی مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ تھے،نہرو کے اشارے پر انھوں نے مجروحؔ کے نام کا وارنٹ جاری کیا اور مجروح کو انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا ۔عین اسی زمانے میں سجاد ظہیر راول پنڈی کیس کے تحت جیل میں بند تھے ان کی حمایت میں ایک جلسہ اور مشاعرہ ممبئی میں منعقد ہوا۔جلسہ اور مشاعرے کی اطلاع پا کر مجروح سے رہا نہ گیا اور وہ بلا خوف وخطر اس میں شریک ہونے نہ صرف پہنچ گئے بلکہ پوری جوش وخروش سے غزلیں ونظمیں سنائیں چنانچہ انھیں گرفتار کر لیا گیا بعد میں یہ بھی کہا گیا کہ معافی مانگ لو تو سزا بخش دی جائے گی لیکن مجروحؔ کی بے باک شخصیت اور ترقی پسند کردار نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا اور مجروحؔ ایک سال کے لئے ممبئی کے بایکلہ جیل میں بند رہے۔یہ بندش قید با مشقت تھی۔اس بندش نے جہاں مجروحؔ کے نظریاتی کردار اور ترقی پسند شاعر کو اور مضبوط کیا فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے نقصان پہنچایا کیوں کہ فلم کی دنیا کا بازار تو کچھ دوسرے ہی ڈھنگ کا ہوتا ہے۔

مجروحؔ سلطان پوری ترقی پسند شاعروں میں مقام رکھتے ہیں۔ان کی شاعری کا سرمایا قلیل ہے پھر بھی وہ یکسر رد نہیں ہوئے بلکہ اردو غزل گوئی کی بعض روایتوں کے امین بن کر ابھرے ہیں۔یوں بھی ہوا کہ ترقی پسندوں کے تقاضوں کے پیش نظر ان کے کلام میں بھی کچھ گھن گرج کی کیفیت ملتی ہے لیکن وہ دال میں نمک کے برابر ہے۔

مجروحؔ ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔یوں تو ان کی غزلوں میں وہ شدت نہیں جو عام طور سے ترقی پسندوں کے یہاں ملتی ہے پھر بھی اس کا اظہار بار بار کیا جاتا ہے۔ان کی شاعری کی عقبی زمین ترقی پسند تحریک سے نہ صرف متاثر رہی ہے بلکہ ذہنی طور پر ہمیشہ اس سے قریب رہے ہیں۔

ہم سبھوں کو معلوم ہے کہ ترقی پسند تحریک جنگ آزادی کا بھی ایک حصہ تھی۔اور وہ ایک عام بیداری کا زمانہ تھا جب ہندوستان آزادی کی جدوجہد میں کئی قدم آگے بڑھا چکا تھا، ہمارے اہم رہنما

کھل کر سامنے آ چکے تھے اور ۲۲۔۱۹۲۱ تک آزادی کی جدو جہد ایک خاص کروٹ لینے کی طرف مائل تھی۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے ان کا خیال تھا کہ ادیبوں کو وطن کی آزادی کی جدو جہد میں حصہ لینا چاہئے اور عوام کی حالت کو سدھارنے کی تحریکوں سے وابستہ ہونا چاہئے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ادیبوں کو بھی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ حتی المقدور اپنی صلاحیتوں کے مطابق آزادی کے حصول میں معاون ثابت ہوتے رہیں۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ یہ لازمی نہیں کہ ادیب سیاسی کارکن بھی ہو لیکن سیاست سے اس کا تعلق بہر حال ہونا چاہئے۔ سجاد ظہیر اس بات پر زور دیتے رہے تھے کہ وہ دانستہ ترقی پسند ادبی تحریک کا رشتہ ملک کی آزادی اور جمہوریت سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ ترقی پسند دانشور، مزدور، کسان، غریب اور مظلوم عوام سے ملتے رہیں، ان کے جلسے جلوس میں بھی جائیں، انہیں اپنے جلسوں میں بھی بلائیں۔ چنانچہ دس اپریل ۱۹۳۶ کو ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں پریم چند کے علاوہ مولانا حسرت موہانی، جے پرکاش نارائن، یوسف مہرعلی، کملادیوی چٹوپادھیائے، میاں افتخارالدین، اندولال یاجنگ اور جیتندر کمار جیسے نام شامل ہیں۔ اس میں ایک منشور بھی پیش ہوا، جسے تیار کرنے والوں میں ڈاکٹر عبدالعلیم، سجاد ظہیر اور محمود الظفر تھے۔ ایک اعلان نامہ بھی مرتب کیا گیا جس میں چار نکات تھے:

(۱) ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشورتی جلسے منعقد کر کے اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

(۲) ترقی پزیر مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدو جہد کر کے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

(۳) ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا۔

(۴) آزادئ رائے اور آزادئ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔

کانفرنس کے صدر پریم چند نے جو خطبہ دیا تھا وہ بھی ادب کا رخ موڑنے کے لئے کافی تھا۔اس خطبے کی اہمیت آج بھی محسوس کی جاتی ہے۔جگہ جگہ سے دو چار اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

''حضرات! یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ ہمارے سمیلنوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے ۔ یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود ہے اس کا منشا خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا۔ وہ بھی نہایت اہم کام تھا۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کر لے اس میں خیالات و جذبار ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے ۔ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کر کے قوم پر جو احسان کیا ہے ، اس کے لئے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی لیکن زبان ذریعہ ہے ، منزل نہیں ۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کر لی ہے کہ ہم زبان سے گزر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہو۔ وہی زبان جس میں ابتداً باغ و بہار بے تال کی پچیسی کی تصنیف ہی معراج کمال تھی ، اب اس قابل ہوگئی

ہے کہ علم وحکمت کے مسائل بھی ادا کرے اور یہ جلسہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے.سوال یہ ہے کہ حسن کیا شئے ہے؟ بظاہر یہ ایک مہمل سا سوال معلوم ہوتا ہے کیوں کہ حسن کے متعلق ہمیں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے ۔ ہم نے آفتاب کا طلوع وغروب دیکھا ہے، شفق کی سرخی دیکھی ہے، خوشنما اور خوشبو دار پھول دیکھے ہیں، خوشنوا چڑیاں دیکھی ہین، نغمہ خواں ندیاں دیکھی ہیں، ناچتے ہوئے آبشار دیکھے ہیں۔ ان نظاروں میں ہماری روح کیوں کھل اٹھتی ہے؟ اس لئے کہ ان میں رنگ یا آواز کی ہم آہنگی ہے، سازوں کی ہم آہنگی ہے، سنگیت ودلکشی کا باعث ہے۔ ہماری ترکیب ہی عناصر کے توازن سے ہوتی ہے اور ہماری روح ہمیشہ اسی توازن اور ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے ۔ ادب آرٹس کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے ۔ ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا ۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اوعیش پروانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا ۔ انھیں کی قدر دانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور رانھیں کی خوشیوں اور رنجوں ، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح وتفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی

طرف اٹھتی تھیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے
قابل نہ تھے۔ انہیں وہ انسانیت کے دائرے سے خارج
سمجھتا تھا۔ اگر کبھی وہ ان کا ذکر کرتا بھی تھا تو مضحکہ اڑانے
کے لئے۔ اس کی دہقانی وضع اور معاشرت پر چلنے کے لئے
اس کا شین قاف درست ہونا یا محاوروں کا غلط
استعمالظرافت کا ازلی سامان تھا۔ وہ بھی انسان ہے، اس
میں آرزوئیں ہیں، یہ آرٹسٹ کے ذہن سے بعید تھا...اس
کی نگاہ ابھی اتنی وسیع نہیں ہوئی کہ وہ کشمکش حیات میں حسن
کی معراج دیکھے۔ فاقہ اور عریانی میں بھی حسن کا وجود ہو
سکتا ہے، اسے وہ شاید تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے لئے حسن
حسین عورت میں ہے غریب بے حسن عورت میں نہیں جو
بچے کو کھیت کی میڈ پر سلائے پسینا بہا رہی ہے...ہماری
انجمن نے کچھ اس طرح کے وصولوں کے ساتھ میدان عمل
میں قدم رکھا ہے وہ ادب کو خمریات اور شبابیات کا دست نگر
نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ ادب کو سعی اور عمل کا پیغام اور ترانہ
بنانے کی مدعی ہے۔ اسے زبان سے بحث نہیں...ترقی پسند
مصنفین کا عنوان میرے خیال میں ناقص ہے۔ ادب
یا آرٹسٹ طبعاً اور جلقاً ترقی پسند ہوتا ہے اگر یہ اس کی
فطرت نہ ہوتی تو شاید یہ ادیب نہ ہوتا وہ آئیڈیلسٹ

ہوتا ہے۔اسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور باہر بھی۔
اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اس کی روح بے قرار رہتی ہے
.....بہرحال! جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا، محض
لوریاں گا گا کر سلانا، محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا اس وقت تک
ادب کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی ۔ وہ دیوانہ تھا جس کا غم
دوسرے کھاتے تھے ۔مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیزیں
نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر
ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کو جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی
حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیوں کہ اور زیادہ سونا موت کی علامت
ہوگی۔"(۱)

اس کے بعد حسرت موہانی نے ایک موثر تقریر کی اور اشتراکیت کی حمایت میں تھی عام طور سے اس تحریک کا خیر مقدم کیا گیا۔ الہ آباد میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس ۱۹۳۷ میں ہوئی جس میں عبدالحق نے خطبہ دیا۔ الہ آباد میں ہی دوسری کانفرنس ہوئی جس میں جواہر لال نہرو کی تقریر ہوئی، ٹیگور کا پیغام سامنے آیا، دلی اور ہری پور میں اجلاس ہوئے۔ پھر باضابطہ دوسری کل ہند کانفرنس ۱۹۳۸ میں کلکتے میں ہوئی جس میں ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت کے پہلو زیر بحث آئے اس کے ساتھ ساتھ لکھنؤ سے ۱۹۳۹ میں "نیا ادب" کا اجرا ہوا جس کی ادارت میں سبط حسن، علی سردار جعفری اور مجاز تھے ۔ اس

---
(۱) "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک"، خلیل الرحمن اعظمی، (پریم چند کی صدارتی تقریر)

میں ادیبوں کو یہ روشنی کی گئی:

''ہمارے نزدیک ترقی پسند وہ ہے جو زندگی کی حقیقت پر نظر رکھے، ان کا پرتو ہو، ان کی چھان بین کرتا ہو اور ایک نئی اور بہتر زندگی کا راہبر ہو لیکن وہ صرف زندگی کی ہلچل اور ہیجان کا ہی نقیب اور نبض شناس نہیں ہوتا۔ وہ صرف سطح پر کروٹیں لینی والی موجوں کی ہی ساتھ نہیں بہتا بلکہ زندگی کی گہرائیوں میں جا کر ان خاموش اور میٹھ دھاروں سے سیراب ہوتا ہے جو سطح سے نیچے بہتے رہتے ہیں۔''(۱)

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں اکبر، جوش، جگر اور فانی کے کلام بھی شائع ہوئے اور دوسرے شمارے میں عصمت چغتائی کا افسانہ ''گیندا'' سامنے آیا۔ کچھ دنوں کے بعد جوش ملیح آبادی نے اپنا رسالہ ''کلیم''، جو دہلی سے نکلتا تھا، بند کر دیا اور وہ بھی ''نیا ادب'' کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ اسی زمانے میں ترقی پسند شاعر مجاز نے اخبارات میں بیان شائع کرایا اور اس موضوع پر ایک نظم ''آہنگ نو''، لکھی۔ ۱۹۴۳۔۱۹۴۴ میں جب بنگال میں قحط پڑا تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا اور ادیب اس سے بہت متاثر ہوئے اور ایک خاص انداز کی شاعری اور افسانے قلمبند کئے، جو آج بھی مشہور ہیں مثلاً کرشن چندر کا ''ان داتا'' اخترالایمان کی نظم ''ایک سوال'' وامق جونپوری کا گیت ''بھوکا ہے بنگال'' وغیرہ۔ اس طرح مسلسل کانفرنسیں اور ادبا کی تحریک زور پکڑتی رہی یہاں تک کہ بھیمڑی کانفرنس میں ترقی پسند مصنفین کا نیا منشور سامنے آیا۔ اس میں یہ جملے تھے:

(۱) ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''، خلیل الرحمٰن اعظمی

''کوئی ادب اس وقت عظیم نہیں ہوسکتا اور عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کراسکتا جب تک اس کا ایک اعلیٰ سماجی مقصد نہ ہو۔ ترقی پسند ادب عظیم انسانی آدارشوں سے کسب نور کرے گا جیسے امن، محبت، قوموں مین دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی خواہش، انسان دوستی جو جنگ اور انسانی لوٹ کھسوٹ کی مخالفت کرتی ہے۔ ادب کا یہ عظیم اخلاقی مقصد مطالبہ کرتا ہے کہ تمام ادیب اپنی تحریروں میں سنجیدگی اختیار کریں، ان میں تاثر پیدا کریں، انھیں مقبول اور خوبصورت بنائیں تا کہ ہماری جنتا ان سے محبت کر سکے، ان سے جوش حاصل کر سکے اور ان پر فخر کر سکے۔ عوامی ادب اور کلچر کا مستقبل ترقی پسند ادیبوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ثابت کرنا ان کا فرض ہے کہ مستقبل معتبر ہاتھوں میں ہے۔''(۱)

۱۹۵۳ میں ایک کانفرنس ہوئی، جس میں اس منشور پر نظر ثانی کی گئی لیکن اب تک تحریک میں انتشار و اختلال پیدا ہو چکا تھا اور ترقی پسند روش سے بدگمانی کا آغاز ہو چکا تھا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے مطابق:

''۱۹۵۳ کی کانفرنس کے بعد ترقی پسند تحریک انتشار و اختلال سے نکلی تو تنظیمی تعطل میں مبتلا ہوگئی۔ انتشار کے دور میں انتہا پسند ادیبوں نے جس ذہنیت کا مظاہرہ کیا تھا اس کی

(۱) بحوالہ ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''، خلیل الرحمٰن اعظمی

بنا پر بہت سے ادیب ان سے بدظن ہو گئے تھے۔ اور یہ
بدگمانی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان پر اعتماد باقی نہ رہا۔ انجمن
کے نئے سکریٹری کرشن چندر نے تنظیم میں کوئی دلچسپی
نہیں لی اور اس دور میں تیزی سے سنسنی خیز ناول اور
افسانے لکھ کر مشہور فلمی رسالہ ''شمع'' میں چھپوانے لگے
تھے اور ان کی حیثیت آہستہ آہستہ ایک تجارتی ادیب کی
سی ہوتی جا رہی تھی۔ ''دست صبا'' کی مقبولیت کے بعد
آپ شاہراہ گروپ کے شعرا بین الاقوامی اور عالمی
مسائل کی نظمیں چھوڑ کر غزل گوئی کی طرف لوٹ آئے
۔ ترقی پسند کے رہنماؤں نے اب ''سرخ سویرا'' اور
''نیلا پرچم'' کا کیا ذکر جو اپنے تھے وہ بھی کیڑے نکالنے
لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ہر شہر میں تنظیمیں ختم
ہونے لگیں اور مختلف رجحان کے ادیبوں نے اپنی علاحدہ
علاحدہ ٹولیاں بنالیں۔'' (۱)

ساتھ ساتھ سجاد ظہیر کا یہ بیان غور طلب ہے جو اس نظریاتی اختلاف کے سلسلے میں بہت کچھ روشنی
دیتا ہے:

(۱) ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''، خلیل الرحمن اعظمی

''پہلے میری رائے یہ تھی کہ انجمن کو دوبارہ منظم کرنا چاہئے۔ مرکز اور شاخوں میں ربط پیدا کر کے اسے باعمل بنانا چاہئے مگر میں اس رائے پر قائم نہیں ہوں اس کو بدلنے کے لئے تیار ہوں۔ اس وقت ہمارے سامنے ایسے مسائل ہیں جو نظریاتی اختلافات کے باوجود سب کے لئے ایک ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ سیاسی پارٹی اور ادیبوں کے اختلافات کے باوجود ہم سب کے سامنے نئے ہندوستان کی تعمیر و ترقی کا مسئلہ ہے۔ ہمیں اپنے وطن کی تہذیب اور ادب کی تعمیر کرنا چاہے۔ نئے انسان کی شخصیت کی تعمیر میں جو رکاوٹیں حائل ہوں ان کو دور کرنے کے لئے مل کر جدوجہد کرنا چاہئے۔ آج ہندوستان کی نئی تعمیر جمہوریت اور اشتراکیت کی بنیادوں پر ہو رہی ہے جس پر عظیم اکثریت کو اتفاق ہے۔ اس نظام کو قائم کرنے کے لئے سارا ہندوستان کوشاں ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی بنیاد یہ تھی کہ ہم آزادی حاصل کریں اور انگریز سامراج کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی جدوجہد میں ادبی جنگ کریں۔ آج ہمارے پاس متحد ہونے کے لئے دوسری بنیاد اتحاد موجود ہے۔ ان بنیادوں پر آج تمام لکھنے والوں کو متحد کیا جا سکتا ہے۔ ہماری تنظیم کوئی سیاسی تنظیم نہیں ہوگی۔ ہمارا مقصد ادب کے ذریعہ اپنے

خیالات کی ترویج ہے۔ادیبوں میں خیالات کے اعتبار
سے اختلاف ہوسکتا ہے اور ضروری ہیاور یہ اختلاف ایک
تنظیم کے اندر رہ کر بھی پیدا ہوسکتے ہیں اور ان میں کوئی
مضائقہ نہیں بشرطیکہ ان کا اظہار جمہوری طریقے سے
ہو۔ہم کو اپنے اختلافات کم کرنے ہیں اور مشترکہ باتوں کو
لے کر آگے بڑھنا ہے۔"(۱)

یہی وہ پس منظر ہے جس میں مجروحؔ سلطان پوری کا ذہن مرتب ہے۔لیکن یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ ترقی پسندی سے سوفی صدی ذہنی ہم آہنگی کے باوجود شاعرانہ لحاظ سے وہ اپنی اکثر غزلوں میں ایک ایسی احتیات کا پہلو سامنے رکھتے ہیں جو بعد میں ان کی شاعرانہ عظمت کا باعث ہوئی۔سوال یہ ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے وہ ایک طرف تو ترقی پسندی کے ساتھ ہیں اور دوسری طرف بہت حد تک اس کی بداحتیاطیوں سے الگ تھلگ ہیں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر اس بات کے ساتھ ہیں جہاں مساوات، بھائی چارگی، امن، صلح جوئی وغیرہ ایسے عناصر ہیں جو انسانیت کی عظمت کے نشانات کہے جا سکتے ہیں۔چنانچہ ایک طرف تو وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے علمبردار نظر آتے ہیں تو دوسری طرف فن کو ایک خاص سطح پر رکھنا چاہتے ہیں یعنی فن اگر عوام کے لئے ہو تو بھی اسے جمالیاتی سطح پر بلند ہونا چاہئے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان کے کلام کا معتد بہ حصہ ایسی ہی فکر کا نتیجہ ہے ورنہ ان کے کلام میں وہ روایتی سج دھج نہ ہوتی، وہ کلاسیکی انداز نہ ہوتا، وہ شاعرانہ اوصاف نہ ہوتے جو انہیں بہ

(۱)"اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک"، خلیل الرحمٰن اعظمی

حیثیت شاعر ایک خاص مقام دیتے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ مجروحؔ کی شاعری جہاں ان کی ترقی پسندی کے سبب پست ہوئی اس کی نشاندہی کی جائے، ساتھ ساتھ ایسی وابستگی کے باوجود اہمیت کی حامل ہے اس پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ان پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے اگلے صفحات استعمال کئے جائیں گے۔

مجروحؔ ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے لیکن ترقی پسندی جس طرح شاعری کے ساتھ عمومی لحاظ سے برتاؤ کرنا چاہتی ہے اس سے بہت حد تک وہ دور رہے۔پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اور غزل کا اپنا ایک مزاج تھا، اس کے مزاج میں غایت درجہ کی نازکی کا احساس ہوتا ہے۔فارسی شاعری اور اردو کی کلاسیکی شاعری کے مطالعے نے مجروحؔ پر یہ عیاں کر دیا تھا کہ غزل کی نزاکت ونفاست شوروغوغا میں قائم نہیں رہ سکتی۔لہٰذا وہ عام ہمدردی کے شاعر ہونے کے باوجود اور انسانیت کا پرچم لہرانے کے باوجود، مزدوروں، کسانوں کو اپنے گیت سنانے کے باوجود بہت حد تک غزل کو نعرہ بازی سے بچانے کی سعی کرتے رہے اور جہاں کہیں وہ غوغائی مرحلے سے گزرے وہ ترقی پسندی کی لے تیز کرنے کے سلسلے میں شاید ایک کوشش رہی تھی۔یہ کوشش وقعتاً مستحسن نہیں تھی۔چند مثالیں ایسی دی جاسکتی ہیں جہاں وہ اپنے منصب سے گرے ہیں۔کچھ اشعار:

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی
گنبدوں سے پلٹی ہے اپنی ہی صدا مجروح
مسجدوں میں کی میں نے جا کے داد خواہی بھی

شعائر کے استعمال میں کئی جگہ وہ فیض سے قریب آ گئے ہیں۔ الیکن ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے شعری
کیفیات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ فیض کا نمایاں رنگ تو ملتا ہے مگر اس میں ان کی انفرادیت کم
نہیں ہوئی۔ شعر ملاحظہ ہو ۔

حادثے اور بھی گزرے تری الفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے اب مری تصویر نہ دیکھ

فیضؔ کے شعر کی یاد دلاتا ہے لیکن یہاں ہاں مجھے دیکھ مجھے میں ایک کیف ہے جو دونوں کو الگ
بھی کرتا ہے۔ پھر ایک اور شعر ۔

یہ ذرا دور پہ منزل یہ اجالا یہ سکوں
خواب کو دیکھ ابھی خواب کی تعبیر نہ دیکھ

یہ شعر دراصل فیضؔ کے اس شعر کی طرف ذہن کو راغب کرتا ہے ۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضمون کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا
ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروحؔ
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

ہجوم دہر میں بدلی نہ ہم نے وضع خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

مجروحؔ نے بطریق احسن ترقی پسند شعائر کا اپنی غزلوں میں استعمال کیا ہے اور ایسے طریقۂ کار میں بھی اپنی جودت طبع کو برقرار رکھنے میں خاصے کامیاب ہوئے۔ ابھی میں نے فیض کے کچھ اثرات کے بارے میں اظہار خیال کیا جس کی موصوف تردید کرتے رہے تھے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ترقی پسند

ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ مجروحؔ متعلقہ مضمون کا جواب دے رہے ہیں۔فیض کو احساس ہے کہ جس اجالے کی تلاش تھی وہ ہنوز حاصل نہ ہو سکا جب کہ مجروح کہتے ہیں کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اجالے کی تلاش کی جائے،ابھی خواب دیکھتے رہنا ہے اور خواب کی تعبیر سے غرض نہیں رکھنی ہے۔صاف معلوم ہوتا ہے کہ مجروحؔ کے سامنے فیض کا شعر تھا جس کا وہ جواب دینا چاہ رہے۔تھے۔بہر حال!یہ بات ضمناً آ گئی ہے۔

ترقی پسندی کے متعینہ مضامین میں بھی مجروحؔ سلطان پوری خوب خوب اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ایسا مظاہرہ جو انھیں سے وابستہ ہو کر رہ گیا۔مثلاً:

میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیرِ مغاں بنتا گیا
جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

ترقی پسندی کس طرح مجروحؔ کے یہاں نت نئے تیور کے ساتھ مضمون بنتی جاتی ہے:

یہ محفل اہل دل ہے یہاں ہم سب میکش ہم سب ساقی
تفریق کریں انسانوں میں اس بزم کا یہ دستور نہیں

ظاہر ہے ترقی پسندی کا منشور ہے کہ ایں وآں کچھ بھی نہیں، رنگ ونسل کی بنیاد پر تفریق بے معنی ہے، درجات غلط طریقے پر قائم کئے گئے ہیں آدی آدمی میں فرق کرنا ایک طرح کا جرم ہے اس لئے کہ یہاں تو مساوات عام ہے یہ ایک ایسی دنیا ہے جہاں سارے کے سارے میکش ہیں، سارے کے سارے ساقی ہیں لہٰذا تفریق کی گنجائش نہیں اور آدمی آدمی میں فرق کرنا بے معنی ہے۔ ظاہر ہے ترقی پسندی مساوات کا سبق دیتی رہی ہے اور انسانوں کے بیچ فرق کو مٹانا چاہتی ہے خصوصاً معاشی بنیادوں پر۔ یہ مضمون ایک ترقی پسند مضمون ہے ظاہر ہے اس سے مجروحؔ وابستہ ہو کر بھی جو لفظ استعمال کرتے ہیں میکش، ساقی، محفل ۔ یہ سب کے سب اسٹاک کے الفاظ ہیں جو پہلے بھی استعمال ہوئے ہیں او رغزل میں تو اس طرح برتے گئے ہیں کہ شاید Stale ہو گئے ہیں لیکن یہی Stale الفاظ مجروحؔ کے ہاتھوں میں نئی زندگی پاتے ہیں اور یہ میکش اور ساقی دراصل نئی دنیا کے وہ لوگ ہیں جو کسی تفریق کے قائل نہیں۔ پھر بھی یہ دیکھئے۔

جنت بہ نگہ تسنیم بہ لب انداز اس کے اے شیخ نہ پوچھ
میں جس سے محبت کرتا ہوں انساں ہے خیالی حور نہیں

بظاہر یہ شعر اس بات کا عکاس ہے کہ اب جو دنیا ہے وہ صاف پہچانی جاتی ہے۔ یہ لمسی دنیا ہے ،بصری دنیا ہے، ماورائی نہیں ۔ یہاں ہر قسم کی کیفیت کو دیکھا اور چھوا اور محسوس کیا جا سکتا ہے جب کہ جنت کا تصور تو محض تصور سے ہے اور یہ شیخ کی جنت ماورائی ہی، خیالی ہے۔ یہاں جنت بھی خیالی اور حور بھی خیالی اور جس کا علمبردار یا جسے بتانے والا یا نشان زد کرنے والا شیخ۔ لیکن اب دیکھئے ترقی پسند وہ جنت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو آپ کی آنکھوں کے سامنے ہو، تسنیم کو لب سے لگا سکتے ہوں۔ اب جس

سے محبت کی جا رہی ہے وہ گوشت پوست کا انسان ہے، خیالی نہیں۔ یہاں اسلامی فکر اور ترقی پسند فکر سے براہ راست ٹکراؤ ہے۔ ظاہر ہے شیخ جو پہلے بھی اردو شعری توایت میں زد میں آتا رہا ہے۔ یہاں بہیت سنجیدگی سے اس رد کیا جا رہا ہے۔ کہ سکتے ہیں کہ یہ شعر اسلامی تصور سے بہت دور ہے لیکن ہم مجروحؔ کی صرف اسی بنیاد پر سرزنش نہیں کر سکتے۔ اس میں جو کیف اور کیفیت ہے وہ ہمارے حواس پر چھا جاتی ہے اور تمام دوسرے محسوسات کو جو منفی ہیں، ان کا انسداد ہو جاتا ہے۔ جنت بہ نگہ، تسنیم بہ لب ایسے ترکیبیں ہیں جو ہماری بصری اور لمسی حسیات کو تیز تر کر دیتی ہیں اور ہم کسی اور ہی کیفیت میں ہوتے ہیں۔ شاید مجروح Milk of human kindness پر اعتماد اور اعتقاد رکھتے تھے۔ ترقی پسندی نے جو مظاہرہ کیا تھا کہ سب انسان برابر ہیں، انھیں خاصہ بھا گیا تھا۔ چنانچہ ان کی لے دیکھئے۔

مجروحؔ اٹھی تھی موج صبا آثار لئے طوفانوں کے
ہر قطرۂ شبنم بن جائے اک جوئے رواں کچھ دور نہیں

ترقی پسندی سے متعلق کچھ اور شعر دیکھئے۔

میں ایک محنت کش ہوں میں کہ تیرگی دشمن
صبح نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے
اب جنوں پہ وہ شاعت آپڑی کہ اے مجروح
آج زخم سر بہتر دل پہ چوٹ کھانے سے

نظارہ ہائے دہر بہت خوب ہے مگر
اپنا لہو بھی سرخیٔ شام و سحر میں ہے

یہی جہاں ہے جہنم یہی جہاں فردوس
بتاؤ عالم بالا کے سیر بینو ں کو

غزل کا شاعر وہی کام غزل سے لے رہا ہے جو دوسرے شعر انظموں سے لیتے ہیں۔ظاہر ہے یہ بہت مشکل امر ہے لیکن مجروح اس راہ پر بہ سلامت گذرے ہیں۔اب محنت کش تیرگی کا دشمن ہے ۔جس کے یہاں اس کی مسکراہٹ ہی صبح نو سے عبارت ہے۔آج بھی چوٹ لگتی ہے لیکن یہ چوٹ ایک بڑی غایت کے لئے ہے اس لئے اسے خوش آمدید کہنا چاہئے۔پھر ایک اور منظر مجروح پیش کرتے ہیں کہ بہت کیف ہے اس دہر کے نظارے میں۔لیکن اس کا احساس ہونا چاہئے کہ اس نظارے میں مجروح جیسے لوگوں یا مزدوروں کا خون بھی شامل ہے۔چانانچہ سرخی شام وسحر جو ایک خاص نظارہ پیش کر رہی ہے وہ اس بات کا مظہر ہے اور پھر مجروح اسی بات کو دہراتے ہیں جسے وہ نئی جنت کہتے ہیں اس لئے کہ عالم بالا کی جنت ہو یا جہنم، کچھ بھی نہیں ہے جو کچھ بھی ہے اسی دنیا میں ہے، جنت بھی جہنم بھی ۔لہٰذا جو عالم بالا کی سیر میں ہیں ان سے ان کا کچھ لینا دینا نہیں ہے، اب تو یہ دنیا ہی سب کچھ ہے۔تو گویا مجروح مارکس کے اس تصور ساتھ ہو جاتے ہیں کہ ماورائی دنیا کو جو مذہب کے امام پیش کرتے رہے ہیں وہ دراصل اس دنیا سے لوگوں کو الگ تھلگ رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ہر شخص مذہب کی افیون

کھا کے مست رہتا ہے نتیجے میں اس کا حق اسے نہیں ملتا۔ وہ ہر جبر کو قبول کرتا ہے، استحصال سے عاجز نہیں ہوتا اور ایسے تمام امور کو قضا وقدر سے معمور کر کے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اپنی قسمت کو ایک بڑے رشتے جوڑ کر صبر کرتا رہتا ہے اس لئے کہ اس کے صبر کا اجر آئندہ کی دنیا میں یعنی موت کے بعد حاصل ہوتا ہے اور یہ فانی دنیا چونکہ چند دنوں کی ہے اس لئے صبر وقناعت سے کام لینا چاہیئے اور دائمی دنیا کی فکر کرنا چاہیئے۔ مجروح اسے خواب آور کیفیات سمجھتے ہیں اور غور وفکر سے عاری کرنے والے محرکات سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ بار بار اس کا احساس دلاتے ہیں کہ یہی دنیا اصل ہے باقی سب کچھ فریب ہے، دھوکا ہے۔ غزل میں یہ احساس دلانا بڑی فنکاری چاہتا ہے جہاں عقیدے کو ٹھیس لگ رہی ہو پھر بھی ہر شخص خاموش رہے۔ چونکہ مجروح سب جانتے ہیں فن وہ ہے جو اپنی آواز دھیمی رکھے اور جس کی شدت زیادہ ہو نہ کہ اس میں شور وغوغا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی جنون کے خلاف مجروح کی باتیں شیریں کیپسول میں چھپی رہتی ہیں اور عام احتجاج کا پہلو پیدا نہیں کرتیں ورنہ بعض ترقی پسند اپنے ایسے ہی خیالات کو نظم کرنے کے سلسلے میں خاصے معتوب ہوتے رہے ہیں، پہلے بھی اور اب بھی۔ مجروح پر کوئی بھی ایسا الزام لگایا جا سکا ہے اور اس کی وجہ وہی ہے Art lies in concealingart لیکن مذہب بیزاری مجروح کے عام اعتبار کو نہیں کھوتی اور وہ سبھوں کے لاڈلے بنے رہتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ جہاں اسی بنیاد پر دوسرے لوگ رد ہوتے رہے ہیں تو مجروح کی شخصیت عام پسند بن کر ابھرتی ہے۔ ٹھیک ہے ان پر بہت کم لکھا گیا ہے لیکن ان پر کم لکھا جانا اس بات کی علامت نہیں ہے کہ ان کی شاعری پسند نہیں کی گئی تھی، کی گئی تھی اور آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ ان امور سے ہٹ کر ذرا دیکھئے ترقی پسندی کی خاص علامتیں مثلاً قفس، صیاد، زنداں یا قید وبند کی علامات۔ چند اشعار سامنے کے ہیں۔

ہم قفس صیاد کی رسم زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی انداز کلام آ ہی گیا

دیکھ کلیوں کا چٹکنا سر گلشن صیاد
زمزمہ سنج مرا خون جگر ہے کہ نہیں

مگر اے ہم قفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی
یہ رسم قید و زنداں ایک دیوار کہن تک ہے

دار پر چڑھ کر لگائیں نعرۂ زلف صنم
سب ہمیں باہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں

نہ ہم قفس میں رکے مثل بوئے گل صیاد
نہ ہم مثال صبا حلقۂ رسن میں رہے

مجروح اپنے جذبات واحساسات کو contain نہیں کر پاتے بلکہ آواز کو بلند کرنے پر مجبور ہیں یعنی اس کے اندر وہ شاعرانہ کیف اور ہنرمندی دونوں ہی نظر نہیں آتیں۔ ایسے میں شعر ایکہرا ہو کر

اپنے منصب سے گر جاتا ہے اور ایک طرح کی غیر تخلیقی فضا مرتب ہو جاتی ہے۔ خود مجروح نے جہاں کہیں بھی بد احتیاتی کی ہے وہاں یہ صورت دیکھی جاسکتی ہے۔ ایک مشہور غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

جلا کے مشعل جاں ہم جنون صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

دیار شام نہیں منز ل سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے

ہوا اسیر کوئی ہم نوا تو دور تلک
بپاس طرز نوا ہم بھی ساتھ سات چلے

ہمارے لب نہ سہی وہ دہان زخم سہی
وہیں پہنچتی ہے یارو کہیں سے بات چلے

بچا کے لائے ہم اے یار پھر بھی نقد وفا
اگر چہ لٹتے ہوئے رہزنوں کے ہات چلے

مجروح جو ابتدا میں پندار تمنا ٹوٹنے پر دل کو سنبھال نہ سکے تھے ،وہ درد مجسم بن گئے ۔ ہوا یہ کہ غم جاناں غم دوراں میں تبدیل ہوگیا۔ترقی پسند تحریک نے فکر ونظر کو اس خاص سمت میں پھیلا دیا جہاں سرخ سویرا تھا۔ کچھ دیر کے لئے آنکھیں چکا چوندھ تو ہوئیں ضرور لیکن مجروح ادائے طول سخن (نظم)اختیار کرنے کے بجائے،بطرز نگاہ یار (غزل) عرض حال بیان کرتے رہے ۔

شمع زنداں ہے مجھے ہر گل بدن سرخ ترا
میں تو دیوانہ ہوں اے انجمن سرخ ترا

ہوں میں آلودۂ خوں پھر بھی مرا شوق تو دیکھ
اب مرے تن پہ بھی ہے پیرہن سرخ ترا

تو بھی دیکھے تو یہ اب ہو نہ سکے گا معلوم
میرے سینے میں ہے دل یا وطن سرخ ترا

علی سردار جعفری بیان کرتے ہیں:

مجروحؔ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۵ میں ہوئی جب وہ انجمن ترقی اردو کی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے جگر مرآبادیؔ کے ساتھ ممبئی آئے تھے۔رات کو مشاعرہ تھا۔ جب مجروح کے نام کا اعلان ہوا تو مجمع نے ذرا ضرورت سے زیادہ تالیاں بجائیں۔ کچھ لوگ ہنسے،لیکن مجروح نے اپنی غزل

پھر آئی فصل کہ مانند برگ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

بلا ہی بیٹھے جب اہل حرم تو اے مجروح
بغل میں ہم بھی لئے اک صنم کا ہات چلے

یہ حقیقت اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ مجروح کا تمام تر زورترقی پسند غزل کی گیسوئے خم بہ خم کی مشاطگی پر ہے ۔وہ ترقی پسند نقطہ نظر سے تمام تر اتفاق رائے کے باوجود، جس میں انسان دوستی ،استحصال سے پاک معاشرہ کا قیام، سائنسی فکر کی بالادستی اور بین الاقوامیت کا احساس پیدا کرنے کے لئے جستجو شامل ہے، روایتی غزل کی شریں کلامی سے دست کش نہیں ہو پاتے ۔وہ ''مواد'' اور ''ہیئت'' کے متناسب آمیزہ پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسا کمال ہے جسے مجروح نے بخوبی حاصل کیا ہے۔اس مضمون میں مجروح اور ان کے ہم عصروں کا تقابلی مطالعہ مقصود نہیں بلکہ وہ منفرد اہمیت بلکہ قیادت سے انکار نہیں کر سکتے۔

مجروح نے ترقی پسند تحریک میں یہ نیا باب تو نہیں رقم کیا کہ غزل کو قائم کیا کیوں کہ ان کے علاوہ بھی لوگ غزل کہ رہے تھے ہاں یہ ضرور ہے کہ ترقی پسندوں کے درمیں غزل ایک معتوب صنف کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ مجروح نے تمامخالفت کے باوجود غزل ہی کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔اور غزل م یں وہ سب کر دکھایا جس کے لئے ترقی پسند تحریک کو دوسرے شعرا صرف نظم ہی میں اپنی بات کہنے کی صلاحیت محسوس کرتے تھے۔

چھیڑ دی اور ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ تالیاں بجانے والے اور ہنسے والے شرمندہ ہو گئے۔ شاعر کی خوداعتمادی نے میدان جیت لیا۔ شاعر خوش گو بھی تھا اور خوش گلو بھی۔ خوش پوش بھی اور خوش رو بھی۔ سونے پر سہاگا، جگر خوش ہوئے اور مولانا حسرت موہانی نے جی کھول کر داد دی۔

اس وقت مجروحؔ کو ترقی پسندی کے مسلک اتفاق تھا۔ مجروحؔ کی غزلوں میں زندگی تھی اور کہیں کہیں سماجی تنقید بھی جھلک آتی تھی لیکن وہ ادب اور آرٹ کے سماجی مقصد کے قائل نہیں تھے۔

دو برس بعد حیدر آباد کے ایک مشاعرے میں پھر میرا اور مجروح کا ساتھ ہوا۔ وہاں سے ہم اجنتا اور الورا دیکھنے گئے۔ اجنتا میں گوتم بدھ کی تعلیمات، زندگی اور اس وقت کے ماحول کی تصویر کشی نے مجروح کو ششدر کر دیا اور انھوں نے چپکے سے مجھ سے اعتراف کیا کہ سماجی مقصد کے بغیر بڑا آرٹ پیدا نہیں ہو سکتا۔ مجروح کے الفاظ میں ''اجنتا فن کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے پھر بھی پروپگنڈہ ہے، وہ جاوداں اس لئے ہے کہ اس نے روح عصر کو اسیر کر لیا ہے۔'' یہی خیال بعد کو ایک مقطع میں ڈھل گیا۔

نوا ہے جاوداں مجروح جس میں روح ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے''(۱)

اس احساس نے مجروح کی شاعری میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور مجروح نے اپنی غزل کو نئے راستے پر ڈال دیا۔

کچھ عرصے کے بعد یہ سننے میں آیا کہ جگر صاحب کی کوششوں سے مجروح کو فلمی دنیا میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ اس طرح وہ فکر معاش سے آزاد ہو گئے۔ غالباً اسی زمانے میں انھیں ترقی پسند تحریک نے اتنا متاثر کیا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہو گئے۔ ۱۹۴۹ میں جب کمیونسٹ پارٹی نے ریلوے اسٹرائک کا نعرہ دیا اور سارے ہندوستان میں جگہ جگہ کمیونسٹ گرفتار ہونے لگے تو مجروح بھی

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۵

پکڑے گئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ''مار لے ساتھی جانے نہ پائے'' والی نظم کہی تھی، لیکن اسے بھی وہ ''گائے جا پپیہے گائے جا پپیہے'' والی نظم کی طرح کہیں نہیں سناتے اور نہ یہ ان کے مجموعے میں شامل ہے۔ غالباً کچھ عرصے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ''مار لے ساتھی جانے نہ پائے'' شاعری نہیں صرف پروپگنڈہ ہے۔ ''گائے جا پپیہے گائے جا پپیہے'' میں بھی تھوڑی سی شعریت تھی لیکن ''مار لے ساتھی جانے نہ پائے'' میں اس تھوڑی سی شعریت کا بھی فقدان تھا۔

ترقی پسند تحریک کا اصل منشہ اور مقصد یہ تھا کہ ہمارے ادیب و شاعر اشتراکیت اور اشتراکی کی سیست سے صرف آشنا ہی نہ ہوں بلکہ اسے دل و جاں سے اپنا بھی لیں۔ ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات ایسے تھے کہ یہ تحریک تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت جلد مقبول ہوگئی۔

چنانچہ جب مجروح کھل کر کہتے ہیں تو اپنی ترقی پسندی کے زعم میں غزل کا خون کر دیتے ہیں۔ یہاں مقصدیت فن پر حاوی ہو جاتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں بعض اسی غلطیاں بھی ہوئیں جن کا خمیازہ ہمارے بعض اچھے شاعروں کو بھگتنا پڑا۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر علیم نے قدیم ادب کو جاگیری دور کا ادب کہ کر سرے سے مسترد کر دیا۔ اسی طرح غزل کی مقبول ترین صنف کو گردن زدنی قرار دیا گیا۔ عشقیہ شاعری بھی ترقی پسندی کے منافی سمجھی گئی۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اس ابتدائی دور کے نوجوان رومانی شاعر رومانیت سے توبہ کر کے ترقی پسند بننے کی خاطر سیاسی نظمیں کہنے لگے۔ ان نظموں میں رنگ و آہنگ اس لئے پیدا نہ ہو سکا کہ سیاست کو ان کے مزاج سے دور کا بھی ربط نہ تھا۔ اس کی سب سے اچھی مثال جاں نثار اختر کی ہے۔ جو ہمارے گروپ کا سب سے اچھا رومانی شاعر تھا۔ شراب و شاہد کا یہ شاعر ترقی پسندی کی نزر ہو گیا اور بے جان و بیکار ترقی پسندانہ نظمیں کہنے لگا۔ یہ کسی حادثے سے کم نہیں۔ جاں نثار کی ٹریجڈی دراصل ماحول کی جبریت کا نتیجہ تھی۔ مجاز نے یوں تو عشقیہ غزلیں بھی کہیں، لیکن ہمیشہ اس اندیشہ کا شکار رہا کہ اس

رومانیت کی بنا پر کوئی اسے غیر ترقی پسند نہ کہ دے۔ مختصر یہ کہ عشقیہ شاعری ایک عرصے تک حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی رہی۔

۴۳-۱۹۴۲ سے ۵۵-۱۹۵۴ تک دس بارہ سال ترقی پسند لیبل کی ایسی ادبی تنقید لکھی گئی ہے جس میں سے اگر اسم معرفہ نکال لیا جائے تو کئی کئی پیراگراف تک پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ لینن کے بارے میں ہے یاستالین کے، پلیخانوف کے متعلق ہے یا لیوشاؤچی کے۔ کیفی اعظمی یا غلام ربانی تاباںؔ کی شاعری پر ہے یا طلوع آفتاب پر؟ اس کاری ایکشن کو تو ہونا لازم تھا۔ ہوا۔

مجروح کی نپی تلی زندگی اور معمولات میں بندھے شب و روز میں دو تین بار ہلچل ہوئی، ۱۹۵۹ میں اور ۶۲ میں جب شمالی سرحدوں پر چین اور میں کچھ چل گئی تھی اور کمیونسٹ خیال کے ہندوستانیوں سے اپنے تپنے کے ساتھ نام ونسب پوچھا جانے لگا تو مجروح کو بھی دھچکا لگا، تبھی کی وہ غزل ہے

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہل وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

ظ.انصاری کہتے ہیں کہ ۱۹۵۳ سے آج تک، تیس برس کے کلام میں یہ بالکل ہی منفرد غزل ہے، جتنی داد انھیں آج تک ملی ہوگی وہ بھی اس کے آگے کم ٹھہرے گی۔

پھر ۱۷، ۱۸ سال بعد بے موسم کے بادل ان کے آنگن میں وآئے کچھ بوندا باندی ہوئی اور دیوار پر سبزۂ بیگانہ دکھائی دینے لگا۔ آخر کی پانچ غزلیں اسی ایک دو سال کی پیداوار ہیں۔

مطلب یہ کہ نسیم بہار کے جھونکوں سے جب ان کا آشیانہ ہلکورے لے رہا تھا مسلسل تیس سال کا یہ زمانہ ان کے یہاں کم آمیزی اور کم سخنی کا رہا۔ بمشکل دس گیارہ غزلیں، بمشکل ساٹھ پینسٹھ شعر۔

سب سے تیکھا، سب سے زیادہ انھوں نے ۱۹۴۹ اور ۱۹۵۲ کے دوران تین برسوں میں لکھا۔
وہ تصویر ملاحظہ ہو جو شاعر نے بائیکلہ جیل میں (۱۹۵۱) کھینچی تھی:

شب ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروان سحر نہ ہو

ایک لفظ، ایک آواز، ایک اضافت اور ترتیب الفاظ ایسی نہیں جو دیر تک نہ گونجتی ہو۔
''مجروح جگر کے شاگرد ہوتے ہوئے، جگر سے بہت پہلے غزل کے نئے انقلابی لہجے کو دریافت کر رہے ہیں،۔ یہ کیا اپنی جگہ کم اہم ہے؟ اس وقت جگر کی غزل بڑی حد تک ''گوری گوری کلائیاں توبہ'' یا ''لہرا کے پی گیا، بل کھا کے پی گیا'' گانے والی مشاعرہ پسند غزل تھی۔ ان کے یہاں سماجی شعور نے آزادی سے چند برس قبل آنکھ کھولی۔ ان کے دوسرے حلقہ بگوش زندگی بھر ''گھبرا کے محبت کر بیٹھے'' قسم کی غزلیں کہ کر جگر اور جگر اسکول کا نام اچھالتے رہے۔ مجروح اور ان کی غزل کو اس سطح سے ترقی پسند تحریک سے اوپر اٹھایا۔ اور مجروح نے ترقی پسند شاعر کی نعرہ باز نظم کو غزل کی ایمائیت و ایجاز سے پہلی بار روشناس کیا۔ مجروح نے ترقی پسند تحریک کے نظریات سے جو کچھ لیا وہ اپنی خوبصورت توانا عاشقانہ لہجے اور مجاہدانہ طنطنے والی غزل کے واسطے سے اسے واپس بھی کر دیا اس طرح دونوں کا حساب برابر رہا۔''(۱)

مجروح کے یہ شعر ترقی پسندی کے دور عروج میں زبان زد نقاداں تھے جو دیگر لوگوں نے پسند نہیں کیا اس میں وہ بات بھی نہیں جو مجروح کی غزل کا خاصہ ہیں:

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۵۳

میری نگاہ میں ہے ارض ماسکومجروح
وہ سر زمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

اب زمیں اگائے گی ہل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے
اہل دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم
اب گہرسبک ہوگا جو کے ایک دانے سے
من چلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے

یا ''مارلے ساتھی جانے نہ پائے''، قسم کے شعر یا وہ غزل جو ''ہندستان کا دروازہ عوامی چین کی طرف کھلتے دیکھ کر''، لکھی گئی تھی۔

لے کے آئی تو صبا اس گل چینی کا پیام
وہ سہی زخم کی صورت لب خنداں تو کھلا

حالانکہ اس غزل میں یہ خوبصرت شعر بھی ہے

سیل رنگ آ ہی رہے گا مگر اے کشت چمن
ضرب موسم تو پڑی بند بہاراں تو کھلا

ڈاکٹر وحید اختر کا کہنا ہے کہ مجھے اس مجروح نے متوجہ کیا، جس نے کہاع

فراز دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ

امیج کی یہ ندرت اوراس کی تخلیقی قوت غزل میں نئی چیز ہے یا پھر یہ شعر ۔

شب ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروان سحر نہ ہو

مجروح اس وقت ممبئی آئے جب ترقی پسند تحریک اپنے سباب پرتھی اور ملک زبردست سیاسی بحران سے گذر رہا تھا۔ایک طرف ملک میں آزادی کی تحریک عوام میں جوش پیدا کر رہی تھی اور دوسری طرف فاشزم کی شکست فاش کے لئے دنیا کے جمہوری مما لک روس کے کندھے سے کندھا ملا کر جنگ

عظیم میں مصروف تھے۔ بھلا کون شاعر یا دانشوران عہد ساز واقعات سے بے نیاز رہ سکتا تھا؟ مجروح ایک حساس طبیعت کے مالک تھے۔ ترقی پسند تحریک سے اپنا رشتہ جوڑا جو کم وبیش آخر تک قائم رہا۔ اس دور میں انھوں نے ہنگامی شاعری بھی کی۔ ہنگامی ادب چاہے دیرپا نہ ہو لیکن ہنگامی دور میں ہنگامی ادب کی تخلیق سے بالکل دامن بچایا بھی نہیں جا سکتا۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ادب کی حکمت عملی بھی انھیں تقاضوں کے نفسیاتی دباؤ کے تحت متشکل ہوتی ہے۔ آخر شہر آشوب والی شاعری ہم کس زمرے میں شامل کریں گے وہ بھی اپنے دور کی طوائف الملوکی ہی کی پیداوار تھی۔

157

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی سب سے اہم ادبی تحریک ہے۔ اس تحریک نے موضوع، خیال ،زبان سب کو واضح خطوط دئے۔ زمانے کی نئی نئی ضرورتوں سے روشناس کرایا۔ ملکی سیاست میں حصہ بنایا اور خوابوں کی تعبیریں دیکھیں۔ اس دور میں احتجاج کا رجحان بہت زیادہ رہا۔ یہ احتجاج ادبی قدروں، سیاسی نظریوں، معاشی فلسفوں اور جامد قسم کی سماجی، مذہبی اور اخلاقی قدروں کے خلاف احتجاج تھا۔ اس احتجاج میں جنونی بغاوت کے آثار نہیں ہیں بلکہ فرزانگی کا دامن ہاتھ میں تھا۔ بغاوت زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ملی ہوئی کثافت سے تھی۔ حسن اور خوبصورتی اور زندگی کے جمالیاتی پہلوؤں کی نفی اس مسلک کا مقصد نہیں تھا۔ فن تھا، فرار نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کا ادب، زبان و بیان کی فنی قدروں، حسن کے جادو اور جمالیاتی نقطۂ نظر کی صحت مندانہ آرائش ہے۔ جدید اردو غزل میں یہ خصوصیت مجروح کی غزل میں رچی بسی ہوئی ہے۔ مجروح کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ جلا دیا کبھی اک چراغ بجھا دیا

وہ بعد عرض مطلب ہائے رے شوق جواب اپنا

ملی جو ان سے نظر بس رہا تھا ایک جہاں

ہٹی جو آنکھ تو چاروں طرف تھے ویرانے

وہ تک رہے تھے ہمیں ہنس کے پی گئے آنسو

وہ سن رہے تھے ہمیں کہہ سکے نہ افسانے

دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آکر

سوچتا ہوں یہ تری راہ گذر ہے کہ نہیں

مجروحؔ کی شاعری کا موضوع بھی فیضؔ کی طرح دو عشق ہیں ۔ پہلا کسی کی نگاہ کا جادو جگائے ہوئے ہے۔اور دوسرا عشق لیلیٰ وطن کا عشق ہے۔لیلیٰ وطن کے لیے وہ اشترا کی نظریے کو آرائش خم کا کل سہارا بناتے ہیں ۔ یہ صرف مجروحؔ کی ہی خصوصیت نہیں ترقی پسند تحریک کی خصوصیت ہے ترقی پسند تحریک صرف ادبی تحریک نہیں تھی بلکہ یہ بہت بڑی حد تک معاشی اور سیاسی نظریے کے لحاظ سے اشترا کی تحریک تھی۔ کسی بھی تحریک کو کسی نہ کسی نظریے کا سہارا لینا ضروری ہوتا ہے اور اس لحاظ سے یہ بامعنی بھی ہے ۔ مجروح ہندوستان کی آزادی اور آزادی کے بعد ملک کے لئے لیے جس نظام کی زندگی کو پسند کرتے ہیں وہ اشترا کی نظام میں ہے،اور اس لحاظ سے وہ سرخ پرچم کے نغمہ خواں ہیں ۔

میری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروحؔ

وہ سر زمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

مجروحؔ نے تین شعر سوویت یونین کے بھی نذر کیے ہیں۔ان تینوں اشعار میں وہ اپنی انجمن سرخ کی اس محبوبہ کے بانکپن سے بری طرح مجروح نظر آتے ہیں۔یہ وہ زمانہ تھا کہ اس ملک میں سوویت یونین اور اشتراکی نظام کو بہت مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔مجروح اور اسی قبیل کے دوسرے شعرا کے یہاں اس ضمن میں جو اتنی شدت ہے وہ شاید اسی شک اور پابندی کا سخت ردعمل ہے۔ورنہ وطن عزیز کی فکر کرتے ہوئے سوویت یونین یا کسی یونین کو سلام بامعنی معلوم ہوتا ہے۔یہی نہیں بلکہ مجروحؔ کی ایک غزل عوامی چین کے تعلق سے بھی ہے۔مجھے نہیں معلوم آج سوویت یونین اور عوامی چین کے پس منظر میں کس عشق کے پابند ہیں۔میرے خیال میں یہ مجروحؔ کی شاعری کے لیے مقام آزمائش ہے اور اس ضمن میں ان کی شاعری کا دم گھٹ سا گیا ہے۔میں اس سلسلے میں صرف ایک جواز پیش کرسکتا ہوں اور وہ یہ کہ یہ زمانہ کسی نظریے کا زمانہ نہیں ہے۔بلکہ یہ سیاست کا زمانہ ہے۔چینی ہوں یا روسی ان دونوں کا اختلاف نظریاتی سے زیادہ سیاسی اختلاف ہے۔ہمارے اکثر ترقی پسند شعرا اس سیاست کے مارے ہوئے ہیں۔مجروحؔ کی اشتراکی شاعری میں جس میں وہ روس یا چین کے نغمہ سرا ہیں موضوع کے اعتبار سے ایک وقتی نعرے اور جذباتیت کا شکار ہوگئی ہے۔سیاسی شاعری وقتی اعتبار سے مفید ضرور ہوسکتی ہے، پائیدار نہیں بن سکتی ہے۔اور وہ زمانے کے ساتھ مجروح ہی نہیں مرحوم ہو جاتی ہے۔

ترقی پسند تحریک، مجروحؔ جس کے ایک نمائندہ شاعر ہیں، دراصل اشتراکیت کے اصولوں نیز ان کی تشہیر وترویج پر مبنی ہے۔چنانچہ مجروحؔ کے یہاں بھی محنت وسرمایہ کی آویزش اور نظام اشتراکیت سے حسین توقعات کی وابستگی کا اظہار جا بجا ملتا ہے بلکہ ان کی بعض غزلیں مکمل طور پر انھیں خیالات پر مشتمل ہیں۔مثلاً

عہد انقلاب آیا دور آفتاب آیا
منتظر نگاہیں تھی جس کی اک زمانے سے

اب زمیں اگائے کی ہل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے
اہل دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم
اب گہر سبک ہوگا جو کے ایک دانے سے
من چلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے
عام ہو گا اب ہمدم سب پہ فیض فطرت کا
بھر سکیں گے اب دامن ہم بھی اس خزانے سے

مجروحؔ خالص غزل کے شاعر ہیں لیکن عصری ضروریات کے تحت وہ جدید غزل کی شناخت بن چکے ہیں اور جدید غزل کے سارے عناصر ترکیبی ان کے یہاں پوری سج دھج اور نکھرے ہوئے انداز میں موجود ہیں ۔ ترقی پسند کے ناطے ان کے یہاں اشتراکیت کی گونج ایک متوازن لہجے کے ساتھ ملتی ہے تو خالص تغزل کو بھی انھوں نے اس انداز میں پیش کیا ہے جو صرف مجروحؔ کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے ۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہیں آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

۱۹۴۹ء میں جب آزاد ہندوستان غلامی کی توسیع کا نظارہ پیش کر رہا تھا تب ہی مزدوروں کے ایک جلسے میں مجروح نے اپنے رنگ سے بالکل ہٹ کر ''سوسنار کی ایک لہار کی'' کے مصداق جب ایک نظم سنائی ؎

امن کا جھنڈا اس دھرتی پہ کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

تو مزدوروں نے تالیوں کی گونج میں اس کا خیر مقدم کیا۔ ادب کے اکثر ٹھیکے داروں نے اسے بہانہ بنا کر ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی خوب ہجو اڑائی کہ ''یہ نئے ادب کا نیا معیار تھا۔'' اور مرار جی دیسائی نے جو ممبئی کے وزیر اعلیٰ تھے، اسی نظم پر پکڑ کر جیل میں ٹھونس دیا۔

جب ترقی پسندوں کے ایک بڑے حلقے نیں غزل کی ساخت پر حملے کئے اور اسے سراسر مصنوعی قرار دیا تو غزل کی مدافعت خاصی مشکل نظر آئی تھی۔ سجاد ظہیر نے ''ذکر حافظ'' میں ظ۔انصاری سے جس مسئلا پر اختلاف رائے کیا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ ظ۔انصاری غزل میں ترقی پسندانہ فکر کا نفوذ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور سمجھتے تھے۔ سجاد ظہیر نے ''ذکر حافظ'' میں حافظ کے کلام سے متعدد مثالیں دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ غزل صرف شعری ہئیت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اپنے ''مواد'' کے انتخاب میں حد درجہ آزاد صنف سخن ہے۔

مجروحؔ ترقی پسند شاعر بھر نہیں ہیں بلکہ وہ ترقی پسند غزل کے ایک رجحان ساز شاعر ہیں جنھوں نے یہ بات ثابت کیا ہے کہ روایتی شاعری کی لغت نئے تقاضوں پر پوری اترتی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

غلام رہ چکے، توڑیں یہ بند رسوائی
کچھ اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں

ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں ابھی فردوس و جناں کے شیدائی
تجھ کو تو ابھی کچھ اور حسیں اے عالم امکاں ہونا تھا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

زمیں کو مل کر سنواریں مثال روئے نگار
رخ نگار سے روشن چراغ بام کریں

ہم قفس صیاد کی رسم زباں بندی کی خیر

بے زبانوں کو بھی انداز کلام آ ہی گیا

عہد انقلاب آیا دور آفتاب آیا
منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے

منچلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے

دشمن کی دوستی ہے اب اہل وطن کے ساتھ
ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

پارۂ دل ہے وطن کی سرزمیں مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں

شب ظلم نرغئہ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کارواں سحر نہ ہو

ستون دار پہ رکھتے چلوسرو ں کے چراغ
جہا ں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

جس دم یہ سنا ہے صبح وطن محبوس فضائے زنداں میں
جیسے کہ صبا اے ہم قفسو بیتاب ہم آئے زنداں میں

مجروح اور فیض کی ''غزل'' میں سیاسی رمزیت کے بارے میں کچھ اس قسم کے داعوے کئے ہیں جیسے کہ ان دو شعرا سے پہلے اردو غزل سیاسی رمزیت سے نا آشنا ہو۔ یہ بات نہ صرف حقیقت سے بعید ہے بلکہ خود مجروح اور فیض کی تفہیم میں بھی مزاہم ہے۔ میر تقی میر کے بعض اشعار بھی سیاسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ انشاء، سودا، مصحفی، آتش، میر درد، ذوق، حالی، شبلی، شرر، اقبال، ظفر علی خان، محمد علی جوہر اور حسرت کے یہاں بھی کہیں کہیں سیاسی رمزیت موجود ہے۔

لیکن مجروح اور فیض ومجاز سے پہلے جذبی نے جس نوع کی سیاسی رمزیت سے اپنی ''غزل'' کو متعارف کرایا ہے وہ تصوف کے معانیاتی اور اسلوبیاتی نظام کی طرز پر ایک واضح سیاسی نظام حیات کے طابع ہیں۔ مجروح بڑی حد تک ترقی پسند رہتے ہوئے بھی ''تغزل'' کے حق میں جانب دار ہیں جبکہ فیض

''تغزل'' کے بارے میں اس قدر شعوری نہیں جس قدر کی مجروح ،فیض اور مجروح کے مابین یہی وہ بنیادی فرق ہے جو خط فاصل کا درجہ رکھتا ہے۔

ایک طرف یورپ میں تھامس مان نے کہا کہ ''اس دور کا مقدر سیاسی ہے'' تو دوسری طرف منشی پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ (۳۶ء) میں اس خیال افروز حقیقت کا اعلان کیا کہ ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا'' ترقی پسندوں کے اثرات زائل کرنے کے لئے حلقہ ارباب ذوق وجود میں آیا ترقی پسند ہوں یا حلقہ ارباب ذوق کے وکلا غزل بلکہ تغزل پر ہر دو جانب سے زد پڑی۔ یہ وہ دور تھا جب اصغر، فانی، حسرت اور جگر، ثاقب، یاس، یگانہ، جمیل مظہری اور درجنوں کم اہم غزل گو تغزل کا جادو جگائے ہوئے تھے ۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ مجروح نے اگر جگر سے تربیت حاصل کرنے کے بعد ترقی پسند شاعری نہ شروع کی ہوتی تو وہ جگر ہی کے رنگ کے روایتی شاعر بنتے۔ اس بات میں بہت زیادہ صداقت نہیں ہے۔ ترقی پسند شاعری نے مجروح کو خوش فکر نہیں بنایا بلکہ مجروح نے ترقی پسند شاعری کو سنوارا ہے۔

اسی عصری اور طبقاتی انا نے، اسی مردانی آواز نے، ایمر جنسی کے زمانے میں، جب ترقی پسندوں سے لے کر جدیدیوں تک کی بولتی بند تھی، مجروح سے یہ غزل کہلوائی ۔

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے
موسم کی ہوا اب کہ جنوں خیز بہت ہے

مجروح سنے کون تری تلخ نوائی
گفتار عزیزاں شکر آمیز بہت ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک جن مقاصد کو لے کر چلی تھی ان کی تبلیغ و تشہیر کے لئے خطیبانہ لب ولہجہ درکار تھا۔ غزل کی لطافت ونزاکت اور رمزیت وایمائیت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی مگر مجروح کے مزاج کی کم سخنی نے غزل کو بھی ترقی پسند بنا دیا اور ایسی مسلسل غزلیں کہیں جو غزل کے دائرے میں رہ کر از مطلع تا مقطع ترقی پسند رجحانات کی حامل بلکہ مزدور کا ترانا محسوس ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۹ء میں آرتھر روڈ جیل میں کہی ہوئی غزل جس کا مطلع ہے ۔

آنکل کے میداں میں دور رخی کے خانے سے
کام چل نہیں سکتا اب کسی بہانے سے

عہد انقلاب آیا دور آفتاب آیا
منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے

اب زمیں اگائے گی ہل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے

اہل دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم
اب گہر سبک ہوگا جو کے ایک دانے سے

من چلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے

میں کہ ایک محنت کش میں کہ تیرگی دشمن
صبح نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے

یا ۵۰ء کی یہ غزل ۔

اب اہل درد یہ جینے کا اہتمام کریں
اسے بھلا کہ غم زندگی کا نام کریں

پھر یہ اشعار دیکھئے کہ کہیں بھی مزدور یا کسان کا نام نہیں آتا مگر یہ کیا ان کے متعلق نہیں کہے گئے لہجے کی غنائیت ملاحظہ ہو۔

دست منعم مری محنت کا طلب گار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سر بازار سہی

وہ جس کے گداز محنت سے پرنور شبستاں ہے تیرا
اے شوخ اسی بازو پر تری زلفوں کو پریشاں ہونا ہے

جو مٹی کو مزاج گل عطا کردیں وہ اے واعظ
زمیں سے دور فکر جنت آدم تو کیا کرتے

کہاں بچ کر چلی اے فصل گل مجھ آبلہ پا سے
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

مرے ہاتھ ہیں تو بنوں گا خود میں اب اپنا ساقئی میکدہ
خم غیر سے تو خدا کرے لب جام بھی مرا تر نہ ہو

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے مرزا سلیم بیگ کے کچھ سوالات اور مجروحؔ کے جوابات

مرزا سلیم بیگ:

یہ بتائیے کہ آپ کے خیال میں ادب برائے زندگی ہے یا ادب برائے ادب؟

مجروح سلطان پوری:

بھئی ادب برائے ادب کی بھی اپنی جگہ ایک حیثیت ہے لیکن ادب برائے زندگی کی حیثیت اس لئے کہ جس طرح قواعد ہیں، ان جب تک آپ پوری طرح واقف نہ ہوں، آپ اچھی عبارت نہیں لکھ سکیں گے۔ اسی طرح شاعری اور ادب میں بھی ہے۔ ادب برائے ادب میں ہوتا یہ ہے کہ آدمی ادب پر، زبان پر، اس کی ایکسپریشن پر زور دیتا ہے، بات کا موضوع کیا ہے اس کی اہمیت زیادہ نہیں ہوتی بلکہ طرز بیان کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں طرز بیان بہت اہم ہوتا ہے یعنی ایک تصویر آپ بناتے ہیں، ایک تصویر اجنتا کا آرٹسٹ بناتا ہے، دونوں میں فرق ہے۔ لوگ اس کو دیکھنے جائیں گے ہم آپ بنائیں گے تو کوئی اس کو دیکھنے نہیں جائے گا۔ ایکسپریشن بہت معنی رکھتا ہے۔ لیکن اصل میں یہ سوچنا چاہئے کہ زندگی میں جو کچھ ہے وہ انسان کا خادم ہے۔ اس اشرف المخلوقات کے لئے پیدا ہوا ہے اور یہ اشرف المخلوقات کسی اور کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اب اسے بقول جوش کہ لیجئے بقول علما اور دوسرے لوگوں کے خدا کہ لیجئے یا سپر پاور کہ لیجئے۔ اب اگر ہم کو اچھی شاعری کرنی ہے، تکنیک کے اعتبار سے، وزن اور زبان کے اعتبار سے ہماری بات درست ہونی چاہئے۔ لیکن اب ہماری زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ہم بے نیاز ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنا انسانی فرض پورا نہیں کر رہے ہیں جس حد تک ہوسکتا ہے تو ادب برائے زندگی کا مفہوم یہی ہے کہ اگر آپ کی زندگی عشق کی زندگی ہے اور اس کے علاوہ کچھ اور ہے ہی نہیں تو آپ ضرور عشقیہ شاعری کیجئے لیکن اگر آپ کے اردگرد

کو سمجھایا۔ یہ ہم نے کتابوں میں پڑھا جو ہماری سمجھ میں آیا اور اس طرح چل پڑی ترقی پسند مصنفین کی تحریک۔ طبقات کی شاعری کی تحریک ہے مزدور، محنت کش، مظلوم کی طرف داری، ظالم ایکسپلائٹر سے احتجاج اور ضرورت پڑنے پر اس کو منڈم کرنا۔ لیکن شاعری پہلے ہونا چاہئے، ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کا سوال بعد میں ہونا چاہئے۔ لہٰذا جمالیات جو بنیادی عنصر ہے اس سے غافل نہیں ہونا چاہئے چنانچہ جمالیات کو جس نے زیادہ کامیابی سے برتا ہے ترقی پسندوں میں اس کے یہاں اپیل زیادہ ہے جس کے یہاں کم ہے اس کے یہاں کم ہے۔

مرزا سلیم بیگ:

آپ نے ترقی پسند ادب کے لئے کیا خدمات انجام دی ہیں خصوصاً جدید شاعری میں ؟

مجروؔح سلطان پوری:

صاحب! ترقی پسند ادب کے لئے میں نے، میرا خیال ہے کہ میں نے، جو جہاد کیا ہے وہ شاید کم ہو۔ اس لیے کہ میں تو غزل کا بنیادی طور پر شاعر ہوں ترقی پسندوں کی شاعری میں غزل ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ یہ ایک متفقہ فیصلہ تھا۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ تمام نقاد حضرات کہتے تھے کہ غزل ہمارے ساتھ نہیں چل سکی، تمام نقاد حضرات کا متفقہ فیصلہ تھا، لیکن ہم کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غزل میں کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ غالبؔ کا شعر پڑھتے تھے۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

یا میرؔ کہتے ہیں۔

فائرنگ بھی ہورہی ہے،لوگ بھی مارے جارہے ہیں،بھوکے لوگ بھی ہیں، پریشان لوگ بھی ،یتیم لوگ بھی ،آپ قومی طور پر پسماندہ ہیں اوراس کا احساس آپ کونہیں ہے،تو آپ کواس کا احساس کرنا چاہئے اور جب اس کا احساس آپ کو ہوگا تو وہ جواب برائے زندگی ہے۔وہ زندگی کا خادم ہے ادب۔ادب کی قیمت کیا ہے؟ کسی فن کی کی قیمت ہے؟اس کائنات کی کی قیمت ہے اگر یہ انسان کے لئے نہیں ہے تو اس لئے ادب کواس سے مبرا نہیں سمجھا جا سکتا۔

مرزا سلیم بیگ:

برصغیر میں ترقی پسند ادب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

مجروح سلطان پوری:

ترقی پسند ادب کا بہت بڑا رول ہے۔اصل میں یہ ہوا کہ لکھنؤ تقسیم سے پہلے ڈولپمنٹ کرنے لگا اس لئے کہ جب دلی اجڑ گئی تو دلی کے لوگ بھی لکھنؤ چلے گئے،میرؔ چلے گئے، سوداؔ چلے گئے ،سبھی اس طرف چلے گئے اور لکھنؤ مرکز بن گیا۔لکھنؤ میں شاعری کو درباردار ی اوراپر مڈل کلاس کی چیز بنا کر رکھ دیا گیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موضوعاتی اعتبار سے زیادہ ایکسپریشن اور لفظی بازی گری اور ہلکے پھلکے رومانٹک شعر جن میں بیشتر غزل کی شاعری ہوتی تھی یا پھر مرثیے تھے،تو مرثیے اس وقت آبرو بچائے ہوئے تھے ادب،غزل کا ریوائیول ہوتا ہے حسرتؔ موہانی سے۔حسرتؔ موہانی نے جب ڈکشن بدلا ہے اور بلندی پیدا کی ہے تب جا کر غزل میں نئی آب و ہوا کے آثار پیدا ہوئے اورانھوں نے کچھ سیاسی مضامین بھی پیدا کئے۔پھر ادھر شبلیؔ نے بھی اپنی غزل مثلاً ’’چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک‘‘ تو یہ سیاسی مضامین جو ہیں یا پھر اقبالؔ سہیلؔ اس وقت تھے وہ بہت مشہور تھے سیاسی غزلوں کے بارے میں،کبھی تو غزل کے ڈھانچے میں ڈھال کر ایسا کہتے تھے،انگریزوں پر کہا۔

چشمک کرے مجھ سے یہ ایسی کہاں کی ہے
بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے

یعنی میری روٹی پر پل کر ہم سے ہی اکڑتے ہو، تو اس قسم کی فیلنگ ہمارے بزرگوں نے دینا شروع کر دی تھی۔ اس سے منشی پریم چند ادھر ڈاکٹر اقبال صاحب اور عبدالحلیم شرر نے مسلمانوں کے ہیروز اور ترکستان میں جو زوال آیا تھا اس پر ناول لکھنا شروع کئے۔ ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت اس وقت بھی خالص رومانٹک نہیں تھی بلکہ مقصدی تھی۔ تو یہ چیزیں بنیاد رہتی ہیں اور ۱۹۳۶ء میں یہ ہوا، باہر سے کچھ لوگ آئے، وہاں کے ادیبوں کو پڑھا، گورکی کو پڑھا، دوستوفسکی کو پڑھا، فرانس کے روسو اور دوسرے لوگوں کو۔ پھر یہ سب جو ادب سامنے آیا تا یہ دھیان آیا کہ بھئی ایک ایسی موومنٹ ہونا چاہئے ذہنی جو لوگوں کو انگریزوں کے خلاف تیار کرے، جو ہوئی۔ انگریز کے چلے جانے کے بعد ہمارا طبقاتی مسئلہ پیدا ہوا، ترقی پسند مصنفین نے طبقاتی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مارکس کی فلاسفی کو اپنایا۔ مارکس کی فلاسفی کی بنیاد چونکہ مادیت پر ہے اس لئے اس میں اس جھگڑے میں نہیں پڑتا کہ خدا ہی کہ نہیں؟ عام طور پر تو خدا کے وجود سے ہی انکار کر دیتے ہیں کہ بھئی ہم اس چکر میں نہیں پڑتے، خدا ودا کچھ نہیں ہے۔ مادہ ہے اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن ترقی پسند بننے کے لئے اس فارمولے کو ماننا ضروری نہیں ہے مگر اس زمانے میں مانا گیا نئے نئے تھے نا! وہ کہتے ہیں نہ کہ نیا مسلمان قصائی کے گھر لے لیتا ہے، وہ نئے نئے تھے تو صاحب! ہم خدا کو بھی نہیں مانتے اور کیا ہے؟ کچھ نہیں ہے! ہم بھی اس سے گذرے ہیں، پھر اس کو بنیاد بنایا کمیونسٹ پارٹی نے جس میں طبقات نہیں ہوتے۔ سوشلسٹ سماج نے اس وقت کی حکومت

ہاتھ دامن پہ ترے مارتے نہ جھنجھلا کے ہم
اپنے جامے میں اگر آج گریباں ہوتا

نہ مل میؔر اب کے امیروں سے تو
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

یا مصحفیؔ کہتے ہیں۔

ہے عجب زمانہ جس میں ہیں بزرگ خرد جتنے
انھیں فرض ہو گیا ہے گلۂ حیات کرنا

تو یہ چیزیں ہمارے سامنے آتی تھیں، پھر اقبؔال کی شاعری تھی۔ پھر بعض بعض اشعار جگؔر صاحب کے بھی ایسے نکل آتے تھے، تو ہم کہتے تھے کہ اس میں کہا کیا جا سکتا ہے، بالکل کہا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا میں تو غزل کہوں گا اور غزل میں آپ کو قائل کروں گا تو یہ ہوا کہ انھوں نے روکا تو نہیں مگر نظم والے کی طرح ہم کو کبھی اچھالا نہیں۔ اچھا چونکہ میرے سامنے ترقی پسند غزل کی کوئی بنی بنائی روایت نہیں تھی، اس لیے مجھ سے غلطیاں بھی بہت ہئیں۔ اب جو اس تحریک کو مطعون کرنا چاہتے تھے، تو جگر صاحب جو

میرے بہت مربی تھے رشید احمد صدیقی صاحب، یہ سب ناراض ہو گئے۔ ان کے ناراض ہو جانے کی وجہ سے ان کا پورا حلقہ ناراض ہو گیا، جس کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی، اور ترقی پسندوں کو نشانہ بنانے کے لئے مجھے زیادہ نشانہ بنایا گیا۔ میرے برے اشعار پر کہا گیا کہ یہ ہیں ترقی پسند اشعار... یوں ہو رہی ہے غزل کی تباہی... اچھے اشعار کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا۔ تو اب میں غزل والوں میں مطعون ٹھہرا۔ جن میں گیا انھوں نے کہا غزل شاعری ہی نہیں ہے۔ ان میں رہ کر میں نے جناب ۱۹۴۶ء سے لے کر اس وقت تک تنہا غزل کہی، اور تھے ہمارے ساتھ مگر یہ کہ میں سب سے نمایا تھا۔ جب آئے تھے ''دست صبا'' لے کر فیض احمد فیض اپنے سیاسی رنگ میں، فیض کے آنے کے بعد چونکہ ان کے ہاں جو حالات تھے جو بقول ثاقب۔

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

مرے اشعار ان کی نظر میں تھے۔ میں نے اپنی کتاب بھی انھیں بھیجی تھی جیل میں۔ وہ یہاں جیل میں تھے ہم وہاں جیل میں تھے ہندوستان میں، تو ان کی نظر میں تھا میں مری اغلاط بھی تھیں، مگر اغلاط انھوں نے نہیں دہرائیں جیسے ''مزدور کا گدشت'' وغیرہ پہلے کہ گئے نا، مگر وہ غلطی ان سے دوبارہ غزلوں میں ظاہر نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس میں کچھ ان کی سلاست روی بھی۔ یہ تو نہیں ہے کہ صرف میری غلطیوں سے ان کو فاعدہ ہوا ہے۔ بہر حال وہ جو غزل لے کر آئے تھے تو غزل کو ایک اعتبار ملا۔ ان سے پہلے غزل کو اعتبار نہیں ملا تھا صرف توقع تھی۔ میری غزلیں جب سنیں گئیں تو پروفیسر احتشام

ہمارے بہت بڑے نقاد تھے انھوں نے پہلی بار لکھا کہ بھئی غزل سے ہم کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر رشید احمد صدیقی نے پہلی بار لکھا ''فیض غزلیں بہت اچھی کہتے ہیں، ان کو جاری رہنا چاہیے۔''

ندیم صدیقی اور رفیع نیازی کے کچھ سوال اور مجروح سلطان پوری کے جوابات

ندیم صدیقی:

آپ ترقی پسند تحریک سے کیوں کر وابستہ ہوئے؟

مجروح سلطان پوری:

میں جن شعرا سے متاثر تھا وہ سب کے سب ترقی پسند تھے اس لئے غیر شعوری طور پر اس تحریک سے وابستہ ہوا۔ ہاں بعد میں جب ترقی پسند مصنفین میں گیا اور وہاں مجھے کتابیں ملیں اور میں نے انھیں پڑھا تب میں ذہنی و شعوری طور پر اس سے متاثر ہوا۔

ندیم صدیقی:

ترقی پسندی آپ کے نزدیک کیا ہے۔ اور ترقی پسندی کو کمیونسٹ تحریک سے وابستہ کرنا کہاں تک ٹھیک ہے؟

مجروح سلطان پوری:

ترقی پسندی کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ اگر انسان مظلوم ہے تو اس کی حمایت کی جائے۔ اسے میں قطعاً غلط سمجھتا ہوں کہ ترقی پسندی کو کمیونسٹ تحریک سے وابستہ کر دیا جائے۔ اب ترقی پسندی کو جو لوگ تحریک کہتے ہیں ان سے میں کہتا ہوں ''تحریک تو جب تھی۔ اب تو یہ ایک رویہ ہے۔'' ترقی پسندی سے عداوت کا سارا غبار میرے ان اشعار کو نشانہ بنا کر نکالا گیا، جنھیں میں نے اگر چہ اپنے

مجموعہ میں تو شامل کر رکھا ہے مگر اپنی غزل کے نمائندہ اشعار نہیں سمجھتا۔ بلکہ ان میں بعض تو ایسے ہیں جو غزل کے سانچے میں پوری طرح فٹ بھی نہیں ہوتے مثلاً ؎

آ نکل کے میداں میں دو رخی کے خانے سے
کام چل نہیں سکتا اب کسی بہانے سے

اب زمین گائے گی ہل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے

آنے دے باغ کے غدار مرا روز حساب
مانگے تنکا نہ ملے گا یہی گلزار سہی

رفیع نیازی:

آپ کے یہ سارے اشعار تو موضوعاتی ہیں۔ ایسے بعض اشعار کا ذکر کیجئے جو آپ کے نزدیک ترقی پسند ہوں مگر حسن و عشق سے متعلق ہوں۔

مجروحؔ سلطان پوری:

بات میری شاعری پر ضرورت سے زیادہ مرکوز ہو چکی ہے۔ اس لئے پہلے تو میں اسی شعر کا ذکر

کروں گا جو بارہا کہتا رہا ہوں جس میں یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ ترقی پسند غزل کا محبوب ہمارے اسلاف کی طرح منزل نہیں بلکہ رفیق منزل ہے۔

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

یا ایک انقلابی کا عاشقانہ رویہ یا اس کے برعکس کہ لیجئے ؎

نہ ہم قفس میں رکے مثل بوئے گل صیاد
نہ ہم مثال صبا حلقۂ رسن میں رہے

کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے
ہوئے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

یا ؎

یہی ہے جی میں کہ وہ رفتۂ تغافل ناز
کہیں ملے تو وہی قصۂ وفا کہئے

''مشعل جاں'' کے مختصر پیش لفظ ''گفتنی ناگفتنی'' کے پونے تین صفحوں میں مجروحؔ نے بہت کچھ کہہ دیا ہے، اتنا کچھ جس کو بیان کرنے کے لیے دفتر درکار ہوتا ہے۔ اس میں اردو کی مظلومی کا نوحہ بھی ہے اور اپنی دلدوز ناقدری کا گلہ بھی، ترقی پسند غزل کی ابتدا کی روداد بھی ہے۔ آخر الذکر کو تذکرہ مجروحؔ کی زبان سے سنیے:

''ترقی پسند غزل کی واضح ابتدا میں نے ۱۹۴۵ میں کی، جب سیاسی مضامین غزل والوں میں مقہور اور خود غزل ترقی پسندوں میں مردود قرار دی جا چکی تھی۔ اس تنہائی اور بے بسی کے عالم میں بس ایک یقین میرا رہبر تھا کہ غزل میں اپنے عہد کے کس موضوع کو کب خوبی سے بیان نہیں کیا گیا جو آج نہیں بیان کیا جا سکتا؟ وحرف برہنہ جو نظم کا امتیاز ہے اس دور کے ترقی پسندوں میں سمجھا جاتا تھا غزل اتنی ننگی کبھی نہیں رہی، کہ اس کی بنیاد ہی رمز و کنایے پر ہے۔ اشاریت ہی تو اس کا ملبوس ہے۔ تب سے یہ سنگباری آج تک جاری ہے، میری خوبیوں کو نظر انداز کر کے صرف چند خامیوں کو میرا معیارِ فن ٹھہرایا گیا گو اس ہنگامۂ دار و گیر کے باوجود میرا یقین ایک ملحے کو متزلزل نہیں ہوا اور میں نے اور میرے ساتھیوں نے ترقی پسند ادب کو ایک تازہ روایت کی

حیثیت دے کر ہی دم لیا۔ البتہ رہی میری کم گوئی تو شاید یہ یاروں کی کم نگہی و سرد مہری کا ردعمل ہو... البتہ وقت کی یہ ستم ظریفی ضرور ہے کہ (میرے) کئی اشعار دوسروں کے نام سے جانے جاتے ہیں ، میری تراشیدہ تراکیب لفظی کو دوسرو ں کا مال سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اہل نظر کی بے بصری کا علاج میرے پاس اس کے سوا اور نہ رہا کہ میں آپ اپنی ملکیت کا اعلان کروں مگر میرے اس مجبور رویے کو خود ستائی سے تعبیر کیا جانے لگا تو میں نے اس محاذ پر بھی خاموشی اختیار کر لی ۔ گویا چپ رہوں تو مغضوب اور کچھ بولوں تو مغضوب...اب رہا نفس غزل کی اپنی حیثیت اور میری محبوبہ بننے کا سوال تو بزرگوں نے تو کمال فن اسی کو تسلیم کیا ہے کہ خوبی کے ساتھ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی بیان کر دیے جائیں ۔ میری تنہائی روی نے حق تلفیوں کا زہر اس قدر پیا ہے... "(۱)'

اشتراکی نظام سے مجروحؔ کی وابستگی اس کلام سے ظاہر ہے۔

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروحؔ
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

(۱) گلکاری وحشت کا شاعر مجروح سلطانپوری مرتب: خلیق انجم ص ۲۰۳

مجروحؔ اس انقلابی برادری کے ہم سفر اور ہم صفیر ہیں جس نے اس خطۂ ارض کے ہر گوشے میں انسانی عظمت کے لیے جدو جہد کی اور اس کے ترانے گائے۔ اس قبیلے کے ہر فرد نے اپنی عمر عزیز کے کئی سال جیل کی سلاخوں کی نزر کر دیے اور دار و رسن کے سائے میں محبت کے گیت لکھے۔ ترکی میں ناظم حکمت۔ چلی میں پابلو نرواد، اسپین میں لورکا، انگلستان میں کالڈویل اور رالف فاکس جنھوں نے ہسپانوی خانہ جنگی میں اپنی جانیں گنوائیں۔ فرانس میں لوئی اراگان اور پال ایلوا، فلسطین میں محمود درویش اور دوسرے عرب شاعر اور افریقہ کے سیاہ فام شاعر۔ اس کہکشاں کے چند درخشاں ستارے ہیں۔ یہ سب کے سب عہد جدید کے انسان کا ضمیر ہیں جو جغرافیائی حدود کی بنا پر کسی مخصوص علاقے کے باشندے ہیں لیکن ہیں سب کے سب ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے موتی۔

اردو میں مجروحؔ کے ہمعصروں میں فیضؔ مجازؔ، مخدومؔ، جذبیؔ، جاں نثار اخترؔ، کیفی اعظمی، ساحرؔ لدھیانوی، حمایت علی شاعرؔ، نیازؔ حیدر، حبیب جالبؔ اور احمد فرازؔ کے نام ان شاعروں میں سے چند نام ہیں جنھیں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ لوگ نہ صرف جدید ترقی پسند شاعری کے علمبردار ہیں بلکہ آپس میں ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے رفیق بھی ہیں اور رقیب بھی جو شعر و سخن کی لڑائی لڑتے ہیں۔ وہ لڑائی نہیں لڑتے جس میں جابروں اور ستمگروں کی منفعت کے لئے معصوموں کا خون بہایا جاتا ہے۔

آنند کمار سوامی نے اپنی کتاب میں فن، خوبصورتی اور افادیت کی یکجائی اور ان کے موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ حالی، شبلی، اقبال اور جوش بھی اسی نظریے کے حامی تھے۔ مجروح نے اپنی غزل میں اس روش کی ترویج کی اور ان کی غزل نئے ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے آراستہ ہوگئی۔

مجروح ترقی پسند تحریک کے نظریات کو غزل میں پیش کرنے کا تجربہ کرنا چاہا مگر اس میں وہ ناکام رہے۔ جب کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر ترقی پسند تحریک بھی انتہا پسندی کا شکار ہونے لگی غزل تو پہلے

ہی ترقی پسندوں کے ہاں معتوب تھی جس کے خلاف مجروحؔ تحریک سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی اپنے ادبی نقطۂ نظر پر جمے رہے۔ مگر انتہا پسندی کے دور میں ان کی غزل بھی نعرے بازی کی زد میں آ گئی جسے خود انھوں نے قبول کیا ہے۔ وہ قید بھی کیے گئے اور یہ پورا دور ترقی پسندی کا وہی دور ہے جسے ہماری تنقید نے بہ آسانی ترقی پسندی کی پوری تحریک پر نافذ کر دیا جو ایک دوسرے قسم کی انتہا پسندی کا نتیجہ تھا۔ اس دور میں ادب اور نظریہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم قرار دیے گئے اور نظریہ کی تعریف بھی کچھ یہی ٹھہری کہ مارکسزم کا وہ روپ جو کمیونسٹ پارٹی سرکاری طور پر وقتاً فوقتاً منظور کرے وہی اصل مارکسزم ہے۔ اس کا اثر پوری کمیونسٹ تحریک پر جو ہوا سو ہوا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اس دور میں ادب کو خاصا نقصان پہنچا۔ مجروحؔ کی غزل کا رنگ کچھ ایسا بدلا کہ جس پر بعد میں وہ خود بھی نادم ہوئے۔

مجروحؔ کے اس دور کے متعدد اشعار برعظیم کے اردو والوں کی یادداشت میں سما چکے ہیں اور ترقی پسندی کے لیے مایۂ افتخار ہیں۔ مثلاً:

یہ کوئے یار یہ زنداں یہ فرش میخانہ
انھیں ہم اہل تمنا کا نقش پا کہیے

وہ ایک بات ہے کہیے اسے طلوع نشاط
کہ تابش بدن و شعلۂ حنا کہیے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

لوگوں مری گل کاری و حشت کا صلہ کیا
دیوانے کو ایک حرف دل آویز بہت ہے

وہ تو کہیں ہیں اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہ یار کی طرح

اس طرح سے کچھ رات کو ٹوٹے ہیں ستارے
جیسے وہ تری لغزش پا دیکھ رہے ہیں

روک سکتا ہمیں زندان بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

رشید احمد صدیقی کا ایک مضمون ''جدید غزل'' کے عنوان سے ''فکر ونظر'' علی گڑھ کے پہلے شمارے (۱۹۵۴ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں رشید احمد صدیقی نے اور باتوں کے علاوہ لکھا تھا:

> جہاں کہیں یہ (مجروح) غزل کے آداب سے انحراف کرتے ہیں، مضحکہ خیز حد تک بے سرے ہو جاتے ہیں۔ یوں مجروح کی غزلیں بڑی دل آویز ہوتی ہیں اور ایک زمانے میں مجھے اس خیال سے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ آگے چل کر وہ غزل گویوں میں بڑا اونچا مقام پیدا کریں گے لیکن ترقی پسند حلقے میں پہنچ کر وہ غالب کے اس شعر کو فراموش کر گئے:

پیمانہ بر آں رند حرام است کہ غالبؔ !
در بے خودی اندازۂ گفتار نہ داند

رشید صاحب نے کیا غلط کہا تھا! مجروح بھٹک گئے تھے اور ''ترقی پسندی کی بے خودی'' میں انھیں اپنے طرز اظہار اور ''گفتار کا اندازہ'' نہیں رہ گیا تھا، ورنہ وہ اس طرح کی غزلیں کیوں کہتے؟

لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا

یا

کامن ویلتھ کا داس یہ نہرو اور تباہی لانے نہ پائے

مجروح صاحب کی برہمی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے رشید صاحب کو ''دوست نما دشمن'' قرار دیا۔ ''سہیل'' میں شائع شدہ ان کے خط کے یہ جملے دیکھیے۔

اپنے ان دوست نما دشمنوں سے بھی آگاہ رہنے کی ضرورت ہے جو ہماری غلطیوں میں ہماری خوبیوں کو بھی سان دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماہنامہ ''فکر و نظر'' میں ...محترم بزرگ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے میرے شاعری کے صرف چند کمزور پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ساری ترقی پسند تحریک کو لے ڈالا ہے...حالاں کہ میں نے ہر شعر برا نہیں کہا ہے۔

مجروح غالباً فیض کے علاوہ واحد ترقی پسند شاعر ہیں جن پر شمس الرحمٰن فاروقی نے با قاعدہ مضمون لکھا اور وہ بھی تحسینی نوعیت کا، ورنہ وہ عام طور پر ترقی پسندوں کے سلسلے میں اندھا می کاروائی ہی کرتے رہے ہیں۔ فاروقی نے یہ مضمون محبت سے لکھا ہے اور میں ان سے متفق ہوں کہ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی بنا پر مجروح کو شہرت ملی، اس کی قیمت سے زیادہ قدر و قیمت کے حامل شعر کہ کر انھوں نے ترقی پسند غزل کی توقیر بڑھائی۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ مجروح کی شہرت بہر حال ترقی پسند تحریک کی مرہون منت ہے۔ ترقی پسندوں اور ان کی انجمن کی قربت سے پہلے مجروح کو کوئی ادبی اعتبار

حاصل نہیں تھا کہ اور قیاس ہے کہ اس کے بغیر اگر کوئی اعتبار حاصل ہوتا تو وہی جو شکیل بدایونی اور راز مراد آبادی کو حاصل ہوا، یا زیادہ سے زیادہ خمار بارہ بنکوی کو۔

مجروحؔ کی بہترین غزلوں میں کلاسیکی غزل کی تمکنت اور آہنگ کی بلندی ہے۔ جس کی وجہ شاید ترقی پسند فکر سے وابستگی ہے اور اس کے بعد ان کے یہاں جوش و ولولہ، کچھ کر جانے کی آرزو اور زندگی کی خاطر موت سے لطف اندوز ہونے کا جو تاثر نظر آتا ہے وہ انہیں تمام معاصر غزلوں گویوں میں ممتاز کرتا ہے۔

جگائیں ہم سفروں کو جلائیں مشعل شوق
نہ جانے کب ہو سحر کون انتظار کرے

مثال ملتی ہے کتنوں کی اس دیوانے سے
چمن سے دور جو بیٹھا غم بہار کرے

سیر حاصل کر چکے اے موج ساحل سر نہ مار
تجھ سے کیا بہلیں گے طوفانوں کے بہلائے ہوئے

ہے یہی اک کاروبار نغمہ و مستی کہ ہم
یا زمین پر یا سر افلاک ہیں چھائے ہوئے

اکتا کے ہم نے توڑی تھی زنجیر نام و ننگ
اب تک فضا میں ہے وہی جھنکار دیکھیے

ترقی پسند تحریک کا جوہر جوان کے افکار میں رچا بسا تھا وہ بہترین اشعار کی صورت میں جلوہ گر ہوتا رہا اور یہی تمام چیزیں ان کی شاعری کی پہچان بن گئیں۔

ہم کو جنوں کیا سکھاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کیے ہیں ہم نے عزیزو چار گریباں تم سے زیادہ

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

بہہ کر زمیں پہ ہے ابھی گردش میں خوں مرا
قطرے وہ پھول بنتے ہیں خاک وطن کے ساتھ

کس نے کہا کہ ٹوٹ گیا خنجر فرنگ
سینے پہ زخم نو بھی ہے داغ کہن کے ساتھ

اقبال کی غزل گوئی میں ترقی پسندی کے معنی اس حقیقی ترقی پسندی کے ہیں جو لفظ ترقی سے مستعار ہے۔لیکن جدید اردو ادب میں اس کا مفہوم اشتراکیت پسندی تک محدود ہو گیا ہے۔ یہ یقیناً لفظ کا غلط استعمال ہے مگر چونکہ رائج ہو چکا ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے نام سے جو مکتب فکر سامنے آیا وہ اتفاق سے اشتراکی ہی ثابت ہوا، حالاں کہ تیسری دہائی کے اواخر میں جب تحریک کا آغاز ہوا تھا اس کا مفہوم زیادہ وسیع تھا اور وہ شاید اس لئے تھا کہ حقیقی ترقی پسندی کا کامل ترین نمونۂ فن اقبال اپنی عظیم شاعری میں پہلے ہی پیش کر چکے تھے اور اس کے اثرات فضا پر طاری تھے۔ بہر حال، مجروح نے غزل گوئی کا آغاز اشتراکیت پسندی کے خیالات سے کیا اور کافی عرصے تک وہ انھیں اپنی شاعری میں پیش کرتے رہے ۔

غلام رہ چکے توڑیں یہ بند رسوائی
کچھ اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں

دست منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سر بازار سہی

اب زمین گائے گی حل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے

ترقی پسند ادب میں غزل بے مایہ صنف تھی ۔ اس کا اندازہ ۱۹۵۱ء کے رسالہ ''شاہراہ'' کی فائل سے ہوسکتا ہے ۔ تمام سال میں ۴۰۰ اصفحات پر انقلاب زندہ باد کی ۶۸ نظمیں شائع ہوئی ہیں اور ساڑے چودہ صفحوں پر ۲۷ غزلوں کو بے حرمت کیا گیا ہے ۔ ترقی پسندی کی بہترین انتخاب ۴۸ء میں بھی ۲۴ طویل نظمیں اور ۴ امختصر غزلیں اس تحریک کی صحت مندی کا ثبوط ہیں ۔

مجروح کو ترقی پسند ادب میں یہ اہمیت اس وجہ سے ملی تھی کہ وہ ان دنوں ایسے شعر بھی کہتے تھے ۔

ہشیار سامراج کہ زنجیر ایشیا
ٹوٹے گی تیرے سلسلۂ جان و تن کے ساتھ

شاہراہ ۵۱ء

جبیں پر تاج زر پہلو میں زنداں بینک چھاتی پر
اٹھے گا بے کفن اب یہ جنازہ ہم بھی دیکھیں گے

۵۰ء

مجروحؔ سلطان پوری ترقی پسند غزل کے سب سے معتبر غزل گو ہیں یہ بات الگ ہے کہ ترقی پسند غزل ، ایک وقت صداقت کی جیتی جاگتی غزل تھی جو ۱۹۳۵ء سے ۶۰ء تک کے درس و تدریس کا نصاب بن کر کتابوں میں محفوظ رہے گی ۔ ترقی پسند عناصر انسان کو ہر حال میں سرگرداں اور متحرک جمالیات سے قریب رکھتے ہیں ان میں زندگی گذارنے اور زندہ رہنے کے حوصلوں کو بلند کرتے ہیں ۔

جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

ملی جب ان سے نظر بس رہا تھا اک جہاں
ہٹی نگاہ تو چاروں طرف تھے ویرانے

ہمدرد نہیں ملتا پھر آئے جہاں بھر میں
موتی کی طرح پیاسے روتے ہیں سمندر میں

بہت سے ترقی پسند شاعر یا ادیب حالات کے آگے کھیلتے نظر آتے ہیں خاص کر معیشت کے معاملے میں اور بعض کی انا اس میں خم پیدا نہیں ہونے دیتی مجروح بھی ایسے ہی شاعر ہیں جن میں انقلابی حوصلہ ہے اور یہ انھیں استقلال کرتا ہے اور اسی وجہ سے مجروح کے لہجے مین جس تجربے کا بیان ہے وہ تیکھا ہے۔

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لیے
ہم ایک بار تیری آرزو بھی کھودیتے

غزل کے میدان میں انھوں نے وہ سب کچھ کیا ہے جس کے لیے بعض ترقی پسند شعرا صرف نظم کا پیرایہ ضروری اور ناگزیر سمجھتے ہیں۔ صحیح طور پر انھوں نے غزل کے نئے شیشے میں ایک نئی شراب بھر دی ہے۔'' نئے شیشے اور نئی شراب لیکن کھردرا اور سپاٹ پن نہیں بلکہ وہی تغزل اور سرشاری جو غزل کے لیے لازم اور اس کی جان ہے۔ ایسے چند اشعار ملاحظہ ہوں، کیسے بانکے اور طرحدار ہیں:

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

روک سکتا ہمیں زندان بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

لٹ گیا قافلہ اہل جنوں بھی شاید
لوگ ہاتھوں میں لیے تار رسن جاتے ہیں

انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی کی بنا پر وہ اپنے ترقی پسند احباب کو اچھا خاصا وقت دیتے تھے۔ اکثر اس تحریک کے بانی اور سرگرم نمایاں کارکن تو مجروحؔ کے گھر آجاتے یا انھیں اپنے یہاں بلاتے رہتے۔ سجادؔ ظہیر (بنے بھائی) سبط حسن، ڈاکٹر ملک راج آنند، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، کرشن چندر، ساحرؔ لدھیانوی، جاں نثار اخترؔ، نیاز حیدر، معین احسن جذبی، اسرار الحق مجازؔ، فیض احمد فیضؔ، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر احتشام حسین، آل احمد سرور، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، مہندر ناتھ، نازشؔ پرتاپ گڑھی، سبھی کا آنا جانا تھا۔ ایک طرف یہ نیم سیاسی اور نیم ادبی مشاغل دوسری طرف ڈائرکٹر اے۔ آر۔ کاردار نے مجروحؔ کو فلم کی راہ دکھائی اور اپنے استاد معنوی سینئر شاعر حضرت جگر مراد آبادی کی صلاح پر وہ گیت کاری کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے اور باوجود انتہائی خوددار و وضع دار ہونے کے مجروحؔ کو کہنا پڑا:

ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

مجروحؔ ترقی پسند تھے۔ وہ روس اور چین کے طرز حکومت کے قدرداں بھی تھے اور ان دونوں ممالک کی تعریف وتوصیف بھی کر چکے تھے۔ لیکن جب اپنے وطن پر آنچ آتے دیکھی اور پڑوسی ملک چین کی پیماں شکنی کا مشاہدہ کیا تو ان کی حق گوئی اور وطن دوستی ان کے اشعار میں جھلکنے لگی۔ ملاحظہ فرمائیے کہ بے شک بیان شاعرانہ ہے لیکن لب ولہجہ میں کتنی تندی، تلخی، طنز اور جارجیت پوشیدہ ہے۔

دشت پر خوں کو کفِ نگاراں سمجھے
قتل گہہ تھی جسے ہم محفلِ یاراں سمجھے

کچھ بھی دامن میں نہیں خارِ ملامت کے سوا
اے جنوں ہم بھی کسے کوئے بہاراں سمجھے

ہاں وہ بے درد تو بے گانہ ہی اچھا یارو
جو نہ توقیرِ غمِ درد گساراں سمجھے

خندہ زن اس پر رہے حلقۂ زنجیرِ جنوں
جو نہ کچھ منزلتِ سلسلہ داراں سمجھے

توڑ دیں ہم جو نہ تلوار تو کہئے مجروحؔ
تیغ زن کیا ہنر زخم شعاراں سمجھے

ترقی پسندی نے جاتے جاتے اپنے جھنڈا باز شعرا و ادبا کی رائلٹی بھر پور شہرت اور جا و بے جا انعامات کی شکل میں ادا کر دئے۔ اس میں مجروح کے حصہ میں کچھ کم آیا کہ وہ استحصال پسند اور سرکاری پٹھو نہیں تھے۔ کچھ بے چاروں نے مرنے میں اتنی جلدی کی کہ ان کے نصیب میں اتنا بھی نہیں آیا جتنا مجروح کو ملا۔ کسی موقع پر مجروح نے ترقی پسند تغزل کے سلسلے میں کہا تھا۔

''ترقی پسندانہ تغزل ترقی پسند شاعری بلکہ ادب کے دائرے سے باہر کی چیز تو نہیں ہے بلکہ جو ذمہ داریاں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے دوسری اصناف ادب کے سلسلے میں لے رکھی تھیں تقریباً وہ ذمہ داری اس شاعر کی بھی جو ترقی پسند غزل لکھ رہا ہے...(ترقی پسندانہ خیالات اگر نظم میں آ رہا ہے تو نظم کے صنفی لوازمات کے ساتھ آنا چاہئے اور اگر غزل میں ہے تو غزل کی ایمائیت

اور استعاراتی درو بست کے ساتھ۔ترقی پسند تغزل
اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عصری احساس کا غزل
کی روایت میں سمو کر اظہار کیا جائے۔کوئی ایسا
موضوع کوئی ایسا جذبہ یا احساس نہیں ہے جو ترقی
پسند غزل میں نہ آیا ہو۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ فرماتے ہیں:

''جہاں تک مجروح کی ترقی پسندی کا سوال ہے تو یہ جماعتی نوعیت کی تھی ،ان کی اپنی ذاتی فکر کا بہت کم دخل تھا۔وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔سوال یہ ہے کہ مارکس کو انھوں نے کتنا پڑھا اور کتنا سمجھا لیکن اس سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے کہ انسان دوستی ،سماجی انصاف اور عوام کی تڑپ ان کی شاعری میں پوری طرح موجود ہے۔ان کا کینوس بھی زیادہ وسیع نہیں اور سرمایا بھی زیادہ نہیں ،ایک ہی مجموعہ بار بار شائع ہوتا رہا جس میں زندگی بھر چند اشعار کا ہی وہ اضافہ کر سکے۔اتنے قلیل شعری اساسہ پر ایسی ہمہ گیر شہرت کی بنیاد آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں لیکن یہ اعجاز ہے اس جادو کا جو شعری زبان جگاتی ہے۔مجروح کی غزل میں ایسی تڑپ ،ایسا رچاؤ اور ایسا جمالیاتی وفور ہے کہ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کا درجہ اختیار کر گئے۔'' (۱)

(۱) گلکاریِ وحشت کا شاعر: مجروح سلطانپوری مرتب خلیق انجم ص ۳۶۹

اردو شاعری میں مولانا حالی کی تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک (۱۹۳۶ء) میں دوسری طاقت ور تحریک تھی جو بہت ہی منظّم اور جاندار ثابت ہوئی۔ اس تحریک نے بڑی سرعت کے ساتھ پریم چند، مولوی عبدالحق، اقبال، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، فراق گورکھپوری اور علی سردار جعفری جیسی دیوقامت ہستیوں کو متاثر کیا۔ مولانا حالی اور محمد حسین آزاد نے غزل گوئی سے گریز کرتے ہوئے نظم گوئی کو ترویج کو عصری تقاضا قرار دیا۔ ان کے بعد ترقی پسندوں نے ترک غزل کو اس لیے ضروری گردانا کہ غزل عیش پرستانہ، زوال آمادہ جاگیردارانہ سماج کی ترجمان ہے، غزل فارغ البال طبقے کی مقیم اور فاسد رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ خانقاہوں میں پرورش پانے والی شکست خوردہ ذہنیت کے سبب دنیا کی بے ثباتی کے راگ مصنوعی رومانیت، عاشقانہ جذبات اور جنسی ترغیبات ہی کو غزل کے موضوعات اور رنگ تغزل سمجھا گیا۔ اس طرح غزل فرار اور انحطاط کی نمائندہ ہو کر رہ گئی۔ خاص طور پر ترقی پسندوں نے غزل کو شجر ممنوعہ سمجھا اور شعوری طور پر ترک غزل کو وطیرہ بنا کر نظم ہی کو وسیلۂ اظہار بنالیا۔

۱۹۴۰ کے آس پاس نظم معرّی اور آزاد نظم کے فارم کو برتنے کی شعوری کوشش ہونے لگیں۔ ۱۹۴۰ سے ۱۹۵۰ کا دور غزل سے گریز کا دور رہا۔ غزل نیم وحشی صنف قرار دی گئی۔ حالی، آزاد، عبدالحلیم شرر اور اسماعیل میرٹھی کے بعد نظیر اکبرآبادی، اقبال اور جوش کی نظمیہ شاعری نے اردو ادب کو غزل کے بغیر ایک نئی فکر اور تجربے سے روشناس کیا۔ نظم گوئی کے تیسرے دور میں میرا جی، ن م راشد اور فیض نے نظم کو ایک طاقت ور صنف شاعری کا درجہ عطا کیا۔ پھر علی سردار جعفری، مجاز، کیفی اعظمی، اختر الایمان، مخدوم اور عمیق حنفی نے نظم کے میدان میں بے پناہ محاسن اور اثر آفرینی کے امکانات کو یقینی بنایا۔ ترقی پسندوں کی صفوں میں فیض، مخدوم اور جاں نثار اختر نے غزل کو شجر ممنوعہ بالکل نہیں سمجھا کہ ان

کا یہ ایقان غزل کی آفرینی اور جامعیت پر برقرار تھا۔ نظم گوئی کے دور میں اپنے بھرپور کلاسکی مزاج اور روایت کے احترام کے حامی غزل گوشعرا میں حسرت موہانی ، یاس یگانہ چنگیزی ، اصغر گونڈوی ، فانی بدایونی ، اثر لکھنوی ، جگر مراد آبادی ، فراق گورکھپوری اور مجروح سلطان پوری کا عقیدہ غزل کی اثر پزیری اور جامعیت کے سلسلے میں کبھی کمزور نہیں ہوا۔

☆☆☆

باب چهارم

مجروحؔ کی غزل گوئی

مجروحؔ سلطان پوری کی غزل گوئی

پروفیسر علی احمد فاطمی کے مطابق:

''ابتدا مجروح نے بھی عشقیہ شاعری کی ۔روایتی کلاسکی رنگ میں ڈوبی ہوئی شاعری ، تشبیہ و استعارے سے سجی ہوئی شاعری لیکن رفتہ رفتہ یہ سجاوٹ صرف حرف ولفظ کی نہیں رہ گئی بلکہ اس میں تہذیب و شائستگی ،تہداری اور وضع داری کا رنگ ابھرنے لگا۔ وہ رنگ جوان دنوں شرفا کا تھا اوراس سے زیادہ مجروح کا اپنا۔ کچھ اس عہد کے اساتذہ مثلاً حسرت ، اصغر ، فراق نے تہذیب عاشقی کے آداب مرتب کر رکھے تھے ۔ کچھ پریم چند نے بھی حسن کے معیار کی بات اٹھا رکھی تھی (۱)۔جگر کا یہ شعر بھی مشہور ہو چکا تھا:

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل

(۱) تین ترقی شاعر شاعر مصنف پروفیسر علی احمد فاطمی ص ۶۹

شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل"

پروفیسر محمد حسن رقمطراز ہیں:

''مجروح سلطانپوری غزل کے قتیل ہیں۔حق یہ ہے کہ دور
حاضر میں ان جیسا سجیلا اور طرح دار غزل گو نایاب ہے
۔انھوں نے غزل کو سیاسی رمزیت ہی نہیں ترقی پسند
حیثیت سے روشناس کیا، دوچار براہ راست قسم کے شعر بھی
کہہ ڈالے۔مثلاً اس طرح کا برملا مصرعہ ؂

بنگال کی میں شام وسحر دیکھ رہا ہوں"(۱)

اوران کو لے کر ایسا ہنگامہ مچا کہ ان کی غزل کی طرح داری اور سجیلا پن اس شور میں دب گیا۔
مجروح غزل خوانی کے حق میں تو تھے لیکن روایت بیان کے حق میں نہیں۔انھوں نے عشقیہ شعر
کہے اور خوب کہے پہلے اس رنگ میں:

دور دور وہ مجھ سے اس طرح خراماں ہے
ہر قدم ہے نقش دل ہر نگہ رگ جاں ہے
میرے شکوہ غم سے عالم ندامت ہے

مجموعہ"غزل" شاعر: مجروح سلطانپوری ص۲

اس لب تبسم پر شمع سی فروزاں ہے

ان اشعار میں بھی آپ کو ایک خاص قسم کی پاکیزگی، احساس کی تازگی اور تہذیب وشائستگی ملے گی۔ مجروح کے عشق میں ایک وقار ہے، ایک رکھ رکھاؤ ہے سستی جذباتیت، ہوس پرستی سے کوسوں دور یہ شاعری حسرت، جگر، اصغر وغیرہ کا عطر بن کر سامنے آتی ہے وہ دنیا، مے خانہ، محبوب، رنج وغم کو آلودگی سے پاک ایک فکر وفلسفے کا نام دے کر اس میں گہرائی وگیرائی پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے لوگ غم روزگار سے گھبرا کر غم عشق میں پناہ لیا کرتے تھے پھر رفتہ رفتہ یہ پناہ بھی روایتی اور ناکافی ہوتی چلی گئی۔ بیسویں صدی کے جن شعرا نے ان راہوں میں تبدیلی کی ان میں مجروح کا نام بے حد اہم ہے۔

آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"پہلے شاعر غم روزگار سے بھاگ کر غم عشق میں پناہ لیتا تھا۔ لیکن سماجی اور سیاسی حالات اور معاشی الجھنوں نے اس دور کے ذہن کی اس طرح پرداخت کی ہے کہ یہ پناہ ناکافی ہوگئی ہے۔ غزل کے اسی بنیاد گاہ سے بھاگ نکلنے اور شاہراہوں پر انسانوں کے مصروف قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چل پڑنے کا نام مجروح سلطان پوری ہے۔"(۱)

اور پھر اس رنگ کے عشقیہ شعر کہے جانے لگے

یہ نیاز غم خواری یہ شکست دلداری

مجروح سلطانپوری "غزل" کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۱۱

بس نوازش جاناں دل بہت پریشاں ہے

سرخئی مے کم تھی میں نے چھو لئے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جو بھی اب ارباب مے خانہ کہیں

دل سادہ نہ سمجھا ماسوا ئے پاک دامانی
نگاہ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

غزل چھوئی موئی کی طرح ایک بہت ہی شرمیلی صنف سخن ہے۔ یہ بقول شخصے چاول کے ایک دانے پر قل ھو اللہ لکھنے کا عمل ہے۔ نفس موضوع ذرا بھی بوجھل ہوا کہ غزل کا پورا ڈھانچہ معمولی شاعر کے ہاتھ میں ڈانوا ڈول نظر آنے لگتا ہے اور روح عصر کی چاشنی نعرہ بازی میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے، اچھا شاعر مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ وساغر اور دار ورسن کی بات قد و گیسو کی اصطلاحات میں کرتا ہے اور بڑے بڑے سے مسائل کو غزل کے مزاج میں اس چابک دستی سے ڈھال دیتا ہے کہ الفاظ کے زیر و بم میں نبض کائنات کی دھڑکن سنائی دینے لگتی ہیں۔ مجروحؔ سلطان پوری نے صرف اس رمز کو سمجھا ہے۔ بلکہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ کامیاب کوشش اس کو برتنے کی ہے۔

پروفیسر محمد حسن صاحب رقمطراز ہیں:

''غزل کو سیاسی رمزیت دینے کا یہ کام یوں تو بہت پہلے
شروع ہوچکا تھا۔ اقبال سہیل اپنی غزلوں میں سیاسی
رمزیت کا استعمال برملا کرتے آئے ہیں ۔جگر مرادآبادی
نے اپنے آخیر دور کی غزلوں میں سیاسی رمزیت کو واضح طور
پر اپنایا۔ خود ترقی پسند شاعروں کی صف میں جذبی نے
سیاسی رمز و ایما کو برتا ، البتہ مجروح اور فیض کے ہاں یہ
رمزیت نئی بلندیوں تک پہنچی ۔ دونو ں کے ہاں اس کی
نوعیت مختلف ہے، مجروح کے ہاں یہ لے بی ۔ ٹی رندیوے
اور تلنگانہ تحریک کے دوران ابھری اور ۱۹۶۲ کے ہند چین
مناقشے تک تقریباً ختم ہوگئی (دو چار شعر اس کے بعد ملیں تو
ملیں) اس دوران مجروح کو جیل جانے کا تجربہ بھی ہوا، اور
سر پر ہوائے ظلم کے سو جتن کے ساتھ چلنے کا بھی ۔مگر فیض
کے ہاں یہ تجربہ (اور لہٰذا یہ لہجہ) پوری زندگی بن گیا۔''(۱)

۱۹۴۴ء میں فلم ''شاہجہاں'' میں کے۔ ایل سہگل مجروح کے گیت اور غزلیں اور گیت گا رہے تھے ''جب دل ہی ٹوٹ گیا'' رشید احمد صدیقی، جگر مرادآبادی اور سہگل تینوں غزل کے دلدادہ بلکہ پرستار ہیں۔

مجروح غزل میں کلاسیکی آئین و آداب کے قائل ہیں۔ نغمگی اور مرقع سازی ان کا فن ہے اور اس کے لئے ساز و برگ و روایت کے سبھی نقش و نگار سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی لئے سجاوٹ ان کی

مجموعہ ''غزل'' شاعر: مجروح سلطانپوری ص ۸

غزلوں محض تراکیب یا تشبیہہ سازی سے عبارت نہیں بلکہ سجیلے پن اور البیلے پن کا نام ہے۔ پہلے ایک نظر ان کی عشقیہ شاعری پر ڈال لیں۔ پہلے جمال کا ایک منظر ۔

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

دور دور وہ مجھ سے اس طرح خراماں ہے
ہر قدم ہے نقش دل ہر نگہ رگ جاں ہے

میرے شکوۂ غم سے عالم ندامت ہے
اس لب تبسم پر شمع سی فروزاں ہے

جمال صبح دیا روئے نو بہار دیا
مری نگاہ میں بھی دیتا خدا حسینوں کو

یہ سبھی اشعار مرکب تصویروں سے عبارت ہیں۔ ان میں کہیں آسودگی کا کوئی پرتو نہیں ہے۔ جمالیاتی انبساط، معروضی انداز، جہاں حسن کے اس جمالیاتی پیکر سے مجروح تعلق قائم کرتے ہیں وہاں

بھی ربودگی کے باوجود ایک باوقار فاصلہ باقی رہتا ہے۔جوان کی غزل کو سنبھالے رکھتا ہے،اور سرمستی کے باوجود آلودہ ہونے نہیں دیتا ۔

یہ نیاز غم خواری یہ شکست دل داری
بس نوازش جاناں دل بہت پریشاں ہے

دل سادہ نہ سمجھاماسوائے پالک دامانی
نگاہ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسو ں سے

وہ بعد عرض مطلب ہارے شوق جواب اپنا
کہ وہ خاموش تھے اورکتنی آوازیں سنی میں نے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

سرخی مے کم تھی میں نے چھو لیے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جوبھی اب ارباب مے خانہ کہیں

یہ تہذیب رسم عاشقی، یہ باوقار سرشاری، مجروحؔ کی عشقیہ شاعری کی پہچان ہے ۔ یہاں لذت پرستی، اور ذات اہم نہیں وقار حسن اور جمال کی روشنی اہم ہے۔ یہ انسانی تعلقات کا ایک لطیف مرحلہ ہے جسے مجروحؔ مرقع ساز اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ مرقع سازی اور لہجہ بندی ان کے اسلوب کی خصوصیات ہیں۔

آخر وہ کون سے تصورات اور کیفیات ہیں جن کی ترسیل مجروحؔ سلطان پوری کی غزلوں کا امتیاز بنی ہے؟ سب سے پہلے حیات اور کائنات کے تسلسل کا احساس اور تاریخی قوتوں کی کارفرمائی کا تصور جسے مارکس کی مادی جدلیت نے بڑی وضاحت سے پیش کیا۔ اس تصور نے انسانی زندگی اور سماج کو کسی ماورائی طاقت کی دین قرار دینے کے بجائے ایک مادی تسلسل اور ایک تاریخی ربط دے دیا۔ ظاہر ہے یہاں زندگی سے مراد انفرادی نہیں اجتماعی زندگی ہے جسے اقبالؔ نے ''ساقی نامہ'' میں گلوں کو ایک شاخ سے ٹوٹتے رہنے اور اسی شاخ سے پھوٹتے رہنے سے تعبیر کیا تھا۔ مجروحؔ نے انسانی زندگی کے مضمون کو جابجا شعریت سے غزل میں نظم کیا ہے۔

مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
کہ نہیں مرا کوئی نقش پا جو چراغ راہ گزر نہ ہو

ترے پا زمیں پہ رکے رکے ترا سر فلک پہ جھکا جھکا
کوئی تجھ سے بھی ہے عظیم تر یہی وہم تجھ کو مگر نہ ہو

نہ دیکھیں دیر و حرم سوئے رہروان حیات
یہ قافلے تو نہ جانے کہاں قیام کریں

گنبدوں سے پلٹی ہے اپنی ہی صدا مجروحؔ
مسجدوں میں کی میں نے جا کے داد خواہی بھی

مرے عہد میں نہیں ہے یہ نشان سر بلندی
یہ رنگے ہوئے عمامے یہ جھکی جھکی کلاہیں

پہلے مجروحؔ کی آواز کا جادو رنگ لانے لگا اس کے بعد جب داد ملنے لگی تو وہ شاعری کی طرف سنجیدہ ہونے لگے اور جب ابتدائی دور کی غزل کا یہ شعر ایک مشاعرہ میں بہت پسند کیا گیا۔

ہم ہیں کعبہ ہم ہیں بت خانہ ہمیں ہیں کائنات
ہو سکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجئے

جیسے جیسے وہ زندگی معاشرہ اور عوام کے قریب آتے گئے اور زندگی سے متعلق ان کا نظریہ معروضی اور حقیقی ہوتا گیا۔ غزل کے لہجہ میں تبدیلی آتی گئی۔ نجی احساسات اور ذاتی تجربات وسیع

تناظر میں ڈھلنے لگے۔اور دنیائے عشق اچانک بہت بڑی اور غم زدہ سی معلوم ہونے لگی۔انھیں دنیا سے، انسانوں سے، تہذیب و معاشرت سے عشق ہونے لگا اور پھر یہ بھی ہوا کہ کچھ دیر کے لئے ان کی عشقیہ شاعری غیر عشقیہ شاعری سی لگنے لگی۔لیکن یہ بھی ہوا کہ ایسی شاعری کا لہجہ اور کیفیت ایک بڑی انسانی شاعری کو چھونے لگی۔مثلاً دو شعر دیکھئے ۔

میرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
کہ نہیں مرا کوئی نقش پا جو چراغ راہ گزر نہ ہو

نہ دیکھیں دیر و حرم سوئے رہروان حیات
یہ قافلے تو نہ جانے کہاں قیام کریں

مجروحؔ کہا اور خوب کہا۔زندگی کے رموز و نکات، فکر و فلسفہ، تضاد و تصادم سے متعلق اردو شاعری کا دامن ہمیشہ وسیع رہا ہے۔زنجیر، گریباں، مقتل، شورش دوراں، آتش زیر پا وغیرہ کا ذکر تو اردو شاعری میں ہوتا ہی آیا ہے۔لیکن راست طور پر عہد حاضر کی سیاست اور سیاسی گرم بازاری۔تحریک اور آندولن وغیرہ کا ذکر غزلیہ انداز میں کہہ پانا مشکل کام تھا۔لیکن مجروحؔ کی صلاحیت اور انانیت نے یہ کارنامہ انجام دے ڈالا۔مجروح نے نچلے طبقے کے حالات اور ان کے مسائل کی عکاسی کی اور ان کے درد کو سمجھتے ہوئے باقاعدہ مزدوروں اور عوام کی تحریکوں سے جڑے اور جیل بھی گئے۔نتیجتاً اس قسم کے اشعار کا خلق ہونا عین فطری تھا۔

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

سوئے مقتل کہ پئے سیر چمن جاتے ہیں
اہل دل جام بکف سر بکفن جاتے ہیں

مجروح کے قلم سے وہ اشعار نکلے ہیں جس پر صرف مجروح ہی نہیں پوری ترقی پسند شاعری فخر کرتی ہے اور صرف ترقی پسند شاعری کا ہی نہیں اردو غزلیہ شاعری کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ کچھ اس نو کے بھی شعر ملاحظہ کیجئے ۔

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشن چراغاں تم سے زیادہ

ہے یہی اک کاروبار نغمہ و مستی کہ ہم
یا زمیں پر یا سر افلاک ہیں چھائے ہوئے

جنون دل نہ صرف اتنا کہ گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دارو رسن تک ہے

حادثے اور بھی گذرے تری الفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے اب مری تصویر نہ دیکھ

مجھ سے کہا جبرئیل جنوں نے یہ بھی وحی الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہب دل ہے باقی سب گمراہی ہے

مجروحؔ نے جس وقت غزل کا پرچم لہرایا ان کے ساتھ ساتھ یا آگے پیچھے مجازؔ، جذبیؔ، اور فیض بھی غزلیں کہہ رہے تھے۔ اور شہرت پا رہے تھے لیکن مجروحؔ کا لہجہ ان سب سے مختلف اور منفرد تھا۔ مجروحؔ نے سیاست کو اپنی روایت اور کلاسکیت کے اندر جذب کیا۔ اردو کی صوفیانہ شاعری سے فیض اٹھایا اور اس کے مزاحمتی لہجہ کو ایک نیا رنگ دیا۔ یہ نیا رنگ انھوں نے زندگی کی نئی حقیقتوں اور معروضی صورتوں سے حاصل کیا وہ بارہا کہتے ہیں کہ وہ جب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو انھوں نے خوب پڑھا اور زندگی کا بدلا ہوا تصور ان کے سامنے تھا۔ چنانچہ انھوں نے غزل کی بدلتی روایت سے اجتناب تو کیا لیکن لفظیات اور اسلوب وہی لیا اور اس نے معنی دئے۔ وہ کہتے ہیں:

''ضروری نہیں کہ ہر شعر میں انقلاب زندہ باد کہیں۔ اگر آپ جمالیاتی طور پر کسی ایک شخص کو ہیلدی بناتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ انقلاب سے دس ہزار گنا اچھی بات ہے۔ اس طرح آپ کچھ ایسا کریں کہ انسان جو آپ کے آس پاس ہے وہ صحت مند بنے۔ حسن کے اعتبار سے، جذبے کے اعتبار سے، انسانیت کے اعتبار سے وہی مریض نہ بنے...''(۱)

---

(۱) عصری ادب، ص ۴۷ (انٹرویو سے)

مجروح نے غزل کو اجتماعی شعور سے جس قدر مالا مال کیا وہ اس قبل نہ تھی کہ مزدوروں کو بھی لگنے لگا کہ یہ تو ہمارے شاعر ہیں۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے گل پیرہن سے لے کر دار ورسن کے فاصلے اور مرحلے کو باہم مدغم کر دیا۔ محبوب کا ہاتھ اور دار ورسن کا ساتھ ہمیشہ رہا انھیں تو اپنے شعری اسلوب کی بھی فکر نہیں، اسے بھی وہ محبوب کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔

مجھے نہیں کسی اسلوب شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

پروفیسر علی احمد فاطمی فرماتے ہیں:

''سیاسی شاعری کے بارے میں عام خیال ہے کہ اکثر اکہرے پن اور خرجیت کا شکار ہو جاتی ہے لیکن مجروح کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مخصوص اسلوب اور جذبہ وفکر کے ذریعہ اپنی داخلی بصیرت کا حصہ بنا کر غزل کی پوری تعظیم اور تحریم کرتے ہوئے پیش کیا۔ ان کا مخصوص غزلیہ آہنگ ان کے اس سیاسی افکار کو بھی اپنے گرفت میں لے لیتا ہے جن سے تھوڑی دیر کے لئے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک طرف مجروح کے سردار جعفری، محمد حسن، محمد علی صدیقی وغیرہ ہیں تو دوسری طرف، حامدی کاشمیری وغیرہ بھی ہیں۔ فضیل جعفری نے مجروح کو نو کلاسیکی شاعر کہا تو حامدی کاشمیری نے پیکریت کا بادشاہ اور نئی نسل نے تاجدار غزل کہا۔'' (۱)

---

(۱) تین ترقی پسند شاعر مصنف پروفیسر علی احمد فاطمی ص ۷۶

علی سردار جعفری کہتے ہیں:

''مجروح نے اپنی چھوٹی چھوٹی ذاتی خوشیوں اور ذاتی غموں کو سماجی زندگی کی خوشیوں اور غموں کے سمندر میں ملایا ہے اور پھر اس سمندر سے اپنی شاعری کے جام بھرے ہیں یہی وجہ ہے کہ مجروح کا ہر شعر بیک وقت ان کے اپنے دل کی آواز بھی ہے اور زمانے کے دل کی دھڑکن بھی۔ ہر اچھی شاعری کے لئے ضروری ہے کہ اس میں سب کی بات نکلتی ہو لیکن انداز شاعر کا ہو یہی وہ انفرادیت اور اجتماعیت ہے جو شاعر کو عظمت بخشتی ہے۔''(۱)

مجروح اکثر اپنے قبیل کے ایسے شاعروں کی لعن طعن کرتے اور احمد فراز، قتیل شفائی، ندا فاضلی وغیرہ سے اکثر اسی لئے ناراض رہتے ہیں کہ ان کو شاعری کی زبان نہیں آتی۔

پروفیسر علی احمد فاطمی بتاتے ہیں کہ ایک بار میں نے الہٰ آباد کے ایک شاعر دوست کے شعری مجموعہ کے سلسلے میں لکھنے کی سفارش کی تو انھوں نے شاعری کی زبان اور الفاظ کی دروبست کے بارے میں بلیغ باتیں لکھیں اور معذرت کرلی۔ انھوں نے لکھا:

''میں نے آپ کے دوست کا کلام دیکھا ان کے اشعار کے مصرعے بیش از بیش مصرعے نہیں ہیں موزوں فقرے ہیں یعنی

(۱) تین ترقی پسند شاعر مصنف پروفیسر علی احمد فاطمی ص ۷۶

حرف کے نیچے جو دبی دبی نغمگی لفظ کو شعریت کا رنگ عطا کرتی ہے اس کا فقدان ہے۔ یہ دو طرح سے پیدا ہوتی ہے کہ یا تو بات سادگی سے کہی جائے تو اسلوب کچھ ایسا ہو کہ جی کو لگے اس کے لئے نشست الفاظ کا سلیقہ چاہئے۔ میرؔ کے مصرعے۔ ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا، کو ہمارے آگے ترا نام جب کسو لیا، لکھیں تو لفظ اگر چہ میرؔ ہی کے ہیں مگر نشست الفاظ سیم ہونے کی وجہ سے مصرعہ غارت ہو گیا۔ دوسری صورت کنائے اور اشارے میں تازگی کی ہے۔ علامت جانی پہچانی سہی یعنی طرز بیان ایسا ہو کہ بات سنی سنائی لگنے کے باوجود بھلی لگے۔ تیسری شکل ایک اسی بھی ہے جس میں بات کچھ اتنی نئی ہو کہ آدمی سنے تو متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دوسری شکل کی مثال دینی بھول گیا۔ دیکھیئے میرؔ کہتے ہیں۔ دیکھا اس بیمارئ دل نے آخر کام تمام کیا۔ تو یہ وہی بات ہے جو ان سے پہلے ہزاروں بار کہی گئی ہے پھر بھی مصرعہ دل کو بھلا لگتا ہے مگر اسی طرح کی کہی ہوئی باتیں اگر دہراتے رہے تو میرؔ صاحب میر تقی میرؔ نہ بن سکتے کہ انھیں جدت طرازیوں نے انھیں میرؔ بنایا ہے۔ تیسری بات کی مثال اقبالؔ کے مصرعے سے لیجئے: ''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں'' (۲)

---

(۲) تین ترقی پسند شاعر مصنف پروفیسر علی احمد فاطمی ص ۸۱

مصرعہ دامن کھینچ کر اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے مگر کہیں اور
یہ چیزیں کا لفظ نا گوار بھی گزر سکتا ہے۔ مثلاً آپ ہیں خنجر
آزما مشہور۔ آپ کیوں نہ میرا دل چیریں۔ یہاں یہ لفظ بد
مذاقی کی حد تک نا گوار ہے....''

(خط سے اقتباس)

پروفیسر علی احمد فاطمی آگے رقمطراز ہیں:

''شمس الرحمٰن فاروقی سے بھی وہ اس لئے ناراض رہتے تھے کہ ان کی امت زبان بگاڑ رہی ہے جس کے جواب میں فاروقی صاحب کا یہ کہنا ہے کہ جو غلط زبان لکھے وہ میری امت میں نہیں ہے۔''(۱)

مجروح کی کم گوئی کا سبب صرف ان کی مصروفیت نہیں بلکہ اس کے لئے ان کی کچھ نفسیاتی الجھنیں بھی ذمہ دار ہیں اور سب سے بڑھ کر معیار کا مسئلہ ان کے سامنے رہتا تھا کیوں کہ شروع میں ہی ان کے گیت مشہور ہوئے اور بہت مشہور ہوئے لیکن ارباب فن نے اعتراضات بھی خوب کئے کہ مجروح جو جگر اور رشید احمد صدیقی کے صحبتوں میں رہے ہیں ان سے غزل کو کیا کیا فاعدہ پہنچ سکتا ہے اس طرح شہرت والے گیت لکھ رہے ہیں جو غزل کے معیار کے منافی ہے۔ مجروح ان باتوں کو اہمیت دی، گیت لکھنا تو بند نہ کر سے لیکن غزل کا دامن بھی نہ چھوڑا لیکن غزل کو مشاعری بازی والی غزل سے محفوظ رکھا اور غزل کے مزاج داں کی حیثیت سے اپنے آپ کو بنائے رکھا، اور تا عمر اس امیج کو برقرار رکھا۔ مجروح نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ میری کم سخنی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ میرا جی نہ چاہا کہ میں غزل کے معیار سے اپنے آپ کو گرنے دوں اور گیت لے پر اسے بھی گاؤں۔ مجروح نے حالانکہ گیت میں بھی ایک معیار قائم کرنے کو کامیاب کوشش کی ہے۔''

---

(۱) تین ترقی پسند شاعر مصنف پروفیسر علی احمد فاطمی ص ۸۱

ڈاکٹر زیبا محمود ریڈر شعبۂ اردو گنپت سہائے پی جی کالج سلطان پور میں ایک کی محنت او کوششوں سے ۲۲۔ ۲۳ فروری ۲۰۰۹ کو یو۔ جی۔ سی کے زیر اہتمام قومی سطح کا پہلا سیمینار بعنوان ''مجروح سلطان پوری غزل کے آئینہ میں'' منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر ملک زادہ منظور، پروفیسر علی احمد فاطمی او ڈاکٹر شیما رضوی اور خود ڈاکٹر زیبا محمود نے اپنے بیش قیمت مقالے پڑھے۔ پھر اس کا سووینئر ''یادگاری مجلہ'' کے نام سے شائع بھی ہوا۔ اس میں اپنے پیغام میں پروفیسر محمود الٰہی فرماتے ہیں کہ مجروح صاحب بڑے حساس واقع ہوئے۔ اپنے بیٹے کی ناگہانی موت پر ہوئی بات چیت پر انھوں نے جو الفاظ کا استعمال کیا وہ ان کے جذبات کی عکاس ہیں۔ ''اس بہو کی طرف اشارہ ہے'' کی آنکھوں میں آنسو دیکھے نہیں جاتے۔''

منصور خان (ڈپٹی رجسٹرار، ایم۔ جی۔ پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی) تحریر کرتے ہیں:

> ''مجروح نے سیاسی رمزیت کے ساتھ غزل کو ایک نیا آہنگ دے کر نئے حسن، انداز اور کلاسکی رچاؤ کے ساتھ سے ادبی معیار اور حسن عطا کیا۔ انھوں نے الفاظ و معانی تشبیہات و استعارات کے پیکر میں غزل کو اس انداز میں سنوارا کہ غزل کا ایک ایک شعر شاہکار بن گیا۔'' (۱)

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد مجروح سلطان پوری کی کم گوئی کا سبب خود ان کو لکھے مجروح کے ایک خط کے حوالے سے بتاتے ہیں جو مجروح نے ۳ر اپریل ۱۹۵۹ء میں لکھا تھا اس کا ایک اقتباس ذیل میں تحریر کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود (پروفیسر محمود الٰہی صاحب کا پیغام)

پچھلے دو مہینوں سے دل میں دل میں کیا کیا امنگیں اٹھ رہی ہیں کہ کوئی غزل کہوں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سحر و شام کی مصروفیت ہمیشہ کی طرح ان کا بھی خون کر کے رہے گی۔ بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را، کی جیتی جاگتی تصویر دیکھنی ہو تو فلم لائن میں اپنے شاعروں اور ادیبوں سے ملئے، نہ روتے بنے گی نہ ہنستے بنے گی۔'' (۱)

پروفیسر موصوف آگے فرماتے ہیں:

''اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جو کچھ انھوں نے لکھا وہ اپنی جگہ پر ایک ایسی تلخ مگر ٹھوس حقیقت ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مجروح ان خوش نصیب لوگوں میں ہیں جو اپنی ذہانت، اپنی طباعی اور قوت اختراع کے باعث جس جگہ بھی رہے، کامیاب رہے۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں وہ اپنے تغزل اور ترنم کے باعث مشاعروں پر آندھی طوفان بن کر چھائے اور ان کی دو نظمیں ''گائے جا پپیہے گائے جا'' اور ''کیا کہئے مجھے کیا یاد آیا'' ملک کے طول و عرض میں مشہور ہوئیں۔ غزل کہنے پر آئے تو فکر و فن، مواد اور ہئیت کا اتنا باشعور اور حسین امتزاج پیش کیا کہ ان کی غزلیں مستقبل کی غزلیں اور غزلوں کا مستقبل بن گئیں۔'' (۲)

(۱) مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۱۰۱

انہوں نے تنگنائے غزل میں اتنی زیادہ قوت تسخیر بھر دی ہے کہ وہ ان کے ہاتھ میں بحر بیکراں معلوم ہوتی ہے اور ہمیں ان کے یہاں اس عرفان کی جھلک نظر آتی ہے جو غم گیتی کے پیچ و تاب کو زلفوں کے پیچ و خم میں تبدیل کر دیتا ہے اور جو نوک خار کو شمع رہ گزر بنا دیتا ہے، زنجیر کی جھنکار کو صدائے ساز اور انجمن سر گرفتش حنا کی تابندگی عطا کرنے کے ہنر سے مجروحؔ خاطر خواہ واقف ہیں۔

مجروحؔ کی شاعری کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ان کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۵ء تک ہے۔ ان کا پانچ برسوں میں انھوں نے جو کچھ بھی کہا ہے کہ اس پر جگر مراد آبادی کی چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ ۱۹۴۵ میں وہ ممبئی چلے گئے اور دو برس کا ایک عبوری دور گزارنے کے بعد وہ باقاعدہ طریقے پر ۱۹۴۷ میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے اور ان کی غزلوں میں سیاست کا عمل دخل شروع ہو گیا۔ غزل میں سیاست کا عمل دخل کہاں تک مستحن ہے اس کے بارے میں اختلاف رائے ہو سکتی ہے۔ ایسے شعرا کی مثالیں موجود ہیں جن کی شاعری نے سیاست سے رفعت اور بلندی حاصل کی ہے اور ان لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جنھوں نے اس میدان میں بڑی آسانی سے اپنی عاقبت بگاڑ دی ہے۔ مجروح کی سیاسی شاعری میں بڑا سلیقہ نظر آتا ہے انھوں نے راست انداز بیان سے پرہیز کر کے علامتوں سے کام لیا ہے جو ایک دور کی حقیقت کو ہر دور کی حقیقت بنا دیتی ہیں اور ان کی شاعری کا وہ حصہ جس میں روح کائنات غزل کی علامت بن گئی ہے۔

کسی نے مجازؔ کے بارے میں کہا ہے کہ اردو شاعری میں ایک کیٹس (Keats) پیدا ہوا تھا جسے ترقی پسند بھیڑیے اٹھا لے گئے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے فی الحال زیر بحث نہیں لیکن مجروح کے بارے میں پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جگر مراد آبادی کے تغزل اور علی سردار جعفری کے تفکر کا ایک عطر مجموعہ مجروح کی شکل میں سامنے آیا تھا۔ وہ فلم انڈسٹری کی مصروفیات میں کم گوئی کا شکار ہو گیا ہے۔ ایک ایسا ذہن باشعور شاعر جس کا سلسلہ قد و گیسو سے دار و رسن تک ...

جس نے ''صرف موسم'' ، ''بند بہاراں'' ،رقص ناتمام'' اور شراب خام جیسی نادر اور چونکا دینے و
تراکیب اپنی شاعری میں استعمال کی ہوں اور جو مجموعی طور پر اپنی کم گوئی کے باوجود ترقی پسند تحریک
سب سے اچھا غزل گو رہا ہو۔اس کی کم گوئی شعروادب کے پرستاروں پر گراں گزر رہی ہے۔

ڈاکٹر شیمہ رضوی رقم طراز ہیں:

''مجروح کا شمار ان شعرا میں کیا جانا چاہئے جنھوں نے غالب کی طرح اپنی
راہ خود نکالی ،اگر چہ ان کے شعری سفر کا آغاز کلاسیکی روایت کے پروردہ
ماحول میں ہوا ابتدا میں انھوں نے جگر،حسرت اور اصغر کی مقبول عام عاشقانہ
روش کو اپنایا:'' (۱)

وہی بات جو وہ نہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آ گئی
وہی لب نہ میں جنھیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئی

رفتہ رفتہ گرد و پیش کے حالات اور مطالبات جسے انھوں نے ''عصری حسیت'' سے
تعبیر کیا ہے،غزل کی تمام رمزیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی نظر آتی ہے۔

(۱) مجروح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۱۷

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

اور پھر غزل کی یہی رمزیت سیاسی رمزیت کا لبادہ اس وقت زیب تن کرتی ہے جب ان کو جنوں کو بیڑیاں پہنائی گئیں اور مرارجی دیسائی کے زمانے میں گرفتار کر کے آرتھر روڈ جیل ممبئی میں ڈال دئے گئے، یہ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت اور اس کے بعد جو اشعار وجود میں آئے وہی غزل کے تغزل، رمزیت و ایمائیت کی روایت کو آگے بڑھاتے نظر آتے ہیں

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

روک سکتا ہمیں زنداں بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

سر پہ ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

اور یہ اس قسم کے دیگر اشعار اس بات کے ضامن ہیں کہ غزل کی تنگنائے میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ا
عہد کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے آپ کو ڈھال سکے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ غزل صرف دا
جذبات واحساس کی ترجمان نہیں بلکہ اجتماعی شعور کی عکاسی کرنے والی اہلیت رکھتی ہے۔
مجروحؔ کا مزاج انقلابی ہے اور انقلابی شاعر کبھی یاسیت کا شکار نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ان
غزلوں میں رجائیت کا عنصر غالب ہے ۔

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

انہوں نے لکھا ہے:

''غزل معیار چاہتی ہے، نکھار اور جمالیاتی رچاؤ چاہتی ہے میں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا ہے، شاید اسی لئے میرے اشعار پسند کئے گئے ، بس اب معیار سے اترنے کو جی نہیں چاہتا، سمجھ لیجئے میں Choosy ہوں ۔ کتنے مصرعے ذہن میں گونجتے رہتے ہیں لیکن جی نہیں بھرتا۔''

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ڈاکٹر زیبا محمود رقم طراز ہیں:

"مجروحؔ کی فنکارانہ صلاحیتوں نے اردو تغزل کو اوج ثریا عطا کیا ہے۔ ادب اور عوام، ادب سماج ادب اور سیاست اور ادب اور اشتراکیت کا خوبصورت امتزاج یعنی مجروحؔ کی شاعری مجروحؔ غزلیں ان لوازمات سے لبریز ہیں۔ ایک مشہور شعر ملاحظہ ہو۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا"

جب بھی کسی محفل میں فصاحت و نزاکت کی بحث ہوتی ہے تو مجروحؔ سلطان پوری کا نام ضرور لبوں پر آ جاتا ہے۔ یہی وہ عالم گیر شخصیت ہے جس کی شریں بیانی نے تمام دنیا والوں سے غزل کی عظمت اہمیت کا لوہا منوایا ہے۔ آسمان ادب کا وہ درخشاں ستارہ جس نے غزل کو فصاحت کے درجہ کمال تک پہنچایا۔ جس نے اپنے مجموعۂ کلام "غزل" کے ذریعہ اردو شاعری کے بہترین نمونے پیش کئے۔

مجھے نہیں کسی اسلوب شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

مجروحؔ کی طبع آزمائی کا اصل میدان غزل ہے۔ ان کی شاعری میں موجود دردمندی، سوز وگداز اضطراب، خلوص ومحبت و شوخی فروانی کے ساتھ رقم ہیں۔ مجروحؔ کی شاعری واردات قلبی کی صحیح تصو

پیش کرتی ہے۔ چونکہ شاعر خود عشق کا زخم خوردہ ہے عرفان ومحبت کے صحرا میں ہجر وفراق کی طویل راتیں گزار چکا ہے۔ غم آشنائی اور درد جدائی کی لذت سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس لئے ان کے کلام میں ہر جگہ حرارت وجوش وجدان اور حقیقت اور صداقت کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔

نہ مٹ سکیں گی یہ تنہائیاں مگر اے دوست
جو تو بھی ہوتو طبیعت ذرا بہل جائے

کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے
ہوئے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

دراصل مجروح سیماب صفت حرکت وحرارت مسلسل وپیہم اپنے افکار وخیالات منصۂ شہود لانے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۵۸ء کی شاعری کی ایک مثال۔

تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہتے میکدہ
لب ہی لب ہم نے دیکھے کس کو پیمانہ کہیں

اور اس کے بعد انھوں نے بڑی بے باکی اور صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بات بہ بانگ دہل

اور مثالوں کے ساتھ پیش کردی۔

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر ونغمہ میں آ گئی
وہی لب نہ میں جنھیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے

اس طرح کے متعدد اشعار ان کے مزاج کی اس افتادطبع کا جوہر ہیں جو نقش اول ہونے کے باوجو شاعری کے آخری سفر تک کے رموز و نکات کو آشکار کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔ ان کی شاعری نفیس و نازک، احساسات سے مزین ہشت پہلو نگینوں کی حیثیت رکھتی ہے جن سے معانی ومفہوم کی شعاعیں پھوٹتی ہیں:

تو اے بہار گریزاں کسی چمن میں رہے
مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے

وہی ہے آبلہ پائی وہی چمن بندی
جئے دوانہ ترا شہر میں کہ بن میں رہے

نہ ہم قفس میں رکے مثل بوئے گل صیاد
نہ ہم مثال صبا حلقۂ رسن میں رہے

مجروح کی سیاسی و سماجی بصیرت کے متعلق علی سردار جعفری کا خیال ہے:

''ایک اور خصوصیت مجروح کو عام غزل گو شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ ہے کہ انھوں نے سیاسی اور سماجی موضوعات کو بڑی کامیابی کے ساتھ غزل کے پیرائے میں ڈھال لیا ہے۔ عام طور سے غزل گو شعرا سماجی اور سیاسی موضوعات کے بیان میں پھیکے اور میٹھے ہو جاتے ہیں یا ان کا انداز بیان ایسا ہو جاتا ہے کہ نظم اور غزل کا فرق باقی نہیں رہتا۔ مجروح کے یہاں یہ بات نہیں۔ پھر بھی وہ غزل کے مخصوص الفاظ کے ذخیرے میں نئے الفاظ کا اضافہ کرتے ہوئے بھی نہیں گھبراتے۔ انھوں نے اپنی مخصوص خود اعتمادی کے ساتھ جہاں ضرورت سمجھی ایسے نئے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو نظموں میں آسانی سے کھپ جاتے ہیں لیکن غزل کو خراب کر دیتے ہیں۔ مجروح نے ان کی مدد سے نئی تصویریں بنائی ہیں اور غزل کو نیا پن دیا ہے اور اس کے طریقۂ اظہار میں اضافہ کیا ہے:''(۱)

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۴۷

مسلط زندگی پر کب سے ہے زنداں کو تاریکی
نکل اے میر آزادی اجالا ہم بھی دیکھیں گے

مجروح کی شاعری کے تعلق سے وارث کرمانی کا خیال ہے:

''غالب کے بعد اردو کی پوری غنائی شاعری کے صرف ایک ہزار شعروں کا انتخاب کیا جائے جس میں حالؔی ، داغؔ ، اقبال اور نہ جانے کتنے بلند شاعر نظر آجائیں گے تو اس انتخاب میں مجروحؔ کا کوئی شعر ضرور آجائے گا اور اگر وہ ۱۹ صدی میں پیدا ہونے والے تمام شاعروں کے کلام سے سو بہترین غزلیں منتخب کی جائیں تو اس میں مجروحؔ کی کئی غزلیں آجائیں گی اور پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر ایسے اشعار کو یکجا کیا جائے جو اس وقت باذوق لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں تو ان میں مجروح کے شعروں کی تعداد اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ہوگی۔''(۱)

اشعار کس طرح کی خوبیوں سے پر ہونا چاہئے ، ان میں الفاظ اور معنی کی کیا اہمیت ہے یہ ہر شاعر کے لئے سمجھنا ضروری ہوتا ہے ، غالب نے کہا تھا کہ شاعری قافیہ پیمائی کا نام نہیں ہے۔ بقول شیخ شاعری پیغمبری سے زیادہ جادوگری کا نام ہے۔ مجروحؔ شاعری کے تعلق سے ارشاد فرماتے ہیں:

۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۰۳

ڈاکٹر زیبا محمود کے خیال میں:

"مجروحؔ کے تغزل کا انداز ہمہ گیری فطانت کا غماز ہے"(۱) شعر ملاحظہ فرمائیں:

لتفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا
رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسم چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

مجروحؔ شاعری کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

"میرے نزدیک شاعری کی پہلی اور آخری شرط یہ ہے کہ وہ سامع و قاری کے خیالات و جذبات کی رفیق ہو اس کے بغیر نہ تو اسے قبول عام کی سند مل سکتی ہے اور نہ ہی اسے معتبر کہا جا سکتا ہے جس نے صنف غزل کو اپنے لئے اس لحاظ سے اس لئے بہتر جانا کہ اس کا ایک کامیاب شعرا اپنے اختصار و دلنشینی کے باعث ابلاغ و ترسیل کی سہولتیں زیادہ رکھتا ہے۔" (۲)

(۱،۲) مجروح سلطانپوری "غزل" کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۲۹،۲۹

غزلیں جوان کی ادبی سرمایہ میں کم ہونے کے باوجود عوام میں بہت مقبول ہوئیں ان میں بہ
سی غزلیں اپنی نغمگی کی بنیاد پر فلم میں بھی استعمال ہوئیں۔ مجروحؔ نے کبھی مشاعروں میں اپنے شعر
وضاحت نہیں کی۔

ڈاکٹر بشریٰ بانو رقمطراز ہیں:

''شعروشاعری سے ان کا رجحان فطری تھا انھوں نے غزل گوئی کو اس وقت اپنا موضوع سخن بنایا جب ترقی پسند شعرا نظم گوئی کی بابت مائل تھے۔ کیوں کہ غزل گوئی اس وقت صنف سخن میں شامل تھی، جس میں سیاسی، سماجی، اقتصادی نیز انقلابی مسائل شامل بھی ہو سکتے تھے لیکن مجروح سلطان پوری کا مکمل فن یہ ہے کہ انھوں نے نئے احساسات، خیالات، سماجی کشمکش اور انقلاب کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اسے اتنا خوبصورت، لطیف طرز ادا اور عمدہ پیرایۂ بیان میں پیش کیا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔'' (۱)

لذت و ترک آ مجروحؔ تصوف کی روشن روایات کے ترجمان نظر آتے ہیں۔ مجروحؔ کے یہاں
ساری اخلاقی تعلیمات دیکھی جا سکتی ہے۔ جو ہمارے صوفیائے کرام کا خاصہ رہی ہے۔ وہ غم کائنات
غم ذات پر ہمیشہ ترجیح دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ ذات کے محدود دائرے سے نکل کر تز کسائش حیات کا
تعلیم ان کے یہاں دیکھی جا سکتی ہے۔

روح سلطانپوری ''غزل'' کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبا محمود ص ۴۵

آخرغم جاناں کو اے دل بڑھ کر غم دوراں ہوتا تھا
اس قطرہ کو بننا تھا دریا اس موج کو طوفاں ہونا تھا

مسرتوں کو یہ اہل ہوس نہ کھو دیتے
جو ہر خوشی میں ترے غم کو بھی سمو دیتے

مجروحؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ قومی یکجہتی ،مساوات اور جمہوری قدروں کی ترجمانی کی ہے۔ وہ رنگ و نسل ،قوم و قبیلے اور مذہب و ملت کے اختلافات کو مہمل سمجھتے تھے۔
وہ اردو غزل گوئی کی بعض روایتون کے امین بن کر ابھرے ہیں۔
مجروح زبان و بیان پر خاصی قدرت رکھتے تھے جس کا اندازہ ہر ذی فہم کو ہے۔ شعری بج درّ اور رکھ رکھاؤ نیز زبان پر جیسی قدرت انھیں حاصل تھی اس کا اندازہ ان کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ فطری طور پر ان کے یہاں شاعری کا ایک ایسا ملکہ تھا جو اشعار کے نوک پلک درست کرنے میں معاون بنتا تھا۔

ان کے مزاج سے بارے میں ان سے جو سوال کیا گیا۔ وہ یہ تھا کہ آپ کی یہ شہرت کہ آپ سے کوئی ملنا چاہے تو آپ ملتے نہیں ،آپ ایک مغرور انسان ہیں ،آپ شاعری میں کسی کو اپنا حریف نہیں سمجھتے۔ ایک اور سوال تھا آج کل ایک محدود حلقہ میں سہی مگر یہ بات بار بار سننے میں آرہی ہے کہ آپ فیض کو اپنے سے بڑا شاعر نہیں مانتے۔ ان کا جواب تھا وہی لوگ انھیں مغرور سمجھتے ہیں جنھیں انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے اور فیض کے سلسلے کے جواب میں ان کے اپنے الفاظ ہیں:

رکھ لیا اور اس طرح میں بمبئی کا ہو کر رہ گیا اس کے
میں۱۹۴۵میں ترقی پسند مصنفین میں شامل گیا۔اس زمانے میں
کمیونسٹ تحریک زوروں پر تھی چنانچہ میں کمیونسٹ تحریک سے بھی
وابستہ ہوگیااوراس طرح میں نے جہدوعمل کی بات غزل میں اس
وقت شروع کی جب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ
سے جگرصاحب کے چہیتے ہونے کی حیثیت سے، پورے گروپ
میں معتوب بارگاہ ٹھہرے کہ تو ترقی پسندوں میں شامل ہوگیا۔اور
ترقی پسندوں کا یہ رویہ رہا کہ یہ غزل گو ہے،غزل زندگی کا ساتھ
نہیں دے سکتی۔کسی نے کلیم الدین احمد کا مقولہ دہرایااور کسی نے بوڑھی
نائکہ کہا۔اس وقت ہم جس پلیٹ فارم پر آئے وہاں ہمیں شاعر تصور
نہیں کیا جاتا تھا کیوں کہ ہم نے غزل کی صنف اپنائی تھی اور جب
غزل شاعری نہیں تو ہم بھی شاعر نہیں۔مگر میری نظر میں غالبؔ کا یہ
شعر تھا۔

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

اور مری نظر میں میرؔ کا یہ شعر۔

''فیض مجھ سے تو کیا بہتوں سے بڑے شاعر ہیں ۔ میں
نے تو صرف اتنا کہا ہے اور کہوں گا کہ ۱۹۴۵ تک ہندوستان
میں فیض سے کوئی ترقی پسند غزل نہیں پہنچی تھی بلکہ شاید انہو
ں نے کہی بھی نہ ہو۔ اس وقت میں تنہا شخص تھا جس نے
یہاں پر غزل دشمنی کے دکھ سہے ۔ اس لئے غزل اور صرف
غزل کی حد تک میں فیض کو پیش رو اور اپنے بڑا تسلیم نہیں کرتا
۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں غزل میں انہیں اپنے
سے چھوٹا کہنے کی جرات کر رہا ہوں ۔ میں تو فیض، علی
سردار جعفری ۔ مجاز ۔ جذبی، مخدوم ان سب کو اپنا پیش رو
مانتا ہوں ۔ ان میں سے ایک نہیں ہے جس سے بڑا میں
اپنے آپ کو سمجھتا ہوں ۔ اگر مجھ میں تھوڑی سی بھی تہذیب
ہے تو میں یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں ۔''(۱)

مجروح بتاتے ہیں۔

''میری اچھی غزلوں میں ابتدائی غزلیں زیادہ تر علی گڑھ
کے زمانے کی ہیں ۔ ۱۹۴۵ء میں بمبئی کے ایک مشاعرے
میں آنے کا اتفاق ہوا ۔ کاردار صاحب نے میرا کلام سنا
۔ ان دنوں وہ ''شاہجہاں'' بنا رہے تھے ۔ انھوں نے ملازم

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۹۴

ہاتھ جھنجھلا کے نہ دامن پہ ترے مارتے ہم
اپنے جامے میں اگر آج گریباں ہوتا

اور پھر مجاز کا یہ شعر ۔

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے
اوروں کا گریباں یاد رہا خود اپنا گریباں بھول گئے

اور یہ آتش کا ۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

بتائے اب اس میں کون سا حسن ہے، کون سا عشق ہے؛ مگر کوئی کہہ دے کہ یہ غزل کا شعر نہیں غزل کا شعر ہے اور اعلیٰ درجہ کا شعر ہے۔

میں اپنے آپ سے یہ کہتا کہ جب یہ اشعار غزل کے ہیں تو
آخر کیا وجہ ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا جب کہ اس قسم کے اشعار

کہے جا چکے ہیں ۔ چنانچہ مجھے ضد ہوگئی کہ میں تو کہوں گا ۔ ہاں
اس میں کہیں کہیں ضرور ہوا کہ میں بالکل Direct ہو گیا
، بلکہ اپنے گاؤں کی زبان میں کہوں گا کہ الار ہو گیا اور جو لوگ
Anti Progressive تھے انھوں نے اسی کو بہانہ بنا کر
مری خوب کھنچائی کی ۔ مرے اچھے شعروں کو شعر ہی نہیں
کہا ۔ میرے بارے میں تیس پینتس سالہ شاعری پر کوئی
مضمون آیا تو وہ پہلا مضمون ڈاکٹر محمد حسن نے ''عصری ادب
''میں لکھا ہے ۔ جس میں مجھے میرے طرح پیش کیا ہے ورنہ
ہوتا کیا تھا کہ جب بڑے غزل گو شعرا کا نام آتا تھا تو کوئی بھی
نقاد (ہندو پاکستان) میرا نام ضرور لیتا تھا جیسے فیض ، فراق
، مجروح ، علی سردار جعفری ۔ لیکن مجھ پر کسی نے لکھا نہیں ۔ یہ
ایک روایت سی بن گئی ۔''(۱)

مجروح کی غزل کے عمومی تیور کی طرف واپس آیئے تو محسوس ہوگا کہ موصوف کی شاعری میں ایک طرح کا طنطنہ ملتا ہے ۔ یہ طنطنہ زیادہ تر اپنے سلسلے میں یا اپنی شاعری کے باب میں ہے جو جلد ہی محسوس کر لیا جاتا ہے ۔ ان کے یہاں متعدد اشعار ایسے ہیں جن میں یہ احساس سمویا گیا ہے کہ وہ اپنی الگ روش رکھتے ہیں ، ان کی انفرادیت نمایا ہے یا یہ کہ سبھوں سے مختلف ہیں یا یہ کہ ان کا رنگ قطعی الگ ہے یا یہ کہ ان کے یہاں جو بانکپن ہے کسی دوسرے کے یہاں نہیں ہے ۔ گویا ایک ایسا طنطنہ ہے جو خود ان کی زبان سے ہے اور اپنے بارے میں ہے ۔ کچھ اشعار دیکھئے ۔

۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب : ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۸۶ تا ۲۸۷

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی
گنبدوں سے پلٹی ہے اپنی ہی صدا مجروح
مسجدوں میں کی میں نے جا کے دادخواہی بھی

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

سر پہ ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

ہجوم دہر میں بدلی نہ ہم نے وضع خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

غالب نے اپنے کلام کا عطر پیش کر دیا تھا لیکن ایسا نہ تھا کہ ان کا خزانہ کم تھا۔ بہر حال ''دیوا
غالب'' کے بعد شاید مجروح کی ''غزل'' دوسرا مجموعہ ہے جس کے اکثر و بیشتر اشعار قلت تعداد
باوجود ذہن میں سمائے رہتے ہیں۔ کئی شعر مجروح کے ایسے ہیں جو فیض کی مقبولیت کی وجہ سے فیض
منسوب کئے جاتے ہیں مثلاً

ستون دار پہ رکھتے چلوں سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

مجروح کی Lyricism پر تھوڑی گفتگو کی جائے۔ غزل اور غزلیت کا ذکر بار بار ہو چکا
۔ غزل میں ایک دھیمی آنچ ہے جس سے جذبہ ایک عجیب سوزش کے ساتھ سامنے آتا ہے، ایک خ
وصف اور کیفیت رکھتا ہے جو اچھی غزل کا مزاج ہوتا ہے۔ فیض اپنی پوری شاعری میں اس کیفیت کو
رکھتے ہیں۔ مجروح بھی غزلیت سے دامن کشاں نہیں گزرتے اور ان کے یہاں Lyricism یا ت
ایک روشن کیفیت کی طرح نمایاں ہوتی ہے۔ ایک غزل دیکھئے

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں کہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آ گئی
وہی لب نہ میں جنھیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے

وہی آستاں ہے وہی جبیں وہی اشک ہے وہی آستیں
دل راز تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے

تجھے چشم مست پتہ بھی ہے کہ شباب گرمیٔ بزم ہے
تجھے چشم مست خبر بھی ہے کہ سب آبگینے پگھل گئے

مرے کام آ گئیں آخرش یہی کاوشیں یہی گردشیں
بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

مجروحؔ سلطان پوری کا پہلا مجموعہ کلام ''غزل'' ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے بذریعہ ٹائپ شائع کیا تھا۔ ۶۴ صفحات کی اس مختصر سی کتاب (کتابچہ) کے ابتدائی دس صفحات میں مجروح سے متعلق سردار کا تعارفی مضمون ہے اور چار صفحات پر مشتمل قاضی عبدالغفار کا پیش لفظ۔ صفحہ ۱۵ سے ۶۴ تک مجروحؔ کی ۲۸ غزلیں اور ۱۸ متفرق اشعار ہیں۔ اس مجموعہ کو بہ اعتبار ضخامت ''انتخاب'' کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا ۔صنف نظم ''غزل'' کی ساخت پر غور کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ قصیدے، مرثیے اور مثنوی کے مقابلے میں غزل کے اشعار کم ہوتے ہیں۔ شاید اس لئے مجروح نے اپنے اس قلیل ادبی سرمایہ کا نام ''غزل'' رکھا اور اس کی اشاعت کے لئے سخت انتخاب کیا تا کہ غزل چست رہے اور بندش کہیں ڈھیلی نہ ہو۔ اس انتخاب میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۲ء تک دس سال کی غزلیں ہیں اور اپنی معنویت کے اعتبار سے ''قد و گیسو سے سلسلہ دار و رسن تک'' کی ترجمان ہیں۔

مجموعہ کا نام ''غزل'' رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس وقت غزل کا مخالف دور تھا اور مجروح کو غزل کہنے پر اصرار تھا (اس وقت چند نظمیں بھی کہی تھیں لیکن اس انتخاب میں شامل نہیں۔'' اس لئے نظم کے مقابلے میں غزل کو امتیاز حاصل ہوا اور غزل کے عاشق اس کے مستقبل سے مایوس نہ ہوں۔

۱۹۵۶ء میں چند نئی غزلوں کے ساتھ دوسرا اڈیشن شائع ہوا۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ۱۹۵۶ء کا اڈیشن ''غزل'' کا پہلا اڈیشن ہے۔ بعد ازاں سنین کے ساتھ غزلوں کی تعداد بڑھتی گئی اور اضافے کے ساتھ اڈیشن شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۸۷ء میں پاکستان میں غزل کا پہلا اڈیشن شائع ہوا۔ پاکستان میں ''غزل'' کی اس اولین اشاعت کے وقت ضروری سمجھا گیا کہ نئی نسل سے مجروح کا

بھرپور تعارف کرایا جائے، اس کے لئے محمد علی صدیقی کا مضمون ''مجروح سلطان پوری ترقی پسند غزل کے نقیب'' مجموعہ میں شامل کیا گیا۔

دی یونیکیر نیز (انٹرنیشنل متحدہ عرب امارات) کے روح رواں سلیم جعفری نے دبئی اور ابوظہبی وغیرہ میں نو رتا ۱۱ر مئی ۱۹۹۱ء جشن مجروح سلطان پوری کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر مجروح سلطان پوری نے ''غزل'' میں ترمیم و اضافہ کے ساتھ اپنا مجموعہ کلام ''مشعل جاں'' کے نام سے چھپوایا جس میں ۱۴۱ غزلیں، ۵ نظمیں اور ۳۲ متفرق اشعار ہیں۔ یعنی ۱۹۴۲ تا ۱۹۸۸۔ ۴۶ سال کا ''سرمایہ ...'' ۱۹۸۸ کے بعد ۲۰۰۰ تک مجروح نے کیا کہا یا نہیں کہا اس کا سراغ ۱۹۹۹ میں ''مشعل جاں'' کے اردو اور ناگری میں شائع ہونے والے ایڈیشن سے بھی نہیں ملتا البتہ چند غزلوں کے اشعار میں ترمیم و تنسیخ اور اضافہ کا عمل نظر آتا ہے۔ (جس کی نشاندہی انتخاب کلام میں کی گئی ہے) مجروح کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے ۱۹۳۶ میں مزاحیہ اشعار سے شاعری شروع کی تھی۔ ان کے انتقال مئی ۲۰۰۰ تک ۶۴ برس ہوتے ہیں۔ ان ماہ و سال کے پیش نظر ''مشعل جاں'' میں شامل مجروح کی تخلیقات کا حساب لگایا جائے تو فی سال ایک تخلیق بھی نہیں... ممکن ہے وہ غزلیں اور نظمیں جنھیں انتخاب کرتے وقت خارج کر دیا ہے یہاں جمع کر لیا جائے تو شاید حاصل جمع ۶۴ سے کچھ زیادہ ہو۔

مجروح ہی کے ایک ہم عصر حفیظ بنارسی نے چند لفظوں میں پتے کی بات کہی ہے۔

> مجروح سلطان پوری جذبی، مجاز، مخدوم اور فیض کے قبیلے کا ایک ایسا بانکا شاعر ہے جسے کوئی بھی ناقد نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مجروح نے جو کچھ کہا ''بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر کا مصداق'' ہے اور شاعروں کی طرح ان کے کلام کے کئی مجموعے دستیاب نہیں۔ ان کا ایک ہی

ہی مجموعہ کلام جو ''غزل'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے میر
خیال میں کئی کلیات ودواوین پر بھاری ہے۔

علی سردار جعفری فرماتے ہیں:

''دو برس بعد حیدرآباد کے ایک مشاعرے میں پھر میرا اور مجروحؔ کا ساتھ ہوا۔ وہاں سے ہم اجنتا اور ایلورا دیکھنے گئے۔ اجنتا میں گوتم بدھ کی تعلیمات، زندگی اور اس وقت کے ماحول کی تصویر کشی نے مجروحؔ کو ششدر کر دیا اور انھوں نے چپکے سے مجھ سے اعتراف کیا کہ سماجی مقصد کے بغیر بڑا آرٹ پیدا نہیں ہوسکتا۔ مجروحؔ کے الفاظ میں ''اجنتا فن کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے پھر بھی پروپیگنڈہ ہے، وہ جاوداں اس لئے ہے کہ اس نے روح عصر اکو اسیر کرلیا ہے۔'' یہی خیال بعد کو ایک مقطع میں ڈھل گیا۔''(۱)

نوا ہے جاوداں مجروحؔ جس میں روح ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

اس احساس نے مجروحؔ کی شاعری میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور مجروحؔ نے اپنی غزل کو نئے راستے پر ڈال دیا۔

غزل میں اس تبدیلی کی کوشش نئی نہیں ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اردو غزل محض فارسی کی نقالی ہے۔ حالانکہ نقالی کی گئی ہے لیکن اردو غزل نے بحیثیت مجموعی اپنا الگ راستہ بنایا ہے جس پر اساتذہ کا کلام شاہد ہے، میرؔ اور غالبؔ خصوصیت کے ساتھ۔

مجروحؔ کو اس پر اصرار ہے اور وہ اپنی ہر نئی غزل میں اس کو ثابت کر دیتے ہیں کہ موجودہ زمانے کے مسائل کو شعرانہ روپ دینے کے لیے غزل ناموزوں نہیں ہے اور کچھ ایسی منزلیں بھی ہیں جہاں

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۵

صرف غزل ساتھ دیتی ہے۔انقلاب چین کے بعد جب کسی نے ماؤزے تنگ سے بعض پرانی فنی ہئیتوں کے بارے میں دریافت کیا کی انھیں باقی رکھنا چاہئے کہ نہیں تو ماؤزے نے بڑی بلیغ جواب دیا ''باغ میں طرح طرح کے پھول کھلنے دو'' ہر صنف سخن اور ہر ہئیت ایک خوبصورت پھول ہے اور ایک پھول کی جگہ دوسرا پھول نہیں لے سکتا اور نہ کوئی تنہا پھول چمن بن سکتا ہے۔

''انا'' مجروحؔ کی شخصیت کا جزو اعظم ہے اور اسی کا عکس مجروحؔ کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔ان کے یہاں خلوص و محبت بھی ہے اور صداقت و شرافت بھی لیکن انکساری ذرا کم بلکہ بہت ہی کم۔وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔شاید ان کی انا اس کی اجازت نہیں دیتی۔اگر غور سے دیکھئے تو ان کے بہترین اشعار وہی ہیں جو اس انا کی پیداوار ہیں۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

ہم ہیں کعبہ ہم ہیں بت خانہ ہمیں ہیں کائنات
ہو سکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجئے

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاش دست رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقش پا سے راہیں

اسی انا نے ان میں وہ طنطنہ اور بانکپن پیدا کر دیا ہے جو اردو شاعری میں جو صرف آتش کے حصہ میں آیا جیسے یہ شعر ۔

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

مجاز کے یہاں بھی یہ مضمون مل جائیں گے لیکن اس میں مجروح والا بانکپن نہیں ہے ۔

بہ ایں موج غم و سیل حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجروحؔ غزل کے شاعر ہیں اور غزل کا آرٹ اشاروں اور کنایوں کا آرٹ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اشاروں اور کنایوں کے بغیر دریا کو کوزے میں نہیں بند کیا جا سکتا۔ مجروحؔ اس نکتے سے واقف ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اردو شاعری کی روایات کے بھی منکر نہیں۔

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروحؔ
سب کی اور سب جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں اردو شاعری کی روایات کا حد درجہ احترام نظر آتا ہے اور ان روایات کی بنیاد پرانا کے سہارے اپنی ڈگر الگ تعمیر کرتے ہیں۔

جب مجروح کھل کر کہتے ہیں تو اپنے ترقی پسندی کے زعم میں غزل کا خون کر دیتے ہیں ۔ یہاں مقصدیت فن پر حاوی ہو جاتی ہے۔

مجروح اپنے بزرگ شاعروں سے فیض اٹھانے کے باوجود اپنے تصورات اور خیالات میں ان سے بالکل الگ ہیں۔ مجروحؔ اپنے دور کے عکاس ہیں اور روح ساعت کو جو سیاسی اور سماجی کشمکش سے عبارت ہے جاوداں بنانا چاہتا ہے۔ لیکن اپنی فنکارانہ صلاحیت سے

نوا ہے جاوداں مجروحؔ جس میں روح ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

اور یہ روح ساعت بڑے تیکھے انداز میں ان کے بعض شعروں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

چمن ہے مقتل نغمہ اب اور کیا کہیئے
بس ایک سکوت کا عالم جسے نوا کہیئے

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے سات چلے

لیکن ایسے اشعار مجروحؔ کے یہاں زیادہ نہیں ۔ شاید اس کی وجہ ان کے پیشے کی مصروفیات ہیں یا پھر فارغ البالی، جو اکثر اوقات شاعر کو گرد و پیش سے آنکھیں چرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

مجروحؔ کا رشتہ کلاسیکی شعرا سے ملتا ہے۔ ان کے ہاں وہی ٹھہراؤ اور رچاؤ ہے جو کلاسیکی شعرا کا طرۂ امتیاز ہے۔ اگر چہ بوتل پرانی ہے لیکن شراب نئی ہے ۔ ان کے ہاں اس محنت اور عرق ریزی کا بھی پتہ چلتا ہے جو صحیح الفاظ کی جستجو میں پیش آتی ہے ۔ وہ ٹھوکریں نہیں ہیں جو تنافر لفظی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں ۔ اس کے بجائے ایک ایسی روانی اور ایک ایسا نغمہ ہے جو دریا کے بہاؤ سے پیدا ہوتا ہے۔

مجروحؔ کی وہ غزلیں جو پوری کی پوری انتخاب ہیں اور دیار اردو کی گلی گلی پہنچ چکی ہیں، ان مصرعوں سے شروع ہوتی ہیں ۔

ختم شور طوفاں تھا دور تھی سیاہی بھی
مسرتوں کو یہ اہل ہوس نہ کھو دیتے
ڈرا کے موج طلاطم سے ہم نشینوں کو
جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
تقدیر کا شکوہ بے معنی جینا ہی تجھے منظور نہیں
اب اہل درد یہ جینے کا اہتمام کریں
دست منعم مری محنت کا خریدار سہی
مجھے سہل گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے

آنکل کے میداں میں دو رخی کے خانے سے
دشمن کی دوستی ہے اب اہل وطن کے ساتھ
اہل طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
ہم ہیں متاع کوچہ وبازار کی طرح
سوئے مقتل کہ پئے سیر چمن جاتے ہیں
جلا کہ مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
داغ سے مہکی ہوئی زخموں سے لالہ پیرہن

۶۳۔ ۱۹۶۲ کے بعد کی سات آٹھ غزلیں (جن میں موخرالذکر ۳ شامل ہیں) مجروؔح کی باریک تراش، نغمگی اور پرسوز دلکشی رکھتی ضرور ہیں، لیکن ان کی دلکشی میں شب بھر کی مشاطگی کا دخل چھپائے نہیں چھپتا۔

غالبؔ نے تو دس بارہ جزو (فارم) کے پہلے دیوان میں سے چند اشعار انتخاب کر کے اپنے تازہ کلام میں رکھ لئے اور باقی اوراق یک قلم چاک کر دیئے تھے، مجروح کے اولین مجموعے میں ایسے اوراق ہی نہیں ملیں گے جنھیں یک قلم چاک کیا جا سکے ...اور بالفرض چاک کر دیا جائے تو وہ اب تک ہزاروں حافظوں میں محفوظ ہو چکے ہیں۔ مثلاً:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجروحؔ سنے کون تری تلخ نوائی
گفتار عزیزاں شکر آمیز بہت ہے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

سرخیٔ مئے کم تھی میں نے چھو لیے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جو بھی اب ارباب میخانہ کہیں

وہ بعد عرض مطلب ہائے رے شوق جنوں اپنا
کہ وہ خاموش تھے اور کتنی آوازیں سنیں میں نے

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے

جو گھر کو آگ لگائے ہمارے سات چلے

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

دست منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سر بازار سہی

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

ستم کہ تیغ قلم دیں اسے جو اے مجروحؔ
غزل کو قتل کرے نغمے کو شکار کرے

دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آکر
سوچتاہوں کہ تری راہ گذر ہے کہ نہیں

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکومجروحؔ
وہ سر زمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سو چتی رہی دنیاکفر ہے کہ ایماں ہے

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لئے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

روک سکتا ہمیں زندان بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

قاضی عبدالغفار کہتے ہیں:

''شاعر جس ماحول سے متاثر ہوتا ہے، اسی کا عکس اس کے کلام میں پیدا ہوتا ہے۔ مجروحؔ اپنے افکار میں بزم کو رزم سے ملا دیتے ہیں اور تقلید سے بچ کر اپنی محفل الگ آراستہ کرتے ہیں... یہ انفرادیت مجروحؔ کے مقام کو بلند کرتی ہے...'' (۱) (جنوری ۱۹۵۳ء)

علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

''مجروح کی غزل کا ایک دوسرا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے، اچھے فن کے لئے محض منفی جذبہ کافی نہیں ہے، مثبت قدروں کی تخلیق بھی ضروری ہے، جو حال کا رشتہ مستقبل سے جوڑتی ہیں۔ اور زمانے کے تسلسل کو ادب میں منتقل کردتی

---

(۱) مقام اور کلام مجروح سلطانپوری مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۳

ہیں...ایسا قاعدہ (ہوا) جس کر کوئی قیمت ادا نہیں کی
جا سکتی یعنی ان کی شاعری پر دھار آ گئی۔ غزل کی تلوار
میں یہ دھار شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ مجروح کے علاوہ
فیض اور جذبی کے چند نئے اشعار میں یہ دھار نظر
آتی ہے''

اور تیس سال بعد ڈاکٹر محمد حسن ''سجیلا غزل گو'' کے عنوان سے فرماتے ہیں:

''مجروح سلطان پوری نے نظم اور گیت کے شاعر کی حیثیت
سے شہرت حاصل کی۔ ''گائے جا پپیہے گائے جا'' اور ''کیا
جانے مجھے کیا یاد آیا'' متعدد مشاعروں میں مقبول
ہوئے... پروفیسر رشید احمد صدیقی کی وساطت سے علی گڑھ
اور جگر مرادآبادی کی وساطت سے ممبئی کی فلمی دنیا تک
پہنچے۔ ۱۹۴۵ میں فلم ''شاہجہاں'' میں کے.ایل سہگل مرحوم
مجروح سلطان پوری کے گیت اور غزلیں گا رہے تھے
''جب دل ہی ٹوٹ گیا۔'' رشید احمد صدیقی، جگر مرادآبادی
اور سہگل تینوں غزل کے دلدادہ بلکہ پرستار۔ مگر ممبئی ترقی
پسندوں کا مرکز۔ انقلابی محنت کشوں کا گہوارہ ...اور اسی
دوراہے پر مجروح کو غزل کا نیا آہنگ ملا۔''(۱)

(۱) تمام اور کلام مجروح سلطانپوری مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۸ (۲) ''سجیلا غزل گو'' مجموعہ ''غزل'' ص ۴

اس نئے آہنگ کے تین اجزائے ترکیبی انھوں نے قرار دیے ہیں:

ایک ''مرقع سازی''، دوسرا ''حیات وکائنات کا احساس اور تاریخی قوتوں کی کارفرمائی کا شعور'' تیسرا ''عظمت انسانی اور حال کے اندھیروں میں بھی مستقبل کے اجالے پر نظر جمائے رکھنا'' وہ مجروحؔ کے کلام کی شناخت ''غزل کو سیاسی رمزیت'' دینے میں بتاتے ہیں۔ اور اس کی وضاحت کے لیے اقبال سہگل، جگر مرادآبادی (دور آخر) اور جذبیؔ کے نام بطور پیشرو گنائے ہوتے فیضؔ تک آتے ہیں:

''مجروحؔ اور فیضؔ کے ہاں یہ رمزیت نئی بلندیوں تک پہنچی۔ دونوں کے ہاں اس کی نوعیت مختلف ہے... ''مجروحؔ اور فیضؔ دونوں کے لہجے اور دونوں کی رمزیت کی نوعیت جداگانہ ہے۔ ایک تخصیص سے تعمیم کی جانب سے جاتا ہے اور دوسرا تعمیم سے تخصیص کی طرف، ایک کے لہجے میں شکوہ ہے تو دوسرے کے ہاں نرمی اور دل بستگی۔ لہٰذا ان دونوں میں تقدیم وتاخیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...'' (۱)

مجروح جگر کے شاگرد ہوتے ہوئے، جگر سے بہت پہلے غزل کے نئے انقلابی لہجے کو دریافت کر رہے ہیں، ۔ یہ کیا اپنی جگہ کم اہم ہے؟ اس وقت جگر کی غزل بڑی حد تک ''گوری گوری کلائیاں توبہ'' یا ''لہرا کے پی گیا، بل کھا کے پی گیا'' گانے والی مشاعرہ پسند غزل تھی۔ ان کے یہاں سماجی شعور نے آزادی سے چند برس قبل آنکھ کھولی۔ ان کے دوسرے حلقہ بگوش زندگی بھر ''گھبرا کے محبت کر بیٹھے'' قسم کی غزلیں کہہ کر جگر اور جگر اسکول کا نام اچھالتے رہے۔ مجروح اور ان کی غزل کو اس سطح سے ترقی پسند

(۱) 'سجیلا غزل گو' مجموعہ ''غزل'' ص ۸

تحریک سے اوپر اٹھایا۔ اور مجروح نے ترقی پسند شاعری کی نعرہ باز نظم کو غزل کی ایمائیت و ایجاز سے پہلی بار روشناس کیا۔ مجروح نے ترقی پسند تحریک کے نظریات سے جو کچھ لیا وہ اپنی خوبصورت توانا عاشقانہ لہجے اور مجاہدانہ طنطنے والی غزل کے واسطے سے اسے واپس بھی کر دیا اس طرح دونوں کا حساب برابر رہا۔

ایک طرف تو وہ ناقدین ہیں جو غزل کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیتے ہیں۔ اس محاکمے سے کبھی کبھی بہت گمراہ کن نتیجے نکلتے ہیں مثلاً رشید احمد صدیقی نے عمومی طور پر غزل کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیا۔ دوسری جگہ جگر کو اردو غزل کی آبرو مانا۔ ان دونوں مقدمات صغرا و کبرا سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ جگر کی شاعری پوری اردو شاعری روایت کی آبرو یا الفاظ دیگر اس کا عطر ہے۔ اس طرح کی تنقید اور اس کے نتائج اردو شاعری کو سمجھے میں کوئی مدد نہیں دیتے۔ جگر خوش گو شاعر تھے۔ ان کی ابتدائی غزل انتہائی سطحی تھی لیکن اس کے باوجود ان کے اسلوب میں انفرادیت کا قوی امکان تھا جو ''آتش گل'' کی شاعری میں نکھر کر سامنے آیا۔ آخری دور میں جگر کی غزل محض رندی اور سرمستی اور معاملات عشق و حسن کی غزل نہیں رہی بلکہ پوری عمر کا نچوڑ بن کر مسائل حیات و کائنات پر محیط ہوگئی۔ قحط بنگال اور اس کے چند برس بعد فسادات کی بہیمیت اور بربریت کے ردعمل نے ان سے کہلوایا ۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

جس طرح غالب کے ایک شعر کی تفسیر غزل کی تنگ دامنی ثابت کرنے کے لئے کی جاتی رہی ہے، اسی طرح جگر کے اس مصرعے کی تاویل بھی غزل کے خلاف ہو سکتی ہے۔ غالب نے یہ تجمل حسین خاں کی مدح کے ضمن میں کہا تھا۔

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غالبؔ ایک مخصوص موضوع کی حد تک غزل کی تنگ دامنی کا شکوہ کرر ہے ہیں اور یہ صحیح بھی ہے کہ غزل، قصیدے کا نعم البدل نہیں بن سکتی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غزل کا دائرہ اتنا محدود ہے کہ اس میں متنوع اور مختلف مضامین، واردات، احساسات و کیفیات کے اظہار کی گنجائش نہیں۔ خود غالبؔ نے غزل میں ہر طرح کے مضامین باندھے ہیں۔ لفظیات کی حد تک انھوں نے خیال کے مطابق انحراف و اجتہاد سے غزل کے آئندہ امکانات کے نشاندہی بھی کی اور اسے فکر کا وہ آہنگ بھی دیا جس کی گونج ان سے قبل کہیں کہیں میرؔ اور دردؔ کے فلسفیانہ اشعار میں ملتی تھی... غالبؔ نے غزل کی زبان کو جذبے کے ساتھ فکر کی زبان بھی بنادیا۔ ان کے بعد حالیؔ نے قدیم رنگِ سخن سے انحراف کرکے جس جدید طرزِ غزل خوانی کی بنا ڈالی، وہ ان کے یہاں کتان ہی روکھا پھیکا، سپاٹ اور بے رنگ نظر آئے، اقبال تک پہنچتے پہنچتے نئی غزل کا شعریت سے بھرپور لہجہ بن گیا۔ حالی کی اصلاح اور غالب کے فیضان نے غزل کو، جو ناسخ اور آتش کے شاگردوں اور داغ و میر و جلال کے تلامذہ کے ہاتھوں محض لفظوں کا کھیل، محاورہ بندی، روزمرہ کے چٹخارے اور معاملہ بندی کی اسیر ہوکر انفرادی تجربہ سے عاری اور اسالیب اور لہجوں کے تنوع سے تہی ہورہی تھی، مستقبل کے اظہار کی زبان بنادیا۔ اس دور میں شاد عظیم آبادی، حسرت، یگانہ، فانی، اصغر اور جگر نے غزل کا احیا کرنے میں ں نمایا کام کیا۔ حسرت، حالی کی اصلاحی تحریک کے خلاف تھے، ردِعمل کے طور پر انھوں نے قدیم طرزِ سخن سے استفادہ کیا۔ لیکن یہ محض پیروی قدیم نہیں تھی، حسرت کی غزل میں جو ارضیت ہے اور ان کے عشق میں جو سچائی اور معصومیت ہے وہ چکی کی مشقت کے ساتھ مل کر غزل کو نئے دور کا ترجمان اور سیاسی، سماجی مسائل کے اظہار کا وسیلہ بنا سکی۔

حسرت کے خالص سیاسی اشعار غزل بے رنگ ہیں۔انھوں نے بعد کی ترقی پسند غزل کی زبان کے لئے زمین ہموار کی۔اقبال کی غزل قدیم سے انحراف ہے۔اس کی لفظیات مضامین،لہجہ سب کچھ نیا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند اور جدید غزل کے مکانات کو روشن کرنے میں دو شاعروں نے خصوصیت سے وقیع کارنامہ انجام دیا ہے۔یگانہ غزل کے قدیم تصور کی بنا پر اقبال کو رد کرتے رہے لیکن خود ان کی غزل اپنی لہجے کے طنطنے اور مضامین کے تنوع کی بنا پر قدیم رنگ سے انحراف کا ایک وقیع تجربہ ہے۔یوں فانی اور جگر بھی اقبال کو محض ناظم سمجھتے تھے۔خالص مشاعرہ باز غزل گانے والے نام نہاد شاعروں (متشاعروں،قافیہ پیا؟) کے نزدیک اقبال اور یگانہ دونوں غزل گو کی حیثیت سے اعتبار نہیں رکھتے۔خیران حضرات کی رائے قابل اعتنا نہیں ہے،لیکن بعض سنجیدہ ناقدین بھی غزل کے ایسے پیمانے اور معیار بناتے ہیں جو غزل کے اظہار کو بہت محدود کر دیتے ہیں۔

کلیم الدین احمد نے غزل کو ''نیم وحشی صنف سخن'' قرار دیا۔لیکن اس کے باوجود عملی تنقید (حصہ اول) کا بڑا حصہ غزل کی تنقید پر مشتمل ہے۔غزل پر انھوں نے اس کتاب میں بھی وہی اعتراضات دہرائے جو وہ پہلے ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں کر چکے تھے۔غزل گوئی کے جو اصول عبدالسلام ندوی نے قدما کے حوالے سے مرتب کیے تھے وہ یہ ہیں۔

(۱) غزل قوت منفعلہ کے مظاہرہ کا مجموعہ ہوتی ہے۔

(۲) غزل میں جذبات و احساسات عامۃ الورود ہوتے ہیں۔

(۳) معشوق کے جسم کی تعریف غزل کی حقیقت سے خارج ہے۔

(۴) غزل کے الفاظ شیریں، نرم، خوشگوار ہونے چاہئیں۔

(۵) غزل میں شاعر کو اپنی بڑائی وغیرہ کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

(۶) عاشق کو غیور ہونا چاہیے ۔

(۷) معشوق کے ادب و احترام کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

(۸) عاشق کو ہر حال میں شفیتہ و فریفتہ بنا رہنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ غزل گوئی کے یہ اصول جامع اور مانع نہیں۔ اس لیے ان کو مسلمات مان کو غزل کی تنقید بھی منصفانہ نہیں ہوسکتی۔ کلیم الدین احمد۔ نے ان اصولوں کی بنا پر نتیجہ نکالا ہے کہ غزل میں بعض مضامین ممنوع ہیں اور جذبات و احساسات محض انفعالی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

تمام بڑے اور اہم غزل گویوں کے کلام سے ان اصولوں کی تردید ہوتی ہے۔ میرؔ اور سوداؔ سے لے کر اقبالؔ اور یگانہ تک نے ایسے جذبات کا اظہار کیا ہے جو منفعلہ کیفیات، سے مختلف ہیں۔ اسی طرح ہر ایک کا عشقیہ رویہ بھی دوسرے سے مختلف ہے، میر کہتے ہیں ؎

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

سوداؔ کہتے ہیں ؎

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا
کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

میرؔ کے یہاں انفعالی کیفیت اور روایتی احترام دونوں ہیں۔ سوداؔ کا رویہ مختلف ہے جسے انفعالی کسی طرح سے نہیں کہا جاسکتا۔ غالبؔ تو یہاں تک کہتے ہیں اور غزل ہی کی زبان میں کہ ؎

عجز و نیاز سے تو آیا نہ راہ پر
دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچئے

یہی نہیں وہ تو معشوق سے غزل میں دھول دھپّہ اور پیش دستی تک کو روا رکھتے ہیں۔ میر کہتے ہیں ؎

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بہ کو ہے

سودا کہتے ہیں ؎

یہ آدمی ہے کہ سر مارتا پھرے ہے بہ سنگ
کہ باد تند سوئے کوہ سار گزرے ہے

یہ دونوں رویے مختلف ہیں اور ایک مثال لیجئے ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سودا کے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

دونوں شعروں میں مضمون ایک ہے لیکن لہجے اور رویہ نے فضا بدل ڈالی۔ سودا کے یہاں وہ لہجہ ہے جس سے بڑائی اور قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لہجے کے اشعار خود میر کے یہاں بھی مل جاتے ہیں۔

مستند ہے میرا فرمایا ہوا
سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
رہا سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

جس لہجے کو، یا جن مضامین کو عبدالسلام ندوی نے غزل میں ممنوع قرار دیا ہے وہ درحقیقت کبھی ممنوع نہیں رہے۔ انشا، مصحفی، ناسخ، آتش، ذوق، غالب، مومن سے لے کر زمانہ حال کے شعرا تک کسی نے ان اصولوں کی پابندی نہیں کی۔ شاعری اصولوں کی بنا پر اور ان کے حدود میں رہ کر نہیں ہوتی

بلکہ کسی صنف شعر کے اصول اور حدود خود شاعر متعین کرتا ہے اور ہر شاعر کے اصول و حدود اسی صنف کے دوسرے شاعر سے مختلف ہوتے ہیں۔

مجروحؔ سخن مختصر ہی کے شاعر ہیں، ایک تو اس لحاظ سے کہ غزل کا ایجاز وایمائیت ہی ان کا فن ہے، دوسرے اس اعتبار سے کہ ان کا سرمایہ سخن بھی ذخامت میں کم ہے۔ اگر بسیار نویسی عیب نہیں تو کم گوئی بھی ادبی گناہ نہیں۔ یہ ہر شاعر کے اپنے مزاج اور تخلیقی اظہار کے تقاضوں پر منحصر ہے کہ وہ مسلسل اور بہت لکھتا ہے یا وقفے سے اور کم۔ اصل چیز فنی ریاض اور اس کا تخلیقی اظہار ہے۔ مجروح کی غزل سے ان کے فنی ریاض کا پتہ چلتا ہے، لفظوں پر خلاقانہ دسترس کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ترکیبوں کی ساخت میں غزل کی مزاج شناسی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ ایک دو غزلوں کو چھوڑ کر جن میں سیاسی نعرہ شاعری نہیں سکا، مجروح کی تمام تر غزلیں ذاتی و وجودی تجربے کا مکمل تخلیقی اظہار ہیں اور غزل کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ وہ شاید پہلے شاعر ہیں جنھوں نے سیاسی مسائل کو بھی غزل کی زبان میں، تغزل کی کیفیت کو برقرار رکھتے ہوئے پیش کیا ہے۔

مجروحؔ کے لفظیات کا ذخیرہ محدود ہے، لیکن یہ بذات خود عیب نہیں۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو فیض، جنھوں نے مجروح سے زیادہ لکھا ہے، ان کی لفظیات بھی محدود ہیں۔ چند نظموں کا ڈکشن، غزلوں کی لفظیات پر ہی مشتمل ہے لیکن فیض کے یہاں نظم اور غزل دونوں میں یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر بہت ہی پر تکلف ماحول میں بڑی آہستگی سے نرم وشیریں، حسین ولطیف، تراشیدہ اور مرصع لفظوں اور ترکیبوں کی زبان میں بات کر رہا ہے۔ صرف کہیں کہیں فیض کے یہاں بلند آہنگ، رجزیہ لہجہ ملتا ہے، ورنہ وہ قاتل، جابر، اور صیاد و گلچیں سے بھی غزلوں کی عاشقانہ زبان میں ہی مخاطب ہوتے ہیں۔

مجروح کے وہ شعر جن میں ان کا تغزل کیفیت کے لحاظ سے غزل کی بہترین روایات کا نچوڑ

بن گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ملی جب ان سے نظر بس رہا تھا ایک جہاں
ہٹی نگاہ تو چاروں طرف تھے ویرانے

سوال ان کا جواب ان کا سکوت ان کا خطاب ان کا
ہم ان کی انجمن میں سر نہ کرتے خم تو کیا کرتے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آ گئی
وہی لب نہ میں جنھیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے

شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ بجھا دیا کبھی اک چراغ جلا دیا

وہ اگر بات نہ پوچھے تو کریں کیا ہم بھی
آپ ہی روٹھتے اور آپ ہی من جاتے ہیں

وہ شہ خوباں کدھر ہے پھر چلیں اس کے حضور
زندگی کو دل کہیں اور دل کو نذرانہ کہیں

سرخئی مے کم تھی میں نے چھو لیے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جو ابھی اب ارباب میخانہ کہیں

قاضی عبدالغفار کی رائے سب سے بلیغ اور متوازن نظر آتی ہے ملاحظہ کیجیے:

> ''ہندوستان کی نوجوان نسل کے آتش خانے سے جو چنگاریاں نکل رہی ہیں، ان میں ایک بہت روشن چنگاری مجروحؔ سلطان پوری ہیں، جنھوں نے تغزل کے وجدان میں اپنی روح کو عریاں کیا ہے۔''(۱)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''غزل کے میدان میں انھوں نے وہ سب کچھ کیا ہے جس کے لیے بعض ترقی پسند شعرا صرف نظم کا پیرایہ ضروری اور ناگریز سمجھتے ہیں، صحیح طور پر انھوں نے غزل کے نئے شیشے میں ایک نئی شراب بھر دی ہے۔''(۲)

مجروحؔ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے ان کی شعری ہوش مندی یا حسیت میں جو چیز سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے کہ انھوں نے شروع سے ہی اس بات کی شعوری کوشش کی ہے کہ شاعری

(۱،۲) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۳،۲۴

میں عوامی شناخت کے ساتھ ساتھ ان کی انفرادی شناخت بھی برقرار رہے۔یعنی ان کا کلام، شاعروں کی بھیڑ میں بے چہرگی کا شکار نہ ہو جائے۔اسی لیے وہ روزمرہ کے اجتماعی تجربات کو نظم کرتے وقت بھی اپنی انفرادی اور منظم شعری حسیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

جدیدیت اور ترقی پسندی کے کارواں میں اک واضح اور پرکشش آواز مجروح کی تھی۔مجروح کے ساتھی اور ہمعصر شعرا نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی اپنے اظہار خیال کا ایک ذریعہ بنایا تھا۔ بلکہ حقیقتاً ان کا زیادہ تر رجحان نظم کی جانب تھا کیوں کہ نظم کا وسیع ترکینوس نے انھیں اپنے اظہار خیال کے لئے زیادہ معاون نظر آیا۔لیکن مجروح نے اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے اپنے آپ کو صرف غزل کے دائرے تک محدود کرلیا اور صرف اسی میدان میں اپنی بے چین طبیعت کی جالانیاں دکھانے پر اکتفا کیا اور صرف اسی محدود دائرے میں رہ کر اپنی شاعرانہ عظمتوں کا لوہا منوایا۔

''غزل'' صنف شاعری بھی ہے اور مجروح کا مجموعہ کلام بھی۔غزل اور مجروح ایک دوسرے سے قریب ہی نہیں ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں۔مجروح اپنی غزل سے پہچانے جاتے ہیں اور جدید غزل کی شناخت مجروح سے ہوتی ہے۔حسرت، فانی، جگر، اصغر اور فراق کے بعد اب فیض اور مجروح جدید اردو غزل کی آبرو ہیں۔فانی، اصغر، حسرت، جگر اور فراق گرچہ جدید غزل گو کہلاتے ہیں لیکن موضوع، شعری آہنگ اور فکری اعتبار سے ان سب کا رشتہ اردو کی کلاسکی غزل سے زیادہ ہے۔یہ سب حسن اور عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔موت اور زیست کے فلسفے میں محو ہو کر کائنات کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔عشق مجازی کے ساتھ عشق حقیقی کی تلاش و جستجو کسی نے کسی منزل پر (سوائے فراق کے) ان شاعروں کا بہت بڑا سہارا ہے۔اگرچہ مسائل کے ادراک میں فرق ہے۔تاہم مسائل کے ادراک کا طریقہ تقریباً یکساں ہے۔علامتیں جداگانہ ہیں مگر مقصود مشترک ہے۔اس لحاظ سے اگر چہ دیکھا جائے تو فیض، مجروح اور جذبی ہی سے جدید غزل کی روایت چلتی ہے۔جدید غزل کی اصطلاح

مجروح جدید اردو غزل کی آبرو ہیں ۔ فانی ،اصغر ،حسرت ،جگر، اور فراق گر چہ جدید غزل گو کہلاتے ہیں لیکن موضوع، شعری آہنگ اور فکری اعتبار سے ان سب کا رشتہ اردو کی کلاسکی غزل سے زیادہ ہے۔ یہ سب حسن اور عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔موت اور زیست کے فلسفے میں محو ہوکر کائنات کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ عشق مجازی کے ساتھ عشق حقیقی کی تلاش و جستجو کسی نے کسی منزل پر (سوائے فراق کے)ان شاعروں کا بہت بڑا سہارا ہے۔اگر چہ مسائل کے ادراک میں فرق ہے۔ تاہم مسائل کے ادراک کا طریقہ تقریباً یکساں ہے۔علامتیں جداگانہ ہیں مگر مقصود مشترک ہے۔اس لحاظ سے اگر چہ دیکھا جائے تو فیض، مجروح اور جذبی ہی سے جدید غزل کی روایت چلتی ہے۔ جدید غزل کی اصطلاح جتنی ان تین شاعروں پر صادق نظر آتی ہے اتنی جدید کلاسیکی شعرا پر صادق نہیں آتی ،جن کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔

مجروح کی شاعری کا موضوع بھی فیض کی طرح دو عشق ہیں۔ پہلا عشق کسی کی نگاہ کا جادو جگائے ہوئے ہے۔اور دوسرا عشق لیلیٰ وطن کا عشق ہے۔لیلیٰ وطن کے لئے وہ اشترا کی نظریے کو آرائش خم کاکل سہارا بناتے ہیں۔

مجروح لیلیٰ وطن کے پرستاروں میں ہیں ۔انھوں نے ''وطن'' کو اپنے مخصوص آئیڈیل میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔اس کا غم انھیں اکثر پریشان کرتا رہا ہے۔

غیروں کی خلش اپنوں کی لگن سوز غم جاناں درد وطن
کیا کہئے کہ ہم ہیں کس کس کو سینے سے لگائے زنداں میں

بہ کر زمین پہ ہے ابھی گردش میں خوں مرا
قطرے وہ پھول بنتے ہیں خاک وطن کے ساتھ

مجروح کے یہاں وطن اور کاروبار وطن سے متعلق تلخ نوائی بھی ہے۔اس تلخ نوائی کی وجہ بھی حب وطن کا شدید جذبہ ہے۔

بہت ہی تلخ نوا ہوں مگر عزیز وطن
میں کیا کروں جو ترا درد بے قرار کرے

مجروح نے اردو غزل کو نئے حالات، احساسات اور خیالات کے پیش کرنے کا بھی ذریعہ بنا دیا۔اگر چہ اردو شاعری کے لئے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔وقتی سیاست اور عصری حالات اکثر و بیشتر ہماری شاعری کا موضوع بنتے رہے ہیں تاہم ان حالات میں اکثر یہ ہوا ہے کہ شاعری، شاعری کم اور پروپگنڈہ زیادہ ہوتی ہے۔شعریت معدوم اور ایجیٹیشن زیادہ ہے۔مجروح کی غزل فن اور موضوع کا حسین سنگم ہے۔موضوع اور اشارے نئے ہیں، لیکن کمال فن کے ساتھ۔مجروح کا کمال فن ان کا تغزل ہے۔تغزل اگر نظم میں بھی آجائے تو نظم فنی و شعری نقطۂ نظر سے بہت بلند سمجھی جاتی ہے۔اچھی شاعری میں تغزل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔خاص طور سے غزل اگر تغزل سے عاری ہو تو غزل کہنے کے بجائے نثر لکھنا ہی بہتر ہے۔مجروح کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے سیاسی سماجی اور معاشی موضوعات کو غزل کا جز بنا دیا۔مجروح کی غزل میں سب کی کہانی اپنی کہانی اور اپنی کہانی سب کی کہانی

معلوم ہوتی ہے۔

عرفی نے غم عشق اور غم دنیا کے اسی ربط کو ایک اور انداز میں بیان کیا ہے۔ اسی پس منظر میں مجروح سلطان پوری کا شعری ذوق پروان چڑھا۔

کیا مجروح نے اس دور میں غزل کو اس کے مقام سے آگے نہیں بڑھایا جہاں حسرت نے چھوڑا تھا؟ غزل کی پرانی علامتوں کو نئے معنوں سے آشنا کر دینا کیا ایک اہم کارنامہ نہیں ہے۔ غالب نے ہر گوپال تفتہ کے نام اپنے ایک خط میں کہا تھا۔ ''شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں۔'' اور اگر ردیف اور قافیہ شعر کو غنائیت بخشتے ہیں تو کیا شعر کو معنی زندگی کی کشمکش سے نہیں ملتے؟ پھر یہ زندگی کی کشمکش مسلسل بھی ہے اور ہر دور میں نئی بھی۔ یہی نیا پن اس دور کو انفرادیت بخشتا ہے۔ اسی لئے غزل کی علامتیں بھی ہر دور میں ایک نئے معنی اور ایک نئی انفرادیت چاہتی ہے۔

میؔر کے بارے میں ایک نقاد نے کہا تھا کہ ''اگر وہ غزل کے شاعر نہ ہوتے تو اپنے زمانے کے ساتھ دغا کرتے۔'' جاں نثار اختر نے کہا۔ ''میر کا راز اسی میں ہے کہ انھوں نے غم کو ایک ایسا لہجہ کے دیا جس میں صرف تحمل اور تاب و مقاومت ہی نہیں زندگی کی ایک نئی قوت بھی چھپی ہے۔'' پھر درد کے تصوف کا تجربہ کرتے ہوئے جاں نثار اختر نے کہا۔ ''اس فکری نظام کے زیر اثر درد کی شاعری میں انسان دوستی کے عناصر موجود ہیں، لیکن وہ اپنے صوفیانہ طرز فکر کو غم دوراں سے بچنے کے لیے پناہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔''

مجروؔح نے اپنے مجموعہ کلام ''غزل'' کے ایڈیشن ۱۹۷۰ء میں اس صنف کو اختیار کرنے کے سلسلے میں تحریر کیا ہے :

''میں نے صنف غزل کو اپنے لئے اس لحاظ سے بہتر جانا

کہ اس کا ایک کامیاب شعر اپنے اختصار اور دلنشینی کے
باعث ابلاغ وترسیل کی سہولتیں زیادہ رکھتا ہے۔"(۱)

مجروح کے نظر انداز ہونے کا ایک سمجھ میں وآنے والا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ان کی تخلیقی صلاحیت کا بیشتر حصہ فلمی گانے لکھنے میں صرف ہوگیا اگر وہ اپنا پورا وقت علمی وادبی مشاغل میں لگاتے اور سنجیدہ شاعری کی طرف زیادہ توجہ کرتے تو شاید ان کی منزلت آج دوسری ہوتی۔ مشاعرے کے مقبول اور خوش فکر شاعر روش صدیقی نے ایک گفتگو میں کہا تھا کہ اگر یہ شخص [مجروح] اسی طرح شعر کہتا رہا تو سارے شاعروں کا چراغ گل کردیگا۔ روش نے اسی طرح سے کہتے رہنے کی جو شرط لگائی تھی ظاہر ہے وہ مجروح کے فلم سے وابستہ رہنے کی وجہ سے پوری نہ ہوسکی۔ لیکن اس کے باوجود روش کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ جس کی تصدیق دو معتبر ترین شاعروں نے کردی گویا مجروح بہت ہی کم ہوکر "خال رخ بہاراں" ہو گئے۔ ان کی کم سخنی اور فلمی شاعری کی فضول خرچی بھی ان کی غزل کی تابناکی اور فکر انگیزی کو ختم نہ کرسکی اور وہ برصغیر کے معتبر ترین شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ لیکن یہ سوال پھر اور شدت سے سامنے آتا ہے کہ یہ فلمی شاعری اور کم سخنی اگر نہ ہوتی تو مجروح کیا کرتے۔

ہر چند یہ دلیل کہ فلمی شاعری کرنے کی وجہ سے انھیں وہ درجہ اور مرتبہ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے، درست ہوتے ہوئے بھی پوری طور سے درست نہیں ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ زیادہ شاعری کرنے یا غزلوں کا ڈھیر لگادینے سے کوئی بڑا شاعر نہیں ہوتا بلکہ اکثر معاملہ برعکس رہا ہے۔ اسی لئے مولان فضل حق خیر آبادی سے غالب نے اپنے کلام کا نہایت سختی سے انتخاب کرایا تھا اور خود بھی اپنی غزلوں کا معتدبہ حصہ خارج کردیا تھا۔

ممکن ہے مجروح نے ایسا ہی کیا ہو یا کم گوئی کی وجہ سے انھیں ایسا کرنے کی ضرورت نہ پڑی

دیباچہ ("غزل") شاعر: مجروح سلطانپوری ۲

ہو۔ کیوں کہ ان کے ۸۰ فیصد اشعار تراشیدہ ہیرو کی طرح جگمگاتے ہیں۔ یہ خوبی شاید تقلیل کلام یا کم گوئی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو۔

مجروحؔ کے ادبی حلقوں میں نسبتاً کم پذیرائی کا دوسرا سبب جو غالباً اہل نقد کے دلوں میں وز دیدہ کارفرما رہا ہے وہ خاصا سخن گسترانہ ہے، لیکن اس کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے۔

مجروحؔ نے اپنے دوسرے ترقی پسند رفیقوں کی طرح یونیورسٹی کی تعلیم حاصل نہیں کی اور وہ انگریزی زبان سے بھی ناواقف رہے۔ اس کمی سے انھیں نقصان تو ہوا، ارباب نقد نے اس جگہ دھوکا کھایا ہے۔ مجروحؔ نے غیر شعوری طور سے میری اس بات کی ایک جگہ توشیق بھی کی ہے۔

ہم بھی ہمیشہ قتل ہوئے اور تم نے بھی دیکھا دور سے لیکن
یہ نہ سمجھنا کہ ہوا ہے جان کا نقصاں تم سے زیادہ

اس جان کا نقصان نہ ہونے کا ثبوت ان کے کئی اور شعروں میں ملتا ہے ؎

جس ہاتھ میں ہے تیغ جفا اس کا نام لو
مجروحؔ سے تو سائے کو قاتل کہا نہ جائے

مجروح سنے کون تری تلخ نوائی
گفتار عزیزاں شکر آمیز بہت ہے

نظیری نے مستوری، رموزیت اور سریت سے عشق کا بھی رشتہ تصوف کے علاوہ جوڑ دیا ہے۔ غزل میں یہ وصف عاشقانہ مزاج کی پیدائشی سعادت کے ساتھ بزرگ صوفیوں اور شاعروں کی صحبت سے اوران کا کلام پڑھنے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مجروح کے یہاں یہ عمل ۱۹۴۵ سے پہلے پورا ہو چکا تھا ان کی شخصیت میں اودھ کے کسی شہر سبا کی بلقیس نے ''بنائے خون جگر'' ڈال دی تھی اور جگر اور اصغر جسے بلند پایہ صوفی شاعروں نے اسی خون جگر میں گرمی وشورانگیزی پیدا کر دی تھی۔ پھر فارسی کے عظیم شاعروں کے مطالعہ نے ان کے طرز سخن میں بندشوں، استعاروں اور علامتوں کا حیرت انگیز سلیقہ پیدا کر دیا اوران کے قلم کو الفاظ کی تراش خراش کا ہنر سکھلا دیا۔ مجروح کی شاعری میں ہنر یا فن کا بہت دخل رہا ہے۔

مجروح سلطان پوری سے انٹرویو بذریعہ مرزا سلیم بیگ، ندیم صدیقی + رفیع نیازی (۱)

شاعری (غزل) کے حوالے سے کچھ سوالات:

سوال: مجروح صاحب آپ کے خیال میں ایک اچھے اور مکمل شاعر کی کیا خصوصیت ہونی چاہئے یا ہیں؟

مجروح: دیکھئے جناب۔ کوئی کام ہو وہ آپ سے زندگی مانگتا ہے۔ اگر عابد اور زاہد بننا چاہئے ہیں و آپ تو ترک دنیا کرنی پڑے گی۔ آپ فنکار رہنا چاہئے ہیں تو بھی ترک دنیا کرنی پڑے گی تو ایک فن کار کے لئے، ایک شاعر کے لئے ایک نارمل انسان کی حیثیت سے اپنے خاندان کو ٹریٹ کرنا ذرا مشکل ہے لیکن اچھے شعرا، بڑے شعرا جو ہیں انھوں نے بڑی حد تک اس منصب کو نبھایا ہے۔ میر کا بھی اپنا گھر تھا، اقبال کا بھی تھا۔ اقبال کے بعد جوش پر زیادہ مصیبتیں آئیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۶۱

ہم لوگوں کی مشکل یہ ہے کہ ان کا تو یہ تھا کہ جتنی بڑی شاعری اتنی بڑی تنخواہ، یعنی اتنی ہی بڑی عزت با الفاظ دیگر جتنی بڑی شاعری اتنی بڑی روٹی اور اتنی ہی بڑی پگڑی۔ کوئی تضاد نہیں تھا۔ ہم لوگوں کے زمانے میں یہ ہو گیا ہے کہ یا تو شاعری کر لو یا روٹی کما لو۔ دونوں میں وہ یکسانیت نہیں ہے جو ہمارے بزرگوں میں تھی کہ وہ صرف شاعری کرتے تھے اور جتنے بڑے شاعر ہوں گے اتنا بڑا گھر ہوگا اور اچھی معشیت ہوگی۔ ہمارے یہاں تضاد آ گیا ہے اس لئے ہمارے لئے یہ مشمل ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے گھر والوں کا حق کس حد تک ادا کر پائیں گے۔ خود میں اپنی بات بتاؤں۔ میں اس قماش کا آدمی ہوں کہ میں اپنے بچوں اور بیوی اور اپنے متعلقین کا اتنا خیال کرتا ہوں جتنا کہ اپنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کبھی ایک سال میں ایک غزل ہو رہی ہے۔ ہماری اسپیڈ جو شاعری کی ہے وہ کم ہو رہی ہے۔ ہماری اسپیڈ جو ہے اس کی وجہ سے ہماری کوانٹٹی کم ہے اور جو تھوڑی بہت ہے اس پر مجھے آپ لوگ عزت دیتے ہیں حالانکہ میں کوانٹٹی دے سکتا تھا مگر محض اس لئے نہیں دے سکتا کہ مجھے اپنے بچوں کی فکر کرنی پڑتی ہے مجھے کتنی بار ایسا ہوا کہ میرا غزل کا موڈ ہوا لیکن مجھے فلمی گیت لکھنا پڑا اور اس طرح ہوتا یہ ہے کہ وہ کیفیت ہماری مرجھا جاتی ہے۔ اب میں کہاں کا شاعر ہوں۔ ایک ایک سال میں دو دو سال میں ایک غزل کہہ رہا ہوں، یہ کوئی بات ہوئی۔ کیا کریں؟ ہم اگر شاعری کرتے رہیں تو ہمارے بچوں کو کون دیکھے گا۔

ندیم صدیقی کے سوالات: (۱)

سوال: اپنے ابتدائی دور میں آپ کن شعرا سے متاثر تھے؟

مجروح: اپنے ابتدائی دور میں مجاز، جاں نثار اختر کی نظموں سے اور جگر صاحب و اصغر گونڈوی سے بہت زیادہ متاثر تھا اور جوش صاحب میرے پسندیدہ شاعر تھے۔

سوال: جگر صاحب سے آپ کا کیا تعلق رہا؟

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۸

مجروح: جگر صاحب نے مجھ کو جونپور کے ایک مشاعرے میں سنا اپنے پاس بلایا اور کہا کہ آپ میں انفرادیت ہے اسے مت گنوایئے اور اس کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ میرے پاس کچھ دنوں رہیے۔ظاہر ہے اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔

سوال: مجروح صاحب آپ پر ایک الزام ہے کہ آپ نے بہت کم کہا ہے؟

مجروح: الزام تو بہت چھوٹا لفظ ہے اگر کوئی اور سخت لفظ استعمال کیجیے مجھے قبول ہوگا۔ میں اپنے آپ سے خود پریشان ہوں کہ میں نے اتنا کم کیوں کہا۔ میں اپنی اس خاموشی کو مجرمانہ سمجھتا ہوں لیکن کیا کروں۔ میری ہمیشہ یہ عادت رہی ہے کہ جب تک اندر سے امنگ نہ ہو شعر نہیں کہہ سکتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کاغذ قلم لیا اور شعر کہنا شروع کر دیا۔

سوال: پچھلے دنوں آپ نے کسی رسالے میں لکھا تھا کہ میں فیض کو اپنے سے بڑا نہیں مانتا تو اس سلسلے میں آپ وضاحت کریں؟

مجروح: ہاں یہ صحیح ہے کہ (میں ترقی پسند غزل کی حیثیت سے) فیض کو غزل کی حد تک اپنے سے بڑا نہیں مانتا، لیکن فیض میرے پیش رو ہیں۔ جب میں نے تتلا کر شعر کہنے شروع کیے تو اس وقت فیض کا مجموعہ کلام آچکا تھا لیکن میں ان سے کبھی متاثر نہیں ہوا۔ جہاں تک ان کی شاعری اور فن کا سوال ہے تو وہ اپنی جگہ بہت خوبصورت ہے بڑی دلنشیں ہے اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی۔

سوال: فراق کے بعد آپ غزل گو شعرا میں کس کو اہمیت دیتے ہیں؟

مجروح: ''غزل گو'' شعرا میں؟ مجھے معاف کیجیے میں اپنے علاوہ کسی کو نہیں سمجھتا (پاکستان کی بات نہیں کر رہا ہوں وہاں فیض بیٹھے ہوئے ہیں۔)

رفیع نیازی:

سوال: ایک سوال اور جو مجھے پہلے ہی کرنا چاہیے تھا، آپ کے نظریۂ شاعری سے متعلق

کرنا چاہوں گا؟

مجروحؔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے اعلان کے بعد اس سوال کی گنجائش نہیں رہ جاتی مگر وہ لفظوں میں پھر سے دوہرائے دیتا ہوں۔ میری نزدیک اچھی شاعری اس کو کہتے ہیں جو شعوری، جذباتی طور پر انسان کو بہتر انسان بنانے میں مدد دے۔ ظالم سے اختلاف اور مظلوم سے حمایت کرے۔ اگر شاعر کسی ذاتی غم و مسرت کا اظہار کرے تو اس میں ''میں'' کا لفظ یا ضمیر کسی کی ذات سے محدود نہ ہو بلکہ اس میں اتنی تعمیم ہو کہ وہ علامت بن جائے کہ جو بھی چاہے اپنے وسیلے سے اسے دوہرا سکے۔ اچھی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بے جا طوالت نہ ہو، فضول خرچی، معاشی زندگی ہی میں بری چیز ہے۔ اسی لیے کمزور الفاظ کی حیثیت شاعری میں کھوٹے سکے کی سی ہوتی ہے جسے کھرے کھوٹے کی تمیز رکھنے والا قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

''عصری ادب'' دہلی، اکتوبر ۱۹۷۶ء سے:

سوال: غزل نئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتی ہے یا نہیں؟

مجروح: یہ سوال جیسے غزل کا مقدر بن گیا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ سوال کسی نہ کسی کونے سے اٹھ ہی جاتا ہے۔ ۳۶ء کے بعد جب ۴۷۔۱۹۴۶ میں ترقی پسند مصنفین کی طرف سے یہی سوال دوبارہ نئی طاقت کے ساتھ اٹھا تو اس وقت، میں ۶۔۷ سال کا نیا نیا شاعر ایک غزل گوئی کی حیثیت سے انجمن میں شریک ہوا تھا۔ اس وقت فیضؔ کی سیاسی یا نیم سیاسی غزلیں سامنے نہیں آئی تھیں یا غالباً لکھی ہی نہیں گئی تھیں۔ چنانچہ میں ادب و زندگی کے حامی کی حیثیت سے غزل پر اپنا ایقان رکھتے ہوئے اکیلا ''دھکے'' کھاتا اور غزلیں کہتا رہا۔ اگر چہ ان میں اکثر ایسی تھیں جنھیں آج اپنا کلام کہہ

کر خوشی نہیں ہوتی ۔ جب ۱۹۵۰ کے آخر میں ایک سال کی قید جھیل کر چند نئی غزلوں کے ساتھ باہر آیا تو ان غزلوں کو سن کو کئی دوستوں کو اپنی غزل دشمنی کی آواز مدھم کر دینی پڑی، اور بعضوں نے جو اتنے انتہا پسند نہیں تھے، غزل سے مایوسی کا از سرِ نو جائزہ لیا۔

سوال: نئے حالات میں غزل کی کیا تعریف و خصوصیات ہو سکتی ہے؟

مجروحؔ: فارسی غزل کو سبک ہندی نے تو زمانہ ہوا ''گفتگو بمعشوق'' کی انجمن سے نکال کر زندگی کی شاہراہوں پہ لا کھڑا کیا اور اردو میں بھیا آج میرؔ و مصحفیؔ، سوداؔ، غالبؔ، آتشؔ و اقبالؔ کی غزلیں اسی کی شاہد ہیں کہ زندگی کے کیف و کم، درد و نشاط کی ترجمانی غزل میں اس طرح کا لازمی موضوع ہے جس طرح محبوب سے عشق یا کوئی اور انفرادی غم۔ مگر آج عام طور پر جو بات سمجھی اور کہی جاتی ہے کہ اچھی غزل میں موڈ یعنی عالم کی یکسانیت خصوصیات حسن میں سے ہے اس کے اعلی الرغم میں سمجھتا ہوں عالم کی یکسانیت یا داخلی تسلسل اچھی غزل کی ضروری خصوصیت ہرگز نہیں ہے۔

سوال: غزل گوئی میں آپ کی انفرادیت کیا ہے اور کون سی خصوصیات ہیں جن پر آپ خاص طور پر توجہ دیتے ہیں؟

مجروحؔ: میری اپنی انفرادیت ہے یا نہیں اسے تو میرے پڑھنے والے اور سمجھنے والے ہی جانتے ہوں گے اور عام طور پر لوگ تب ہی جان سکیں گے جب میں انھیں اپنی شاعری کا کوئی معتد بہ حصہ دے سکوں گا۔ ابھی تو مجھے اپنی بیماری کی حد تک کم گوئی سے بڑی شکایتیں ہیں اور جن خصوصیات پر توجہ دیتا ہوں وہ بھی کچھ بہت زیادہ نہیں ہے اس لئے ان پر تھوڑی سی گفتگو ممکن ہے۔ کہ اول تو شعر کہتے وقت میری پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ شعر خواہ عشقیہ ہو یا فلسفیانہ، رندانہ ہو یا اخلاقی وہ نیا اور اچھا ہو یعنی وہ کسی متقدم کی بازگشت اور کسی ہمعصر کا ہم رنگ ہوتے ہوئے کسی بھی غیر علامہ قسم کے سخن فہم کی دسترس میں آسکے۔ مگر یہ بھی نہیں کہ ذرا سی غور و فکر کے بغیر ہی سمجھ میں آجائے۔ سننے والا تھوڑی سی توجہ کرے پھر

اس پر اس کے محاسن کا انکشاف ہو۔ یوں تو شعر عوامی سطح پر کہے گئے ہیں اور کہے جائیں گے مگر ایسے اشعار کے رتبے کا تعین دوسری سطح پر ہوگا ورنہ میر و غالب و اقبال کہتے وقت نظیر اکبرآبادی کو ہم کیوں ایک طرف کر دیا کرتے ہیں، جیسا کہ عوامی اور ہندوستانی شاعری کا ذکر کرتے وقت ہم نظیر کے مقابلے میں میر و غالب و اقبال کو الگ نشست پر بٹھا دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ شعر ایک اوسط درجے کے پڑھے لکھے سخن فہم کو مخاطب بنا کر اگر کہا جائے تو چیستاں بننے سے بچ جائے گا اور تھوڑے سے غور و فکر کی شرط بھی رہے گی تو وہ اکہرہ اور چٹکیلا بننے سے محفوظ رہے گا۔ اوسط درجے کے پڑھے لکھے کی تعریف یہی ہے کہ وہ شاعری، زندگی اور ان کے مسائل کا عالم نہیں مگر کسی قدر واقف کار ضرور ہو۔ تھوڑے سے غور و فکر سے میری مراد یہ ہے کہ اس خوش مذاق واقف کار کو کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت عام طور پر نہ پڑے۔ لہٰذا یہ نقطہ ہمارے ملحوظ خاطر رہے تو ترسیل و ابلاغ کا غیر ضروری اور مشہور لفظ بار بار سننے میں نہ آئے۔ یہ لفظ شاعروں کے لئے نہیں۔ مکتب کے ان طالب علموں کے لئے ہے جو شاعری ''سیکھنا'' چاہتے ہیں۔ یا پھر اس نقاد کے لئے ہے جو شاعری کا تجزیہ کرتا ہے۔ دوسری بات جس پر مری توجہ ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وسیع و رنگارنگ زندگی کے جتنے مظاہر ہیں ان میں سے زیادہ سے زیادہ میرے کلام میں جھلکیں۔ میری یہ خواہش دیکھئے کب پوری ہوتی ہے۔ ادھوری یا چوتھائی سے بات نہیں بنتی۔

سوال: آپ کی شاعری کے تخلیقی محرکات کیا ہیں؟

مجروحؔ: بہت کم ایسا ہوا ہے جب مجھے شعر کہتے وقت اپنے شعری محرکات کا علم ہو سکا ہو۔ مجھے تو یہ محرکات شعوری بہت ہی کم، نیم شعوری کچھ اس سے سوا اور غیر شعوری زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب میں نے چین سے عہد و پیماں کے وقت ''آ ہی جائے گی سحر مطلع امکاں تو کھلا'' لکھا تو مجھے معلوم تھا کہ اس طرح میرے خواب کی وہ دنیا وسیع تر ہوگی جسے میں سوشلسٹ دنیا کہتا ہوں۔ یا جب میں نے ''دست منعم مری محنت کا خریدار سہی'' کہا تو مجھے پہلے تو یہی معلوم تھا کہ مزدور کی رفاقت اور اس

کے اظہار کے لیے میں نے یہ شعر کہا ہے مگر جلد ہی مجھ پر منکشف ہوا کہ دراصل اس میں میرا اپنا غصہ بھی شامل ہے۔ لیکن جب میں نے ''ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے'' کہا تو اس وقت میرے ہاتھوں میں کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔ شاید میری اس وقت کی نشاطیہ کیفیت پر کبھی کا بہتا ہوا کوئی لمحہ شعر کے سانچے میں ڈھل گیا یعنی میں اکثر کسی موجود یا غیر موجود محرک سے بے خبر اپنی تسکین کے لیے شعر کہتا ہوں جب کہ میری تسکین کا اتنا ہی اہم پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ سننے اور پڑھنے والوں کی خوش مذاق اکثریت بھی اسے پسند کرے۔

باب پنجم

مجروحؔ کے شعری مجموعے ''غزل'' اور ''مشعل جاں''

(''غزل'' جو آخر میں ترمیم و اضافے کے ساتھ ''مشعل جاں'' کے نام سے شائع ہوا)

کا تنقیدی جائزہ

مجروحؔ کے شعری مجموعے "غزل" اور "مشعل جاں"
(''غزل'' جو بعد میں ترمیم واضافے کے ساتھ''مشعل جاں'' کے نام سے شائع ہوا)

کا تنقیدی جائزہ

مجروحؔ سلطان پوری کا پہلا مجموعہ کلام ''غزل'' ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ بذریعہ ٹائپ شائع کیا تھا۔۶۴ صفحات کی اس مختصر سی کتاب (کتابچہ) کے ابتدائی دس صفحات مجروح سے متعلق سردار کا تعارفی مضمون ہے اور چار صفحات پر مشتمل قاضی عبدالغفار کا پیش صفحہ ۱۵ سے ۶۴ تک مجروحؔ کی ۲۸ غزلیں اور ۱۸ متفرق اشعار ہیں۔اس مجموعہ کو بہ اعتبار ''انتخاب'' کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا ۔صنف نظم ''غزل'' کی ساخت پر غور کریں تو صاف ہے کہ قصیدے، مرثیے اور مثنوی کے مقابلے میں غزل کے اشعار کم ہوتے ہیں۔شاید اس لئے نے اپنے اس قلیل ادبی سرمایہ کا نام ''غزل'' رکھا اور اس کی اشاعت کے لئے سخت انتخاب کیا تاکہ چست رہے اور بندش کہیں ڈھیلی نہ ہو۔اس انتخاب میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۲ء تک دس سا غزلیں ہیں اور اپنی معنویت کے اعتبار سے ''قد وگیسو سے سلسلہ دارورسن تک'' کی ترجمان ہیں۔

مجموعہ کا نام ''غزل'' رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس وقت غزل کا مخالف دور مجروحؔ کو غزل کہنے پر اصرار تھا (اس وقت چند نظمیں بھی کہی تھیں لیکن اس انتخاب میں شامل نہیں. لئے نظم کے مقابلے میں غزل کو امتیاز حاصل ہوا اور غزل کے عاشق اس کے مستقبل سے مایوس نہ ہو ۱۹۵۶ء میں چند نئی غزلوں کے ساتھ دوسرا اڈیشن شائع ہوا۔عام طور پر یہی سمجھا جاتا۔

۱۹۵۶ء کا اڈیشن ''غزل'' کا پہلا اڈیشن ہے۔ بعد ازاں سنین کے ساتھ غزلوں کی تعداد بڑھتی
اضافے کے ساتھ اڈیشن شائع ہوتے رہے۔۱۹۸۷ میں پاکستان میں غزل کا پہلا اڈیشن شہ
۔پاکستان میں ''غزل'' کی اس اولین اشاعت کے وقت ضروری سمجھا گیا کہ نئی نسل سے مج
بھرپور تعارف کرایا جائے، اس کے لئے محمد علی صدیقی کا مضمون ''مجروح سلطان پوری ترقی پسن
کے نقیب'' مجموعہ میں شامل کیا گیا۔

دی یونیکیر نیز (انٹرنیشنل متحدہ عرب امارات) کے روح رواں سلیم جعفری نے دبئی اور
وغیرہ میں نو رتا ۱۱ رمئی ۱۹۹۱ء جشن مجروح سلطان پوری کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر مجروح سلطا
نے ''غزل'' میں ترمیم و اضافہ کے ساتھ اپنا مجموعہ کلام ''مشعل جاں'' کے نام سے چھپوا
میں ۱۴۱ غزلیں، ۵ نظمیں اور ۳۲ متفرق اشعار ہیں۔ یعنی ۱۹۴۲ تا ۱۹۸۸۔۴۶ سال کا '
...'' ۱۹۸۸ کے بعد ۲۰۰۰ تک مجروح نے کیا کہا یا نہیں کہا اس کا سراغ ۱۹۹۹ میں ''مشعل جاں'' .
اور ناگری میں شائع ہونے والے ایڈیشن سے بھی نہیں ملتا البتہ چند غزلوں کے اشعار میں ترمی
اور اضافہ کا عمل نظر آتا ہے۔ (جس کی نشاندہی انتخاب کلام میں لی گئی ہے) مجروح کے اپنے بیا
مطابق انھوں نے ۱۹۳۶ میں مزاحیہ اشعار سے شاعری شروع کی تھی۔ ان کے انتقال مئی ۰۰
۶۴ برس ہوتے ہیں۔ ان ماہ وسال کے پیش نظر ''مشعل جاں'' میں شامل مجروح کی تخلیقات کا
لگایا جائے تو فی سال ایک تخلیق بھی نہیں... ممکن ہے وہ غزلیں اور نظمیں جنھیں انتخاب کرتے وقت
کر دیا ہے یہاں جمع کر لیا جائے تو شاید حاصل جمع ۴۶ سے کچھ زیادہ ہو۔

مجروح کے مجموعوں پر تنقیدی تحریر سے قبل چند ایسے اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں جو اردو کے
صاحب ذوق طبقے میں بھی غیر معمولی طور پر پسند کئے جاتے رہے ہیں:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں کہ ہوا کہ رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آ گئی
وہی لب نہ میں جنھیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے

روک سکتا ہمیں زندان بلا کیا مجروحؔ

ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

ترے سوا بھی کہیں تھی پناہ بھول گئے
نکل کے ہم تری محفل سے راہ بھول گئے

شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ بجھا دیا کبھی اک چراغ جلا دیا

جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمھاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

مجروح نے فارسی میں استعداد کس طرح بہم پہنچائی لیکن قیاس کہتا ہے کہ یہ طب کا تحفہ
ایک رسم خوش ہمارے یہاں یہ بھی تھی کہ اطبا کو بالعموم شعروشاعری سے لگاؤ ہوتا تھا اور ان میں ۔
شعر بھی کہتے تھے۔ نصاب کی نوعیت ایسی تھی کہ طالبان طب کو فارسی زبان ادب پر عبور حاصل
تھا۔ نسخے تو ابھی تک فارسی میں لکھے جاتے ہیں۔ مجروح کے مجموعے ''مشعل جاں'' میں ان کی
فارسی کی نظم اسی عنوان سے شامل ہے۔

بنام من چہ فرخندہ نوائے
چواز باغ خرد موج ہوائے

بہ وجد آوردہ گلبانگ قلم را
چو گل وا کردہ اوراق ولم را

(کیسی مبارک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، اسے چمن دانش کی موج صبا کہیئے۔ وہ میری ص
کو وجد میں لے آئی۔ اس نے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح میرے دل کے اوراق کو کھول کر رکھ د
اس طویل نظم میں نہ لکنت کا احساس ہوتا ہے نہ اجنبیت کا۔ لب ولہجہ اہل زبان کا سا ہے۔ ''لتا منگ
کے نام'' اپنی نظم میں شاعر زمانہ کی ناقدردانی سے گلہ مند ہے۔

ہاں مگر آج مرے طرز بیاں کا یہ حال
اجنبی کوئی کسی بزم سخن میں جیسے

وہ خیالوں کے صنم اور وہ الفاظ کے چاند
بے وطن ہوگئے اپنے ہی وطن میں جیسے

چند اشعار دیکھیں جن میں مجروح کے مخصوص انداز میں تغزل مقصد اور مسلک سے د
گریباں نظر آئے گا۔ یہ اشعار ان سے مختلف ہیں جو عام طور پر نقل کئے جاتے ہیں۔ ان سے ہم
کی عام سطح کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

زمیں کو مل کے سنواریں مثال روئے نگار
رخ نگار سے روشن چراغ بام کریں

پستی زمیں سے ہے رفعت فلک قائم
میری خستہ حالی سے میری کج کلاہی بھی

میرے شکوۂ غم سے عالم ندامت میں
اس لب تبسم پر شمع سی فروزاں ہے

یہ رکے رکے سے آنسو یہ دبی دبی سی آہیں

یوں ہی کب تلک خدایا غم زندگی نباہیں

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

ہوئے ہیں قافلے ظلمت کی وادیوں میں رواں
چراغ راہ کے خوں چکاں جبینوں کو

میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

شرح غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

سکھائیں دست طلب کوادائے بے باکی
پیام زیرلبی کو صلائے عام کریں

اہل دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم
اب گہرسبک ہوگا جَو کے ایک دانے سے

اب جنوں پہ وہ ساعت آپڑی کہ اے مجنوں
آج زخم سربہتر دل پہ چوٹ کھانے سے

سر پر ہوائے ظلم چلے سوجتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

میں کیا کیا جرعۂ خوں پی گیا پیمانۂ دل میں
بلا نوشی مری کیا اک مئے ساغرشکن تک ہے

اہل طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں

موج کو گیسو بھنور کو چشم جانانہ کہیں

تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہئے میکدہ
لب ہی لب ہم نے دیکھے کس کو پیمانہ کہیں

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروحؔ
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

سیدھی ہے راہ شوق یہ یوں ہی کہیں کہیں
خم ہوگئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشن چراغاں تم سے زیادہ

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولت بیدار کی طرح

''کوئے تشنگی'' اس ترکیب کا رشتہ ''کوئے ملامت'' سے ملتا ہے۔

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

سوئے مقتل کہ پئے سیر چمن جاتے ہیں
اہل دل جام بہ کف سر بہ کفن جاتے ہیں

رومی کا شعر یاد آتا ہے جو مضمون کے آغاز میں نقل ہوا ہے۔

غالبؔ کی آبلہ پائی سے فیض مجروحؔ نے اٹھایا ہے اور فیضؔ نے بھی، لیکن ظاہر ہے[۲۱] دونوں میں سے کوئی نہیں پہنچا۔ غالب کا شعر ہے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب
اک آبلہ پا وادیِ پر خار میں آوے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

کچھ زخم ہی کھائیں چلو کچھ گل ہی کھلائیں
ہر چند بہاراں کا یہ موسم تو نہیں ہے

مجروحؔ سنے کون تری تلخ نوائی
گفتار عزیزاں شکر آمیز بہت ہے

اس آخری شعر میں ہم چشموں پر طنز ہے۔اس نظم میں جو کشمیر پر ہے اور جس کا عنوا
''گلگشت'' طنز کی یہ دھار بہت تیز ہوگئی ہے

اگے ہیں چار سو پودوں کے مانند
کہیں پر سر کہیں پر بازو و دست

سپاہ امن لشکر تا بہ لشکر
پڑی ہے چشمۂ خوں پر سیہ مست

عجب آواز گریہ ہے فضامیں
لگا سینے سے دل کر جائے گا جست

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

کوئی شاعر اپنے پیش روؤں کے اسرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ مجروؔح کے یہاں بھی کی بازگشت سنائی دیتی ہے مثلاً:

بن گئی ہے مستی میں دل کی بات ہنگامہ
قطرہ تھی جو ساغر میں لب تک آ کے طوفاں ہے

یہ شعر غالبؔ کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے ۔

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھا یا غالبؔ
حیف جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

مجروؔح کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں ۔

مجروحؔ:

قدم کو فیض جنوں سے وہ آبلہ ہے نصیب
جو خار راہ کو بھی شمع رہ گذار کرے

دیار حور میں رستہ ہے اک یہی ورنہ
کسے پسند ہے اے دل کہ سیر دار کرے

فیضؔ:

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے اٹھے تو سوئے دار چلے

مجروحؔ:

سر شک رنگ نہ بخشے تو کیوں ہو بار مژہ
لہو حنا نہیں بنتا تو کیوں بدن میں رہے

غالبؔ نے کہا تھا:

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

علی سردار جعفری نے کہا تھا:

مجروح اس وقت غزل کے سب سے زیادہ شائستہ، تربیت یافتہ اور مقبول شاعر ہیں۔ ارد
نے صنف شعر کی حیثیت سے اہل ذوق کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور ساتھ ہی دوسری ہندوستانی زبان
اثر انداز ہوئی ہے۔ مجروح کوئی پچاس غزلیں کہی ہیں اور ان کے علاوہ دو نظمیں لتا منگیشکر اور
تعریف میں اور دونوں نظمیں ان کی غزلوں ہی کی طرح خوبصورت اور اثر انگیز ہیں۔ وہ لتا کی فن
شخصیت کا اظہار ان چار مصرعوں میں کرتے ہیں۔

جس گھڑی ڈوب کے آہنگ میں تو گاتی ہے
آیتیں پڑھتی ہیں سازوں کی صدا تیرے لئے

دم بہ دم خیر مناتے ہیں تری چنگ و رباب
سینہ لے سے نکلتی ہے دعا تیرے لئے

مجروح نے لکھا تھا کہ فن اور محنت کا کاروباری رشتہ زیادہ دن قائم نہیں رہے گا۔ ان کو اس
بڑی شدت سے احساس تھا۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

دست منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سر بازار سہی

نئی غزل کو مجروحؔ کا یہ تحفہ ان کی دوسری غزلوں میں سبک و نرم گفتاری کے ساتھ ہی تیو
ہوئے ہے لیکن روایت سے مربوط اور منسلک۔ اس کے نقوش بلکہ جڑیں میر تقی میرؔ (اٹھارویں ص
کے یہاں ملتی ہے جیسا کہ انھوں نے کہا ہے ۔

نہ بیٹھ اب امیروں کی صحبت میں میرؔ
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

میرؔ کے یہاں قرون وسطیٰ کے احتجاج کا لہجہ ہے۔ مجروحؔ کا شعور دور جدید کے طبقاتی
سے ہم آہنگ ہے۔

مجروح کے تغزل کی معنوی فضا میں موسیقی کا آہنگ بھی رچا بسا ہوا۔ ان کی ساخت ایسی۔
وہ ''ساز بے آواز'' کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً ان اشعار کی لے اور بندش دیکھئے ۔

دست پرخوں کو کف دست نگاراں سمجھے
قتل گہ تھی جسے ہم محفل یاراں سمجھے

چاک جگر محتاج رفو ہے آج تو دامن صرف لہو ہے
اک موسم تھا ہم کو رہا ہے شوق بہاراں تم سے زیادہ

دیکھیے کب تک بلائے جاں رہے اک حرف شوق
دل حریص گفتگو اور چشم خوباں کم سخن

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لیے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں گئے

بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو
جو ترے آستاں سے اٹھتا ہے

یا

جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

اس کے ساتھ فانیؔ کا شعر یاد کیجیے:

رک رک کے جو سانسیں آئیں گی مانا کہ وہ آہیں تھی لیکن
آپ کے تیور کیوں بدلے آہوں میں کسی کا نام نہیں

مجروحؔ کا کتنا دل کو چھونے والا لطیف شعر ہے کاش اس میں پوری غزل ہو جاتی:

کچھ بتا تو سہی نشیمن کا پتا
میں تو اے باد صبا بھول گیا

رساؔ رامپوری نے اسی زمین میں کہا ہے:

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا
ہائے کیا بات تھی کیا بھول گیا

بن کے سائل بھی نہ نکلا کوئی کام
در پہ پہنچا تو صدا بھول گیا

مجروحؔ نے کہا:

اللہ رے وہ عالم رخصت کہ دیر تک
تکتا رہا ہوں یوں ہی تری رہگذر کو میں

اس پر میرؔ کی چھوٹ پڑ رہی ہے:

ساتھ اس کے مری نگاہ گئی
جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی

یا مجروحؔ نے کہا:

وہ اگر بات نہ پوچھے تو کیا کریں ہم بھی
آپ ہی روٹھتے ہیں آپ ہی من جاتے ہیں

قائم چاند پوری کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ ہی من گیا

ان کی غزل ایک نئے سمت کی طرف بھی مائل تھی جہاں جگر کے طرز سے انحراف تو نہیں
اب وہ پرانی روایت کے اندر اپنی بات کے لئے نیا انداز ڈھونڈ رہے تھے۔ چنانچہ اب اسی قسم کی غ
میں ایسے بھی شعر آنے لگتے ہیں۔

حیات لغزش پیہم کا نام ہے ساقی
لبوں سے جام لگا بھی سکوں خدا جانے

فریب ساقی محفل نہ پوچھیے مجروح
شراب ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیمانے

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

مرے عہد میں نہیں ہے یہ نشان سر بلندی
یہ رنگے ہوئے امامے یہ جھکی جھکی کلاہیں

اور ایسے بے مثل اشعار بھی آنے لگتے ہیں جو اسی راستے کے ایک نئے موڑ کی طرف کرتے ہیں ۔

حرم سے میکدے تک منزل یک عمر تھی ساقی
سہارا اگر نہ دیتی لغزش پیہم تو کیا کرتے

اور اب غزل اپنے اس روپ میں نظر آتی ہے جو روایت کی ساری خوبصورتی لئے ہو۔ سجائی موسیقی کی لہروں میں کھیلتی ہوئی مانوس استعاروں میں ایک نیا معنیاتی نظام ساتھ لے کر آتی۔ جسے ترقی پسند غزل کہا گیا ۔

جھونکے جو لگ رہے ہیں نسیم بہار کے
جنبش میں ہے قفس بھی اسیر چمن کے ساتھ

یہاں اسیر چمن اب بے یار و مددگار، آہ و فریاد میں محو نہیں بلکہ ساری فضا ایک نئے موسم کی آمد کی نوید سے لبریز ہے۔ نسیم بہار کے جھونکوں کے اثر سے قفس کی جنبش ایک نئے طرز کا رقص ہے میں ساری فضا شریک ہے۔ یہاں قفس، نسیم بہار اور اسیر چمن کے ذریعے ایک بالکل نیا مضمون با

گیا ہے جو مجروح کے عہد کے لیے جذباتی ماحول کی عکاسی غزل کی جانی پہچانی لفظیات میں کر ر
اور کلاسیکی روایت کے اندرون میں معانی کے نئے نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی سلسلے کی ان
غزل بھی ہے جو اس عہد کی نمائندہ اردو غزلوں میں ہمیشہ یادر ہے گی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منز ل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے او ر کارواں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہا ں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

انقلاب اور ادب کی جمالیات دونوں کی بے وقعتی نے کچھ ایسا رنگ دکھایا کہ حسن بھی قدر ز

(Surplus Value) کے زمرے میں آگیا۔

وہ جس کے گداز محبت سے پرنور شبستاں ہے تیرا
اے شوخ اسی بازو پہ تری زلفوں کو پریشاں ہونا تھا

اور یہ امید بھی قوی ہوگئی کہ ہندوستان میں جلد مزدوروں کا ایسا دور آئے گا جب حسن کا
خانوں سے بن سنور کر نکلے گا۔

منچلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کر نکلے گا حسن کارخانے سے

''نذر سوویت یونین'' اور یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے۔

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروحؔ
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

کمال احمد صدیقی لکھتے ہیں:

مجروحؔ، شاعر کی حیثیت سے معروف نام تھا۔ لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں وہ شریک نہیں ہ

تھے۔طرحی نشست ختم ہونے کے بعد ان کا تعارف کرایا گیا اور انھوں نے وہ غزل اپنے مخصوص میں پڑھی، جس کا یہ شعر پہلی بار سنتے ہیں میری یادداشت کا حصہ بن گیا:

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

مجروحؔ کے مجموعہ کلام ''غزل'' کا آغاز (پہلے پاکستانی ایڈیشن ۱۹۸۷ء، جس پر محمد علی ص کا پیش لفظ ہے) اس قطعہ سے ہوتا ہے:

بہت ہی کم ہے تو خال رخ بہاراں ہے
مری نواکو ملی ہے وہ داغ پیرہنی

ملے جو وقت نوا سنجی ہزارا ں سے
ادھر بھی دیکھ تماشا ہے میری کم سخنی

سمعی اور بصری پیکر کشی کی یہ ایک اچھی مثال ہے اور شاعرانہ عذر بھی ہے کم گوئی کا۔اس بعد پہلی غزل وہ ہے جس کا شعر پہلی بار مجروحؔ سے سنا اور ذہن میں پیوست ہو گیا۔
اس غزل کے کچھ شعروع کے سلسلے میں چند باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔پہلی بات تو یہ۔ مجموعہ کلام میں اس غزل کی تصنیف کا ۱۹۴۵ درج ہے۔

مجموعی کلام میں کئی بار اس غزل کو پڑھ کر یہ احساس پختہ ہوا کہ کچھ شعروں کا اضافہ کیا گیا۔
شاید ان کی تعداد انتخاب میں نسبتاً زیادہ ہے، اس لئے ۱۹۴۳ء یا اس سے پہلے کا سن نہیں دیا گیا۔
کے زمانے کی غزل ہے اور اسے رکھا بھی اسی لئے گیا ہے (شاید) کہ مجروح کی ابتدائی شا
اندازہ ہو سکے۔غزل کے فن میں جس میں غزل کا مزاج مرکز کی حیثیت رکھتا ہے، مجروح کبھ
مراد آبادی کے باہر نہیں نکلے۔جگر ایہام اور معمہ سے ہمیشہ دور رہے اور مجروح بھی لیکن اس غزل
ایسا نہیں ہے۔

ختم شور طوفاں تھا اور دور تھی سیاہی بھی
دم کے دم میں افسانہ تھا مری تباہی بھی

اور دوسرا شعر۔

التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی

مجروح کی شاعری، حشو و زوائد اور ایہام سے پاک ہے۔ مطلع میں سیاہی اور شعر میں کم نگاہ
(اور پھر محبوب کے لیے) محل نظر ہیں۔
اسی غزل میں یہ شعر بھی ہے:

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

یہ کوئی نادر مضمون نہیں ہے، لیکن تلازمے مختلف ہیں۔ اور دونوں مصرعوں سے ایک مضمو
طرف امکان کا دروازہ کھلتا ہے، جسے چند برس بعد (۱۹۴۷ء) میں مجروحؔ نے نظم کیا، تو نہ صرف
ضرب المثل بن گیا، بلکہ مجروحؔ کی پہچان بھی:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مقطع میں تعلّی ہے اور ایسا شعر کہنے کے بعد اس تعلّی کے لیے جواز بھی ہے، اگرچہ تعلّی کا حق
کو ہوتا ہے:

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

یہ مقطع اس کا مقتضی ہے کہ اس پر تفصیل سے لکھا جائے۔ لیکن لفظوں کی ایک محدود تعداد
مجھے اپنی بات کہنی ہے۔ ایک معنی تو سامنے کے ہیں۔ دوسرے وہ معنی ہیں جو شعر کے مقدر حصے

جڑے ہوئے ہیں۔ مقدر یہ ہے کہ جس سے زندگی کو برتا معاشرے کو بھگتا ہے اور ہر بات صحیح تناظ
دیکھتا ہے اور جب کوئی بات بیان کرتا ہے تو وہ اپنے عہد کی حقیقت ہوتی ہے اور حقیقت جاودا
ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن فرماتے ہیں:

غزل، شرنگار رس لیے ہوتی ہے تب ہی وہ غزل ہوتی ہے اور شرنگار رس لیے جس رومانی م
لطیف جذبات، احساس حسن اور نرم وشریں انداز بیان کی ضرورت ہے وہ سب مجروحؔ ک
میں موجود ہیں۔ ان کے کلام میں اگر سوز وتپش میں بھی تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے تو اس کا سبب
ہے۔

مجروحؔ سلطان پوری نے غزل کی فارسی اور اردو روایات کو عزیز رکھا تھا، میرؔ کو بے حد پسند ک
تھے۔ ۳۲ برس پہلے مجھے بتایا تھا کہ انھوں نے میرؔ کا دیوان مرتب کیا ہے (غالباً ان کا مرتب کیا ہوا د
شائع نہیں ہوا ہے)۔ کلاسیکی شعرا میں میر اور جدید شعر میں فیضؔ ان سے قریب تھے۔ میرؔ کا ایک بہ
دلفریب شعر ہے:

گلچیں سمجھ کے چینو کہ گلشن میں میرؔ کے
لخت جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گل

مجروحؔ کہتے ہیں ۔

میں ہزار شکل بدل چکا چمن جہاں میں سن اے صبا
کہ جو پھول ہے ترے ہاتھ میں یہ میرا ہی لخت جگر نہ ہو

درد میں ڈوبی ہوئی یہ دوسری ہی آواز ہے۔ میرؔ کی روایت کے حسن کو تو لیا لیکن اس کا کلاسیکی
اپنا درد بخش دیا۔ مجروحؔ کا کلاسیکی شعور اپنی شعاعیں لیے ہوئے ہے۔ یہاں شعری تجربے کا
مختلف ہوجاتا ہے۔

فیض کے کلام سے ذہن کی قربت نے آہنگ کو تو اپنالیا لیکن بات اپنی کہی، اپنے
کا احساس دیا، کہتے ہیں ؎

جنوں کا دور ہے اب نقد گل شمار کریں
کہو صبا سے بہاروں کا کاروبار کرے

تو اے بہار گریزاں کسی چمن میں رہے
مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے

وہی ہے آبلہ پائی وہی چمن بندی
جئے دوانہ ترا شہر میں کہ بن میں رہے

نہ قفس میں رکے مثل بوئے گل صیاد
نہ ہم مثال صبا حلقۂ رسن میں رہے

مظہر امام کہتے ہیں:

مجروح سلطان پوری کے نام سے میرا سب سے پہلا تعارف ان کی ایک نظم ''سناٹ
ذریعے ہوا جو دوماہی ''نیا دور'' بنگلور کے اگست ۱۹۴۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ نظم دیکھی
کی اہلیت کا احساس ہوا۔ وہ نظم یہ ہے:

میرے گزرے ہوئے لمحات کے ویرانوں سے
سسکیاں لینے کی مغموم صدا آتی ہے

ہائے پھر جانے کہاں سے مرے اشکوں کی طرف
اس کی الجھی ہوئی سانسوں کی ہوا آتی ہے

اور وہ دھندلائی سی بے رنگ گھٹا کے گیسو
ان کی لہروں میں کوئی صبح کوئی شام نہیں

شب کے ہاتھوں میں یہ مہتاب کا ٹوٹا ہوا جام
دعوت زیست نہیں موت کا پیغام نہیں

میرے ہونٹوں پہ تڑپتے ہیں ابھی تک شکوے
جانے اس کی وہی نیچی سی نظر ہے کہ نہیں

میری بے مانگی غم کو تو وہ کیا جانے
اس کے عارض پہ وہ ٹوٹا سا گہر ہے کہ نہیں

زرد رو چاند بھی خاموش ہے بادل کے قریب
پھر وہ شعلہ سا گرا ٹوٹ کے جنگل کے قریب

مظہر امام رقمطراز ہیں:

''غزل'' (مجموعہ) کی اشاعت ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کے زیر
ہوئی تھی۔ اس پر قاضی عبدالغفار سکریکٹری انجمن کا دیباچہ بھی تھا۔ مجروح نے اپنے ایک ا
میں ''غزل'' کے پہلے اڈیشن کا سن اشاعت ۱۹۵۶ء بتایا ہے۔ یہ ان کے حافظے کا سہو ہے، کی
مجموعے کے حوالے سے میری ان کی خط و کتابت ۱۹۵۵ء میں ہو چکی تھی۔ ''غزل'' کے کئی اڈیشن
غزلوں کے اضافے کے ساتھ ہوتے رہے اور وہی مجموعہ ۱۹۹۱ء میں نام بدل کی ترمیم واضافہ کے
''مشعل جاں'' کے نام سے چھپا۔ اس میں یہ غزل نہیں ہے۔ بہر حال، ''غزل'' کے پہلے اڈیشن
جب مجھے مذکورہ غزل نہیں ملی تو میں نے مجروح صاحب کو خط لکھ کر ان کی عدم شمولیت کے لئے

رائے جاننی چاہی۔ انھوں نے جواب میں لکھا:

آپ کا خیال درست ہے...میں نے اپنا مجموعہ کافی سخت
انتخاب کے بعد شائع کیا ہے لیکن بعض احباب کا یہ خیال
صحیح ہے کہ بعض غزلیں پھر بھی شامل کرنے کی تھیں اور بعض
جو شامل ہیں (مار لے ساتھی جانے نہ پائے) یہ شامل
کرنے کی نہیں تھی۔''(۱)

میں نے پوری غزل اور مجروحؔ کے جواب کا مندرجہ بالا حصہ اپنے نوٹ کے ساتھ ما
''سہیل'' گیا کے ستمبر ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شائع کرا دیا۔ میرے نوٹ میں مجروح صاحب۔
کے حوالے سے صرف یہ جملہ تھا:

''مجروح کے یہ جملے خود ان کے نقطۂ نظر کی غمازی بھی
کرتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل ضروری نہیں'' (۲)

اس غزل اور نوٹ کے اشاعت کے بعد مجروحؔ سلطان پوری کا ایک طویل مکتوب ''مدیر سہیل''
اور لیس سنہا روی کے نام دسمبر ۱۹۵۵ کے شمارے میں شائع ہوا، جس کی ابتدائی سطریں یہ تھیں:
''مظہر امام صاحب کی نوازش کہ میری غیر مطبوعہ غزل
انھیں دل سے پسند آئی اور اسے شائع بھی کروا دیا۔

(۲،۱) مجروحؔ سلطانپوری (گلکاری دشت کا شاعر) مرتب: خلیق انجم ص ۹۴،۹۳

میں واقعی ان کے خلوص کا معترف ہوں ۔لیکن اسے
کیا کروں کہ وہ غزل مجھے اب بھی ناپسند ہے۔"(۱)

پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں:

"جواں عمری میں بڑے بیٹے کی موت نے انھیں ایک دم توڑ کر رکھ دیا تھا۔اس سخت سانـ
پہلے بھی ان کے حالات معاشی اعتبار سے بہت پریشان کن رہے۔چین سے سانس لینے کـ
انھیں بہت کم ملا۔انھوں نے کئی یادگار غزلیں اور محاوروں کی طرح زبان پر چڑھ جانے والے بہـ
شعر اسی عالم میں کہے۔مثلاً:"(۲)

تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہیے میکدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں
پارۂ دل ہے وطن کی سرزمیں مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں

۱۹۵۸ء

کام آئے بہت لوگ سر مقتل ظلمات
اے روشنی کوچہ دلدار کہاں ہے
اے فصل جنوں ہم کو پئے شغل گریباں

(۱،۲) مجروح سلطانپوری (گلکاری وحشت کا شاعر) مرتب: خلیق انجم ص ۹۴،۱۱۴

پیوند ہی کافی ہے اگر جامہ گراں ہے

۱۹۶۰ء

کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے
ہوئے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے
مجھے نہیں کسی اسلوب شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

۱۹۵۹ء

ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح
اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولت بیدار کی طرح
بے تیشۂ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح

۱۹۶۳ء

لٹ گیا قافلۂ اہل جنوں بھی شاید
لوگ ہاتھوں میں لیے تار رسن جاتے ہیں

روک سکتا ہے ہیں زندان بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

۱۹۷۳ء

آہی جائے گی سحر مطلع امکاں تو کھلا
نہ سہی باب قفس روزنِ زنداں تو کھلا
سیلِ رنگ آہی رہے گا مگر اے کشتِ چمن
ضربِ موسم تو پڑی بندِ بہاراں تو کھلا

۱۹۶۲ء

اسیرِ بندِ زمانہ ہوں صاحبانِ چمن
مری طرف سے گلوں کو بہت دعا کہیے
پکاریے کیفؔ قاتل کو اب معالجِ دل
بڑھے جو ناخنِ خنجر گرہ کشا کہیے

۱۹۶۰ء

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

دیار شام نہیں منزل سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے
ہمارے لب نہ سہی وہ دہان زخم سہی
وہیں پہنچتی ہے یارو کہیں سے بات چلے
ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

پھر آئی فصل کہ مانند برگ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے
۱۹۶۲ء

مانا کہ شب غم صبح کی محرم تو نہیں ہے
سورج سے ترا رنگ حنا کم تو نہیں ہے
کچھ زخم ہی کھائیں چلو کچھ گل ہی کھلائیں
ہر چند بہاراں کا یہ موسم تو نہیں ہے
۱۹۷۶ء

ہم اہل عشق میں نہیں حرف گنہ سے کم
وہ حرف شوق جو سر محفل کہا نہ جائے

۱۹۸۱

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے
موسم کی ہوا اب کے جنوں خیز بہت ہے
مصلوب ہوا کوئی سر راہ تمنا
آواز جرس پچھلے پہر تیز بہت ہے

۱۹۷۶ء

کچھ نہ کچھ آج اسیروں نے کہا ہے تو ضرور
ایک اک گل سے لپٹتی ہے صبا گلشن میں

۱۹۹۴ء

جن غزلوں سے یہ شعر لیے گئے ہیں بالعموم چار پانچ سے لے کر سات آٹھ اشعار پر ہیں۔ لیکن بعض غزلوں کا تخلیقی وفور حیرت انگیز ہے۔ مثال کے طور پر وہ غزلیں جو ان مصرعو شروع ہوتی ہیں:

ہمیں شعور جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے

ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح

سوئے مقتل کہ پئے سیر چمن جاتے ہیں

آ ہی جائے گی سحر مطلع امکاں تو کھلا

چمن ہے مقتل نغمہ اب اور کیا کہیے

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے

مانا شب غم صبح کی محرم تو نہیں

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے

اسی سلسلے میں ۱۹۸۰ کی ایک غزل ''ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو، ہم تھے پریشاں تم
زیادہ'' کا ذکر ضروری ہے جو ایک ذاتی اعلانیے کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کا مزاج بڑی ح
مناظرانہ اور سوانحی ہے۔ یہ غزل نئی نسل سے مجروحؔ صاحب کے خطاب پر مبنی ہے۔ اس غزا
واسطے سے وہ اس آشوب اور آزمائش کی یاد تازہ کرتے ہیں جس سے ان کی نسل گزری تھی۔

اس غزل کے شعروں میں جلال اور ترفع کی وہ کیفیت ملتی ہے جس سے مجروحؔ صاحب کَ
پرانی غزلیں پہچانی جاتی تھیں۔ احساس کے بیان میں ایجاز بہت ہے۔ لہجہ اور آہنگ
ہے۔ تجربوں میں خودتز یئنی کی ایک کیفیت جو بیشتر ترقی پسند شاعروں کی مرغوب کرتی
قدرے Loud اور بے حجاب ہونے کے باوجود اس غزل میں ان کی ہستی کا سارا کرب، سا
گویا کہ امڈ آیا ہے اور اشعار میں ایک باطنی نامے کی فضا پیدا ہوگئی ہے:

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کئے ہیں ہم نے عزیزو چار گریبان تم سے زیادہ

چاک جگر محتاج رفو ہے آج تو دامن صرف لہو ہے
اک موسم تھا ہم کو رہا ہے شوق بہاراں تم سے زیادہ

عہد وفا یاروں سے نبھائیں ناز حریفاں ہنسے کے اٹھائیں
جب ہمیں ارماں تم سے سوا تھا اب ہیں پشیماں تم سے زیادہ

ہم بھی ہمیشہ قتل ہوئے اور تم نے بھی دیکھا دور سے لیکن
یہ نہ سمجھنا ہم کو ہوا ہے جان کا نقصاں تم سے زیادہ

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشن چراغاں تم سے زیادہ

زنجیر و دیوار ہی دیکھی تم تو مجروح مگر ہم
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں عالم زنداں تم سے زیادہ

ایک اہم بات جو قاری کو ان کے فن کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ہے مستقبل پر اعتماد کا غیر مبہم
اظہار یہاں پر اس اعتماد کا تذکرہ بھی ضروری ہے جس کا اظہار ان کے اشعار میں برابر ملتا ہے ۔

ترے پا زمیں پہ رکے رکے ترا سر فلک پہ جھکا جھکا
کوئی تجھ سے بھی ہے عظیم تر یہی وہم تجھ کو مگر نہ ہو

شب ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروان سحر نہ ہو

میرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
نہیں ہے مرا کوئی نقش پا کہ چراغ راہ گزر نہ ہو

رخ تیغ سے جو نہ ہو کبھی سحر ایسی کوئی نہیں میری
نہیں ایسی ایک بھی شام جو تہہ زلف دار بسر نہ ہو

میرے ہاتھ ہیں تو بنوں گا خود میں اب اپنا ساقی میکدہ
خم غیر سے تو خدا کرے لب جام بھی میرا تر نہ ہو

جیل میں کہی گئی غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

دعائیں دے رہے ہیں راستے مجھ آبلہ پا کو
میرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

میں کیا کیا جرعۂ خوں پی گیا پیمانۂ دل میں
بلا نوشی میری کیا اک مئے ساغر شکن تک ہے

مجروح ملک کی سیاسی صورت حال پر اس لئے بھی نظر رکھتے تھے کہ کیوں کہ انھیں ملک سے پناہ محبت تھی ان کے اندر حب الوطنی کا جذبہ بے پناہ تھا۔ ''مشعل جاں'' کے چند اشعار ہندوستان چین کے تعلقات کا احاطہ بھی کرتے ہیں ۔

سیل رنگ آہی رہے گا مگر اے کشت چمن
ضرب موسم تو پڑی بند بہاراں تو کھلا

دل تلک پہنچے نہ پہنچے مگر اے چشم حیات
بعد مدت کے ترا پنجہ مژگاں تو کھلا

درد کا درد سے رشتہ ہے چلو اے مجروح
آج یاروں سے اک عقدۂ اساں تو کھلا

مجروح کے سیاسی اور سماجی بصیرت کے بارے میں علی سردار جعفری ان کے غزل کے مجموعہ ''غزل'' کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''ایک اور خصوصیت جو مجروح کو عام غزل گو شعرا سے ممتاز
کرتی ہے یہ ہے کہ انھوں نے سماجی اور سیاسی موضوعات

کو بڑی کامیابی کے ساتھ غزل کے پیرائے میں ڈھال لیا ہے عام طور سے غزل گو شعرا سماجی اور سیاسی موضوعات کے بیان میں پھیکے اور بیٹھے ہو جاتے ہیں۔ یا ان کا انداز بیان ایسا ہو جاتا ہے کہ نظم اور غزل کا فرق باقی نہیں رہتا۔ مجروح کے یہاں یہ بات نہیں ہے۔ پھر وہ غزل کے مخصوص الفاظ کے ذخیرے میں نئے الفاظ کا اضافہ کرتے ہوئے بھی نہیں گھبراتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مخصوص خود اعتمادی کے ساتھ جہاں ضرورت سمجھی ہے ایسے نئے الفاظ بھی استعمال کر لئے ہیں جو نظموں میں تو آسانی سے کھپ جاتے ہیں لیکن غزل کو خراب کر دیتے ہیں۔ مجروح نے ان کی مدد سے نئی تصویریں بنائی ہیں اور غزل کو نیا حسن دیا ہے اور اس کے طریقۂ اظہار میں اضافہ کیا ہے۔ مثلاً:(۱)

جبیں پر تاج زر پہلو میں زنداں بینک چھاتی پر
اٹھے گا بے کفن کب یہ جنازہ ہم بھی دیکھیں گے

مسلط زندگی پر کب سے ہے زنداں کی تاریخی
نکل اے مہر آزادی اجالا ہم بھی دیکھیں گے

(۱) مقام اور کلام مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۷

اب زمین گائے گی ہل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے

مجروح کے یہاں جوش وولولہ، کچھ کر جانے کی آرزو اور زندگی کی خاطر موت سے لطف ا
ہونے کا جو تاثر نظر آتا ہے وہ انھیں تمام معاصر غزل گویوں میں ممتاز کرتا ہے۔

جگائیں ہم سفروں کو جلائیں مشعل شوق
نہ جانے کب سحر ہو کون انتظار کرے

مثال ملتی ہے کتنو ں کی اس دیوانے سے
چمن سے دور جو بیٹھا غم انتظار کرے

سیر حاصل کر چکے اے موج ساحل سر نہ مار
تجھ سے کیا بہلیں گے طوفانوں کے بہلائے ہوئے

ہے یہی اک کارو بار نغمہ و مستی کے ہم
یا زمیں پر یا سر افلاک ہیں چھائے ہوئے

اکتا کے ہم نے توڑی تھی زنجیر نام و ننگ
اب تک فضا میں ہے وہی جھنکار دیکھئے

ترقی پسند تحریک کا جوہر جوان کے افکار میں رچا بسا تھا وہ بہترین اشعار کی صورت میں ہوتا رہا اور یہی تمام چیزیں ان کی شاعری کی پہچان بن گئیں ۔

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

بہ کر زمیں پہ ہے ابھی گردش میں خوں مرا
قطرے وہ پھول بنتے ہیں خاک وطن کے ساتھ

کس نے کہا کہ ٹوٹ گیا خنجر فرنگ
سینے پہ زخم نو بھی ہے داغ کہن کے ساتھ

چند اشعار کو چھوڑ کر بیشتر ایسے ہیں جو یا تو حسن و عشق اور شباب و شراب کی دلفریبیوں کی نغ
کر۔ تے ہیں یا کچھ آفاقی اقدار و عام قسم کی انسان دوستی پر دلالت کرتے ہیں، نہ کہ اشترا کی معاش

اور سیاست پر۔اس سلسلے میں سب سے پہلے مجروح کی دو بہترین غزلوں کو لیجئے:

جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہو تی گئی رسم چمن
دھیرے دھیرے نغمئہ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یو ں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

شرح غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل تک پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

مگر اے ہم نفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی
یہ رسم قید و زنداں ایک دیوار کہن تک ہے

کہاں بچ کر چلی اے فصل گل مجھ آبلہ پا سے
مرے قدموں کی گل کاری بیاباں سے چمن تک ہے

میں کیا جرعۂ خوں پی گیا پیمانۂ دل میں

بلا نوشی میری کیا اک مئے ساغر شکن تک ہے

نہ آخر کہہ سکا اس سے مرا حال دل سوزاں
مہ تاباں کہ جو اس کا شریک انجمن تک ہے

نوا ہے جاوداں مجروح جس میں روح ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

روح ساعت پر مشتمل نوائے جاوداں کی تمنا سیاسی اور معاشی نعرہ بازیوں سے پوری نہیں
اور جس نغمے کا چلن زمانے تک ہو وہ ایسی ہی نعرہ بازیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ شاعر کے فنی مو
سامنے رکھتے ہوئے مندرجہ بالا غزلوں کے اشعار پر ایک نظر ڈالنے سے آشکار ہو جاتا ہے کہ یہ
شاعر کے موقف کے مطابق ہیں اور ان میں سستی نعرہ بازی اور عارضی سیاست کے تیور نہیں ہیں
کچھ گہرے تجربات اور کچھ آفاقی احساسات ہیں جن کا تعلق یا تو حسن و عشق کے معاملات سے
اخلاقی اقدار سے یا بہ یک وقت دونوں سے۔ عرفاں کے ذریعے غم آرام جاں بنتا ہے، سوز جانا
دیگراں بن جاتا ہے۔ رسم چمن منقلب ہوتی ہے تو نغمۂ دل بھی فغاں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
جانب منزل اکیلا ہی رواں ہو جاتا ہے وہ بالآخر ایک کارواں بنالیتا ہے۔ کوئی انقلاب ہو اصلی پیر
وہی ہوگا جو ہر خاص و عام کا ساغر بھر دے گا۔ آبلہ پایان شوق جس طرف بھی چل پڑتے ہیں خا

گلستاں بنالیتے ہیں۔محبوب کے حضور شرح غم جتنی مختصر ہوگی اتنی ہی موئثر ہوگی اور مضمون وہی ؍
بنے گا جسے شاعر کا قلم چھولے گا۔

اس کے بعد جنون دل اتنا وسیع ہے کہ اس کا سلسلہ ایک گل پیرہن سے دار ورسن تک ؛
۔قیدوزنداں کی دیوار اتنی بوسیدہ ہے کہ اہل قفس کی شوریدہ سری ہی اسے توڑ دے گی ،آبلہ پایا
کے قدموں کی گل کاری بیاباں وچمن دونوں فصل گل سے ہم کنار ہیں شاعر کی بلانوشی مئے ساغر شکن
نرعہ خوں تک کو پیمانۂ دل سے فرد خلق کر لیتی ہے،شاعر کے دل سوزاں کا حال دیکھنے کے باوجود
محبوب کی انجمن میں شریک ہوکر بھی نہیں کہہ پاتا۔

زندگی کی مہکتی ہوئی غزل جیسا یہ نغمہ:

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

ہمیشہ زبانوں پر رہے گا۔

فیضؔ اور ظہیرؔ کاشمیری نے بھی اس مزاج اور اس پائے کے ایک دو شعر کہے ہیں لیکن غزل
ہو اور ترقی پسند مطالبات کی وفاداری کے بعد بھی زندہ شگفتہ رہے یہ کارنامہ واضح طور پر مجروحؔ کا
مجروحؔ کو ترقی پسند ادب میں یہ اہمیت اس وجہ سے ملی تھی کہ وہ ان دنوں ایسے شعر بھی کہتے

ہشیار سامراج کہ زنجیر ایشیا
ٹوٹے گی تیرے سلسلہ جان و تن کے ساتھ

۱۹۵۱ء

جبیں پر تاج زر پہلو میں زنداں بینک چھاتی پر
اٹھے گا بے کفن اب یہ جنازہ ہم بھی دیکھیں گے

۱۹۵۰ء

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کی کلیات ''مشعل جاں'' میں یہ اشعار حذف کر دیے گئے دیکھیں گے والی پوری غزل نظر نہیں آ رہی ہے۔ ذاتی طور پر مجھے یہ انداز پسند ہے اپنے عہد کے مطالبات کو برتنے کی اور پرکھنے کہ جسارت کرنی چاہیے۔ لیکن کچھ دنوں بعد توازن کے معیا تخلیقات کو پرکھتے رہنا یا اس میں ترمیم و اضافہ کرتے رہنا، ذہن وفکر کی سلامت روی کی طرف اشارہ ہے۔

ان کی غزل میں ہلکے شعر بھی اس معیار سے نیچے نہیں اترتے:

اب زمیں گائے گی اہل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے

من چلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے

میں کہ ایک محنت کش میں کہ تیرگی دشمن
صبح نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے

یہ غزل کے ہلکے شعر ہیں لیکن قابل ذکر ہیں۔ یہ اشعار ایک مرکزی خیال کے ملتے جلتے Shades ہیں۔ غزل کا معجزہ وہ ہوتا ہے۔ جب ایسے چار نہیں چالیس شعر دو مصرعوں میں سمو کر داستان ہو جاتے ہیں۔

یہاں مضمون اور موضوع غزل نہیں بن پائے۔ یہاں زبان و بیان کا مسئلہ نہیں۔ یہ سوچ ہے:

دست منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سر بازار سہی

ان شعروں میں اسلوب کا خوبصورت اور کامیاب ہنر ہے۔

مجروحؔ لکھ رہے ہیں وہ اہل وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

اسیر بند زمانہ ہوں صاحبان چمن
مری طرف سے گلوں کو بہت دعا کہیے

ڈاکٹر بشیر بدر کہتے ہیں:
مجروحؔ بھائی کتنے بڑے غزل گو ہیں کہ ایک سیاسی نظریے کو زندگی کے ایک جھوٹ کو غزل
بنانا چاہتے ہیں:(۱)

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشن چراغاں تم سے زیادہ

ہم بھی ہمیشہ قتل ہوئے اور تم نے بھی دیکھا دور سے لیکن
یہ نہ سمجھنا ہم کو ہوا ہے جان کا نقصاں تم سے زیادہ

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا

(۱) گلکاری وحشت کا شاعر مرتب: خلیق انجم ص ۱۵۶

میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

میں ہم آغوش صنم تھا مگر اے پیر حرم
یہ شکن کیسے پڑی آپ کے پیرہن میں

زندگی کی اس بے تہی پر ایسے تہدار کا اشعار ایک غزل کا سچا فنکار ہی کہہ سکتا ہے۔
ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ فرماتے ہیں:
''مجروحؔ نے جس مضمون کو بھی ہاتھ لگایا اسے 'جاوداں' بنا دیا۔''(۱)

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

پروفیسر عبدالستار دلوی فرماتے ہیں:
''مجروحؔ جدید اردو غزل کے ایک منفرد شاعر ہیں جن کے کئی اشعار ضرب المثل بن گئے مثلاً

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

(۲،۱) مجروح سلطانپوری (گلکاری وحشت کا شاعر مرتب): خلیق انجم ص ۱۲۹، ۲۰۳

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں کہ چراغ راہ میں جل گئے

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میرے عہد میں نہیں ہے یہ نشان سر بلندی
یہ رنگے ہوئے عمامے یہ جھکی جھکی نگاہیں

حادثے اور بھی گزرے تری الفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے اب میری تصویر نہ دیکھ

مجروح نے کلاسیکی سرمایہ کے مطالعہ اور ادراک سے تغزل سے بہترین شعروں سے اردو کو
وقار، تہذیب نفس عطا کی۔ ان کے ذیل اشعار اس کی مثالیں ہیں ۔

وہ بعد عرض مطلب ہائے رے شوق جواب اپنا
کہ وہ خاموش تھے اور کتنی آوازیں سنی میں نے

شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ جلا دیا کبھی اک چراغ بجھا دیا

جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

ملی جب ان سے نظر بس رہا تھا ایک جہاں
ہٹی نگاہ تو چاروں طرف تھے ویرانے

ہم تو پائے جاناں پر کر کے آئے اک سجدہ
سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے

اب تغزل ہی کے پیرایہ میں مجروح کی غزل کا دوسرا پہلو دیکھیے

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

سر پر ہوائے ظلم چلے سوجتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

روک سکتا ہے ہمیں زندان بلا کیا مجروؔح
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

لٹ گیا ہے قافلہ اہل جنوں بھی شاید
لوگ ہاتھوں میں لیے تار رسن جاتے ہیں

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

اسیر بند زمانہ ہوں صاحبان چمن
مری طرف سے گلوں کو بہت دعا کہیے

ڈاکٹر رضیہ حامد رقمطراز ہیں:(۱)

مجروؔح سلطان پوری زندگی کے شاعر ہیں۔انھوں نے زندگی کے بے شمار رنگ اپنی غز

(۱) مجروح سلطانپوری (گلکاری وحشت کا شاعر) مرتب: خلیق انجم ص ۲۸۹

کے اشعار میں پیش کئے ہیں:

یہ رکے رکے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں
یونہی کب تلک خدایا غم زندگی نباہیں

مجھے یہ فکر سب کی پیاس اپنی پیاس ہے ساقی
تجھے یہ ضد کہ خالی ہے مرا مے خانہ برسوں سے

ہزاروں ماہ تاب آئے ہزاروں آفتاب آئے
مگر ہمدم وہی ہے ظلمت غم خانہ برسوں سے

میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

سینے میں چھپ گیا ہے طلوع سحر کے ساتھ
اب شاخ دل پہ وہ گل رخسار دیکھیے

آ گئی فصل جنوں کچھ تو کرو دیوانوں
ابر صحر کی طرف سایہ فگن جاتے ہیں

جو ٹھہرتی تو ذرا چلتے صبا کے ہمراہ
یوں تو ہم روز کہاں سوئے چمن جاتے ہیں

بلبلو اپنی نوا فیض ہے ان آنکھوں میں
جن سے ہم سیکھنے انداز سخن جاتے ہیں

روک سکتا ہے ہمیں زندان بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

مجروحؔ کی شاعری کا یہ بہت بڑا کمال ہے جب وہ کہتے ہیں:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجروؔح کی غزل لفظیات، تشبیہیں، استعارے، تلمیحات سب ان کے مزاج کی عکاسی ہیں۔ مجروؔح زندگی کی سختیوں، شدتوں کو محسوس کرتے اور مصائب کو حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کا جذبہ اور جوان ہوتا گیا:

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

مجروؔح کا یہ بانکپن انھیں آمادۂ سفر کرتا ہے نئی نئی منزلوں کی طرف۔

ڈاکٹر سید احتشام الدین فرماتے ہیں:

''مجروؔح سلطان پوری ترقی پسند غزل گو شاعر ہیں۔ لیکن ان کا لہجہ کلاسیکی ہے۔ غزلوں منظر نگاری، تصویر کشی اور مرقع سازی کے جھماکے پیدا کرنا مجروؔح کے فن کمال میں داخل ہے۔ عصری آگہی اور کائنات کے جاری عمل سے وابستگی کے ساتھ، نئی کیفیات کو صحت زبان، الفاظ اور لہجے کی شستگی کے ساتھ برتا ہے۔ ترقی پسندانہ خیالات اور نقطۂ نظر کس طور پر شعری ڈھلے ہیں۔''(۱) ملاحظہ فرمائیں:

میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

(۱) مجروح سلطانپوری (گلکاری وحشت کا شاعر) مرتب: خلیق انجم ص ۳۰۲

اہل دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم
اب گہر سبک ہوگا جو کے ایک دانے سے

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک ستم کی یہ سیاہ رات چلے

غیرت سنگ ہے ساقی بہ گلوئے تشنہ
تیرے پیمانے میں جو موج ہے تلوار سہی

شب ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروان سحر نہ ہو
مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

ساحل کے سکون کو، اضطرب زندگی پر کبھی فوقیت نہیں دی۔ عزم ویقیں کے بغیر زندگی کو۔
سمجھا۔ طوفان سے کھیلنا، آمرانہ جبر وتشدد کے خلاف آواز بلند کرنے کو ہی اصل زندگی مانتے ہیں۔
سجے رنگین عمامے مجروحؔ کے دل درد آشنا کو کبھی متاثر نہیں کرتے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تقدیر کا شکوہ بے معنی جینا ہی تجھے منظور نہیں
آپ اپنا مقدر بن نہ سکے اتنا تو کوئی مجبور نہیں

سنتے ہیں کانٹے سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر یہ عزم جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں

غلام رہ چکے توڑیں یہ بند رسوائی
کچھ اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں

مثال ملتی ہے کتنوں کو اس دوانے سے
چمن سے دور جو بیٹھا غم بہار کرے

ترے پاز میں پہ ور کے رکے تراسر فلک پہ جھکا جھکا

کوئی تجھ سے بھی عظیم تر یہی و ہم تجھ کومگر نہ ہو

مرے عہد میں نہیں ہے یہ نشان سر بلندی
یہ رنگے ہوئے عمامے یہ جھکی جھکی کلاہیں

احترام آدم اور زمین کے لوگوں سے عشق، دردمندی اور فطری مسائل سے آنکھیں چا
سے سحرانگیز ماحول پیدا ہوتا ہے۔اس طرح کا ایک اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لیے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

رضوان احمد فرماتے ہیں:

''ان کے ساتھ ناقدین ادب نے جو بے اعتنائی برتی اس کی جھنجھلاہٹ بھی ان کے اشعا
میں ملتی ہے:''(۱)

بہت ہی کم ہے تو خال رخ بہاراں ہے
مری نوا کو ملی ہے وہ داغ پیرہنی

(۱) مجروح سلطانپوری (گلکاریٔ وحشت کا شاعر) مرتب: خلیق انجم ص ص ۳۱۳

ملے جو وقت نواسنجی ہزارو ں سے
ادھر بھی دیکھ تماشہ میری کم سخنی

اور پھر وہ خودستائی بھی کرنے لگتے ہیں:

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضمون کہاں
میں جسے چھو تا گیاوہ کاوداں بنتا گیا

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروحؔ
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

مجروحؔ کے یہاں کلاسیکی شعرا جیسی رجائیت اور نازک خیالی ہے۔غنائیت بھی ان کی
کاایک بڑا وصف ہے:

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

بچالیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ میرا ڈبو دیتے

سنتے ہیں کانٹے سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر یہ عزم جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ جلا دیا کبھی اک چراغ بجھا دیا

وہ تو کہیں ہیں اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شئے نگہ یار کی طرح

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مجروحؔ نے غزل میں سیاسی افکار داخل کیے تھے یہ پتہ نہیں کہ ان کا دعویٰ کہاں تک صحیح تھا کہ حسرتؔ کے بعد سب سے زیادہ افکار ان کی غزل میں ملتے ہیں لیکن ناقدین نے زیادتی یہ کی ہے اس کا سہرا فیض فیضؔ کے سر باندھ دیا ہے۔ ان کے سیاسی اشعار میں بھی کلاسیکی رچاؤ موجود ہے

روک سکتا ہے ہمیں زندان بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشن چراغاں تم سے زیادہ

مجروحؔ قافلے کی مری داستاں یہ ہے
رہبر نے مل کے لوٹ لیا راہزن کے ساتھ

مگر اے ہم قفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی
یہ رسم قید و زنداں ایک دیوار کہن تک ہے

مجروحؔ کا غزلیہ کلام مختصر ہے لیکن اس میں مختلف النوع اشعار ملتے ہیں جھنجھلاہٹ میں انھوں نے جو دعوے کر دئے ہیں کبھی کبھی وہ دل کو چھونے والے ہیں:

مجھے نہیں کسی اسلوب شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

اور اسی لئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بہت دنوں تک
کو چھوت رہی گی :

نوا ہے جاوداں مجروحؔ جس میں روح ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

مجروح کے یہاں تجربات، تخیل اور احساس کی بھٹی میں تپ کر ان کی شخصیت
جز بن گئے ہیں تبھی وہ کہتے ہیں۔

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

درحقیقت کوئی مضمون تخیل اور احساس کی بھٹی میں تپے بغیر جاوداں نہیں
اور سامع یا قاری کو متاثر نہیں کر سکتا۔ مجروح کا کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا
شاعر نے اوپری سطح سے شعر نہیں کہا بلکہ اس کے پیچھے ریاضت ہے، خلوص ہے
محض نہیں صحیہ حیات ہے۔

جب ہو اعرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

آخر غم جاناں کو اے دل بڑھ کر غم دوراں ہونا تھا
اس قطرے کو بننا تھا دریا اس موج کو طوفاں ہونا تھا

سوز جاناں سے سوز دیگراں اور غم جاناں سے غم دوراں تک کی منزلیں طے کرنا اتنا نہیں۔ پہلے تیشہ نیشہ سے اپنی ذات میں اٹھنے والی دیواروں کو ڈھایا جاتا ہے اور تب درد کا درد۔ قائم ہوتا ہے اور پھر کسی مجروح کی زبان پر آتا ہے ۔

ہا ں وہ بیدرد تو بیگانہ ہی اچھا یارو
جو نہ تو قیر غم درد گساراں سمجھے

اور پھر اسی لمحے سوز جاناں سوز دیگراں میں بدل جاتا ہے اور شاعر جو ابھی تک خواب میں پرواز کر رہا تھا اس کے پیر دھرتی پر ٹک جاتے ہیں ۔

ترے سوا بھی کہیں تھی پناہ بھول گئے
نکل کے ہم تری محفل سے راہ بھول گئے

مجروح جو ابتدا میں پندار تمنا ٹوٹنے پر دل کو نہ سنبھال سکے تھے، وہ درد مجسم بن گئے۔ ہوا، جاناں غم دوراں میں بدل گیا۔ ترقی پسند تحریک نے فکر و نظر کو اس خاص سمت پھیلا دیا جہاں سرخ

تھا۔ کچھ دیر کے لیے وا آنکھیں چکا چوند تو ہوئیں لیکن مجروحؔ ادائے طول سخن (نظم) اختیار کرنے کے بجائے بطرز نگاہ یار (غزل) عرض حال بیان کرتے رہے۔

شمع زنداں ہے مجھے ہر گلبدن سرخ ترا
میں تو دیوانہ ہوں اے انجمن سرخ ترا

ہوں میں آلودۂ خوں پھر بھی مرا شوق تو دیکھ
اب مرے تن پہ بھی ہے پیرہن سرخ ترا

تو بھی دیکھے تو یہ اب ہو نہ سکے گا معلوم
میرے سینے میں ہے دل یا وطن سرخ ترا

مجروحؔ چاہتے تھے کہ "دلبر سخن" سرخ لبادہ میں ہو تو لیکن اس میں تغزل اور رمزیت کا گوٹا ٹھپا، کناری بھی ٹکا ہو۔ مگر پرستاران قدیم کا تقاضا تھا کہ نہیں سرخ رنگ بس سرخ ہی ہونا چاہیے۔ یہ سنہری اور روپہلی چمک دمک آنکھوں کو بھلی نہیں لگتی۔ یہ امارت کی علامت ہے۔

ستم کہ تیغ قلم دیں اسے جوائے مجروحؔ
غزل کو قتل کرے نغمے کو شکار کرے

مجروحؔ ٹھہرے ازلی وضع دار۔ انھوں نے وضع داری برقرار رکھتے ہوئے وقت کے ساتھ خود کو اس طرح بدل لیا کہ کج کلاہی برقرار رہی ؂

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

اہل طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو بھنور کو چشم جانانہ کہیں

دار پر چڑھ کر لگائیں نعرۂ زلف صنم
سب ہمیں باہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں

ہجوم دہر میں بدلی نہ ہم سے وضع خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

منتظر ہیں پھر میرے حادثے زمانے کے
پھر مرا جنوں تیری بزم میں غزل خواں ہے

مجروحؔ نے غزل سے جو رشتہ قائم کیا وہ استوار رہا۔ مجروح پلک جھپکائے بغیر غزل مخالفوں سے آنکھ سے آنکھ ملاتے رہے۔ انھوں نے غزل کی کلاسیکی روایات کے ساتھ عصری حسیت کی تھوڑی سی پٹ ملا دی۔ ان سے پہلے حسرت موہانی نے سیاسی موضوعات کو غزل میں داخل کیا تھا لیکن مجروح کے یہاں یہ رنگ بہت تیز تھا۔ گو قد و گیسو سے دار و رسن تک غزل کی مانوس لفظیات برقرار تھی لیکن اس پٹ کی آمیزش سے لہجہ بدل گیا تھا۔ اب اس لہجہ میں بانکپن تھا۔ استعارہ اور پیکر میں پسی ہوئی بجلیاں تھیں:

اب جا کے کچھ کھلا ہنر ناخن جنوں
زخم جگر ہوئے لب و رخسار کی طرح

سوئے مقتل کے پئے سیر چمن جاتے ہیں
اہل دل جام بہ کف سر بہ کفن جاتے ہیں

آ گئی فصل جنوں، کچھ تو کرو دیوانو
ابر صحرا کی طرف سایہ فگن جاتے ہیں

توڑ دیں ہم جو نہ تلوار تو کہئے مجروح
تیغ زن کیا ہنر زخم شعاراں سمجھے

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشن چراغاں تم سے زیادہ

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

مجروحؔ کی اسی افتادِ طبع کے باعث غزل کی ''شان محبوبی'' اب مردانہ وجاہت میں بدل گئی۔ ساز غزل کے تاریک لخت جھنجھنا اٹھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نرم آواز اور دھیمے لہجے پر کسی نے دھار لگادی:

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح

بچاتے پھرتے آخر کب تلک دست عزیزاں سے
انھیں کو سونپ کر ہم تو کلاہ نام و ننگ آئے

میرے ہی سنگ و خشت سے تعمیر و بام و در
میرے گھر کو شہر میں شامل کہا نہ جائے

جس ہاتھ میں ہے تیغ جفا اس کا نام لو
مجروح سے تو سائے کو قاتل کہا نہ جائے

مجروح کے علاوہ بھی بہت شعرا نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی انفرادیت قابل احترام ہے ۔

آتی ہی رہی ہے گلشن میں اب کے بھی بہار آئی ہے تو کیا
ہے یوں کہ قفس کے گوشوں سے اعلان بہاراں ہونا تھا

مجروح کے جیل جانے سے ایک فاعدہ یہ ہوا کی ان کے اشعار میں زبردست دھار آ گئی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔ جذبؔی اور فیضؔ کے شعر دیکھئے ۔

شریک محفل دار و رسن کچھ اور بھی ہیں
ستمگرو ابھی اہل کفن کچھ اور بھی ہیں
(جذبؔی)

متاع لوح قلم چھن گئی تو کیا غم ہے

کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے
(فیضؔ)

پروفیسر محمد حسن فرماتے ہیں:

''سجاوٹ ان کی غزلوں میں محض تراکیب یا تشبیہ سازی سے عبارت نہیں بلکہ سجیلے پن اور البیلے پن کا نام ہے۔ پہلے ایک نظر ان کی عشقیہ شاعری پر ڈال لیں۔ پہلے جمال کا ایک منظر:(۱)

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

دور دور وہ مجھ سے اس طرح خراماں ہے
ہر قدم ہے نقش دل ہر نگہ رگ جاں ہے

(۱) مجموعہ ''غزل'' ص ۴

جمال صبح دیا روئے نو بہار دیا
مری نگاہ بھی دیتا خدا حسینوں کو

یہ سبھی اشعار مرکب تصویروں سے عبارت ہیں۔ ان اشعار میں کہیں آلودگی کا پر تو نہیں ہے۔ جمالیاتی انبساط معروضی انداز ہے۔ جہاں حسن نے اس جمالیاتی پیکر سے مجروح تعلق قائم کرتے ہیں وہاں بھی ربودگی کے باوجود ایک باوقار فاصلہ باقی رہتا ہے جو ان کی غزل کو سنبھالے رکھتا ہے اور سرمستی کے باوجود آلودہ نہیں ہونے دیتا۔"

یہ نیاز غم خواری یہ شکست دل داری
بس نوازش جاناں دل بہت پریشاں ہے

دل سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاک دامانی
نگاہ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

وہ لجائے مرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

سرخیِ مے کم تھی میں نے چھو لئے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جو بھی اب اربابِ میخانہ کہیں

ڈاکٹر وحید اختر فرماتے ہیں:

عشقیہ تجربے کے حامل وہ اشعار جن کو کلاسیکیت کے پورے رچاؤ کے ساتھ انفرادی تجربے نے وہ نئی آن دی ہے جس کے لئے سودا نے کہا تھا ؎(۱)

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

شعر کو، اور وہ بھی غزل کی شاعری کو سمجھنے کے لئے سودا کی طرح ''کسی خاص آن میں دیکھا'' ضروری ہے اور اس کی کیفیت کی نمائندگی مجروح کے ابتدائی دور کے یہ شعر کرتے ہیں ؎

کہاں وہ شب کہ ترے گیسوؤں کے سائے میں
خیالِ صبح سے پھر آستیں بھگو دیتے
بہانے اور بھی ہوتے ہیں زندگی کے لیے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

---

(۱) مقام اور کلام مجروح سلطانپوری مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۴۷

جو دیکھتے مری نظروں پر بندشوں کے ستم
تو یہ نظارے مری بے بسی پہ رو دیتے

التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے

مجھے نہیں کسی اسلوب شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

مجروحؔ کی انفرادیت ہے کہ ''کسی نگاہ کا جادو'' ان کی غزل میں رہا۔ ان کا یہ دعویٰ بے دلیل نہیں

کہ:

ادائے طول سخن کیا وہ اختیار کرے
جوعرض حال بطرز نگاہ یار کرے

مجروحؔ کے سامنے حسرتؔ کی یہ غزل ضرور رہی ہوگی ۔

وہ عرض حال بہ طرز نگاہ ناز کرے
تری نگاہ جسے آشنائے راز کرے

میرؔ کا شیخ میکدے میں خرقہ، عبا، عمامہ، رہن جام ومغبچہ کر دیتا ہے۔ فیضؔ کا واعظ سے تخاطب بھی نرم ہے:

ہوئی تھی حضرت ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرکوے یار گذری ہے

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گذرنے والے
ناصحو پند گرو راہگذر تو دیکھو

مجروح کے لہجے میں یہ نرمی نہیں ان کا انداز تخاطب حریفانہ اور بے باکانہ ہے:

یہ محفل اہل دل ہے یہاں ہم سب میکش ہم سب ساقی
تفریق کریں انسانوں میں اس بزم کا یہ دستور نہیں

محتسب ساقی کی چشم نیم وا کو کیا کروں
میکدہ کا در کھلا گردش میں جام آہی گیا

دیکھ کلیوں کا چٹکنا سر گلشن صیاد
زمزمہ سنج مرا خون جگر ہے کہ نہیں

میں جو کہتا تھا سو اے رہبر کوتاہ خرام
تیری منزل بھی مری گرد سفر ہے کہ نہیں

مرے ہاتھ ہیں تو بنوں گا خود میں اپنا ساقی میکدہ
خم غیر سے تو خدا کرے لب جام بھی مرا تر نہ ہو

ستم کہ تیغ قلم دیں اسے جو اے مجروح
غزل کو قتل کرے نغمے کو شکار کرے

ضبط ہے اے ہمنشیں عقل حریفان بہار
ہے خزا ان کی انھیں آئینہ دکھلائے ہوئے

کیا ہے ذکر آتش و آہن کہ عذاران گل
مارتے ہیں ہاتھ انگاروں پہ گھبرائے ہوئے

مجروم تھے جو ہم سو قید ہوئے صیاد مگر اب یہ تو بتا
ہر وقت یہ کس کو ڈھونڈتے ہیں دیوارا کے سائے زنداں میں

منعم کی طرح پیر مغاں پیتے ہیں وہ جام
رندوں کو بھی جس جام سے پرہیز بہت ہے

ہم اہل عشق میں نہیں حرف گنہ سے کم
وہ حرف شوق جو سر منزل کہا نہ جائے

حسن نعیم رقمطراز ہیں:

مجروح کی عشقیہ شاعری میں ایک والہانہ پن اور سر بلندی ہے۔ ویسے ان کا طریقۂ فکر اتنا مہذب اور سنجیدہ ہے کہ ہم ان کے محبوب سے کہیں زیادہ ان کے جذبۂ عشق اور متعلقہ مسائل سے متعارف ہوتے رہتے ہیں۔ محبوب بس ایک خواب، ایک پرچھائیں اور ایک آئیڈل کے طور پر ان کے اشعار میں اپنی جھلک دکھاتا ہے: (۱)

وہ تو کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہ یار کی طرح

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آ کر
سوچتا ہوں یہ تری راہ گذر ہے کہ نہیں

(۱) مقام اور کلام مجروح سلطانپوری مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۱۰۱

غم حیات نے آوارہ کردیا ورنہ
تھی آرزو کہ ترے در پہ صبح و شام کریں

اس کارگہ دہر میں لگتا ہے بہت دل
اے دوست کہیں یہ بھی ترا غم تو نہیں ہے

352

ان اشعار میں ''راز و نیاز'' کی فضا نہیں ہے بلکہ ایک ایسے شخص کی روداد طلب ہے جو کسی تگ ودو میں مبتلا ہے، اور پل بھر کے لیے کسی گوشہ میں بیٹھ کر خود سے ہم کلام ہے۔

فضیل جعفری فرماتے ہیں:

مجروح سلطان پوری نے مارکسی حقیقت نگاری کو کلاسیکی تغزل سے پوری طرح ہم آہنگ کردیا ہے۔مثال کے طور پر:(۱)

توڑ دیں ہم جو نہ تلوار تو کہیے مجروح
تیغ زن کیا ہنر زخم شعاراں سمجھے

پروفیسر عبدالمغنی رقمطراز ہیں:

''مجروح تخیل کی باریکی اور احساس کی لطافت کے ساتھ الفاظ کی ترتیب اور تراکیب کے استعمال کا ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔فن غزل گوئی کی استواری مجروح کے مجموعے کلام ''غزل'' کے

(۱) مقام اور کلام مجروح سلطانپوری مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۱۰۶

دوسرے بہترین اشعار بھی نمایاں ہیں۔(۱)

فکر کیا انھیں جب تو ساتھ ہے اسیروں کے
اے غم اسیری تو خود شکستہ زنداں ہے

اپنی اپنی ہمت ہے اپنا اپنا دل مجروحؔ
زندگی بھی ارزاں ہے موت بھی فراواں ہے

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاش دست رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقش پا سے راہیں

ترے خانماں خرابوں کا چمن کوئی نہ صحرا
یہ جہاں بھی بیٹھ جائیں وہیں ان کی بارگاہیں

سنتے ہیں کہ کانٹے سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر یہ عزم جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں

(۱) مقام اور کلام مجروح سلطانپوری مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۱۱۵

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا خیال ہے:

مجروح نے اردو غزل کی جو خدمت کی ہے اور غزل کو ارتقا کی جن منزلوں سے آشنا کیا ہے، ان کا احاطہ نہایت مشکل ہے۔ لیکن سال بہ سال ان کی غزلوں کی اشعار دیکھ کر ہم کچھ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جس شاعر نے ۱۹۴۱ء میں یہ خالص رومانی شعر کہے: (۱)

کس کس کو ہائے تیرے تغافل کا دوں جواب
اکثر تو رہ گیا ہوں جھکا کر نظر کو میں

وہ ۱۹۴۳ء سے کچھ یوں کہنے لگتا ہے:

جس شوخ نظر کی میں محفل میں آنسو بھی تبسم بن جائے
واں شمع جلائی جائے گی پروانے کا ماتم کیا ہوگا

۱۹۴۴ء ...

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاش دست رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقش پا سے راہیں

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۱۴۲

ہندوستانی رہنما جیل میں بند ہیں۔ ملک ایک بدحالی کا شکار ہے اور ادھر دنیا سرخ فوج کی جواں مردی کے افسانے سن رہی ہے۔ ہٹلر کی شکست کا آغاز ہو چکا ہے۔ تب اس شعر کے تہہ در تہہ معنی آپ پر آشکار ہوں گے:

بچالیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

۱۹۴۵ء ...

تبسموں نے نکھارا ہے کچھ تو ساقی کے
کچھ اہل غم کے سنوارے ہوئے ہیں میخانے

۱۹۴۶ء ...

یہ ذرا دور پہ منزل یہ اجالا یہ سکوں
خواب کو دیکھ ابھی خواب کی تعبیر نہ دیکھ

۱۹۴۷ء ...

ہزاروں ماہتاب آئے ہزاروں آفتاب آئے
مگر ہمدم وہی ہے ظلمت خانہ برسوں سے
وہی مجروحؔ سمجھے جسے آوارۂ ظلمت
وہی ہے اک شمع سرخ کا پروانہ برسوں سے

مسرت ہو کہ غم سب سے گذرتا جا رہا ہوں میں
غم دوراں سلامت اب سدھرتا جا رہا ہوں میں

۱۹۴۸ء ...

تقدیر کا شکوہ بے معنی جینا ہی تجھے منظور نہیں
آپ اپنا مقدر بن نہ سکے اتنا تو کوئی مجبور نہیں
سنتے ہیں کہ کانٹے سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر یہ عزم جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں

جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

۱۹۴۹ء ...

وہ جس کے گداز محبت سے پرنور شبستاں ہے تیرا
اے شوخ اسی بازو پہ تری زلفوں کو پریشاں ہونا تھا

آیا ہے ہمارے ملک میں بھی اک درد زلیخائی یعنی
اب وہ غم زنداں دیتے ہیں جن کو غم زنداں ہونا تھا

اب کھل کے کہوں گا ہر غم دل مجروحؔ نہیں وہ وقت کہ جب
اشکوں میں سنانا تھا مجھ کو آہوں میں غزل خواں ہونا تھا

میں کہ ایک محنت کش میں کہ تیرگی دشمن
صبح نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے

زنجیر و دیوار ہی دیکھی تم نے تو مجروحؔ مگر ہم
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں عالم زنداں تم سے زیادہ

''چکی کی مشقت'' نے حسرت پر جو رنگ چڑھایا وہی کام جیل نے مجروح نے کیا ہوگا۔ چنانچہ جیل سے مجروح نے کچھ یہ شعر لکھ بھیجے ۔

پھر بھی کہلاؤں گا آوارۂ گیسوئے بہار
میں ترا دام خزاں لاکھ گرفتار سہی

جست کرتا ہوں تو لڑ جاتی ہے منزل سے نظر
حائل راہ کوئی اور بھی دیوار سہی

ہو تیغ اثر زنجیر قدم پھر بھی ہیں نقیب منزل ہیں ہم
زخموں سے چراغ راہ گذر بیٹھے ہیں جلائے زنداں میں
مجرم تھے جو ہم سو قید ہوئے صیاد مگر اب یہ تو بتا
ہر وقت یہ کس کو ڈھونڈتے ہیں دیوار کے سائے زنداں میں

۱۹۵۲ء سے ہندوستان کے لیل ونہار بدل گئے تھے۔ ہند کا اپنا ایک آئین ہو چکا تھا۔ پارلیمنٹ ہے۔ اب زندگی کی کشمکش کے تیور اور تھے۔

مجروح نے پھر شعر میں اس نئے پن اور اس نئے دور کی انفرادیت کو ڈھال لیا۔ ۱۹۵۲ء میں یو

کہتے ہیں ؎

دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آ کر
سوچتا ہوں یہ تری راہ گذر ہے کہ نہیں
روئے مشرق کی قسم ہم کو ہے اتنا معلوم
شب دوراں ترے پہلو میں سحر ہے کہ نہیں
میں جو کہتا تھا سو اے رہبر کو تاہ خرام
تیری منزل بھی مری گرد سفر ہے کہ نہیں

''کوتاہ خرام'' ترکیب پر غور فرمایئے اور ایسے ہی ''رہبر'' کی ''منزل'' مجروح کے سفر کی گرد ہی تو ہے:

۱۹۵۴ء ...

خدا کرے غم گیتی کا پیچ و تاب اے دوست
کچھ اور بھی تری زلفوں کو تابدار کرے
اہل طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو بھنور کو چشم جانانہ کہیں

یار نکتہ داں کدھر ہے پھر چلیں اس کے حضور

زندگی کو دل کہیں اور دل کو نزرانہ کہیں

پارۂ دل ہے وطن کی سر زمیں مشکل یہ ہے

شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں

۱۹۵۹ء کے آتے آتے مجروح یوں کہتے ہیں۔

کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے

ہوئے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

اور مجروحؔ کی غزل آپ سے یوں مخاطب ہوتی ہے۔

بچاتے پھرتے آخر کب تلک دست عزیزاں سے

اسی کو سونپ کو ہم تو کلاہ نام و ننگ آئے

اکتا کے ہم نے توڑی تھی زنجیر نام و ننگ

اب تک فضا میں ہے وہی جھنکار دیکھئے

برق تپیدہ ،باد صبا ،شعلہ اور ہم
ہیں کیسے کیسے اس کے گرفتار دیکھئے

اس باغ میں وہ سنگ کے قابل کہا نہ جائے
جب تک کسی ثمر کو مرا دل کہا نہ جائے

میرے ہی سنگ و خشت سے تعمیر بام و در
میرے ہی گھر کو شہر میں شامل کہا نہ جائے

چودھری محمد نعیم رقمطراز ہیں:

''مجروح انسان کواور اس عالم امکان کو کائنات میں مرکزیت کا درجہ دیتے ہیں اور ان روایات کی تردید کرتے ہیں جو انسان کو مجبور اور محکوم بنا کر ہی رکھنا چاہتی ہیں ۔

ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں ابھی فردوس و جناں کے شیدائی
تجھ کو تو ابھی کچھ اور حسیں اے عالم امکاں ہونا تھا
جو مٹی کو مزاج گل عطا کر دیں وہ اے واعظ
زمیں سے دور فکر جنت آدم تو کیا کرتے

اور ایک تیسرا وقیع ترین پہلو وہ ہے جب یہ انفرادیت اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہوئے خود کو ایک غیر محدود سلسلے کا جزو سمجھتی ہے۔ مثلاً ان اشعار میں ؎

مجھے یہ فکر سب کی پیاس اپنی پیاس ہے ساقی
تجھے یہ ضد کہ خالی ہے مرا پیمانہ برسوں سے

میں ہزار شکل بدل چکا چمن جہاں میں سن اے صبا
کہ جو پھول ہے ترے ہاتھ میں یہ مرا ہی لخت جگر نہ ہو

انھوں نے ایک مقطع میں اپنا مطمح نظر اس طرح بیان کیا ہے ؎

ہم روات کے منکر نہیں لیکن مجروحؔ
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

میں نے جو اشعار ابھی آپ کے سامنے پیش کیے ان کے مآخذ تلاش کرنے کی مجھے کوئی خاص خواہش نہیں۔ یہ اشعار خود اپنی جگہ دلکش اور موثر ہیں۔ ان میں جو سرشاری اور بے ساختگی ہے وہ تبھی ممکن ہوتی ہے جب جذبہ اور فن حقیقی طور پر ایک مکمل اکائی بن جائیں۔ لیکن مجروحؔ نے اپنے مقطع میں جو دعویٰ کیا ہے وہ محض شاعرانہ تعلّی نہیں۔ اس میں کچھ حقیقت بھی ہے مثال کے طور پر اوپر تحریر کیا ہوا شعر ؎

میں ہزار شکل بدل چکا چمن جہاں میں سن اے صبا
کہ جو پھول ہے ترے ہاتھ میں یہ مرا ہی لخت جگر نہ ہو

بہت ممکن ہے کہ اس شعر لوگوں کو غالب کے اس مشہور مطلع کی گونج سنائی دے ۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ٹھیک اسی طرح جب غالب کے مطلع میں بقول مجروح فارسی کے کسی استاد کے اس شعر کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے ۔

ہزاراں گل رخان ماہ وش زیر زمیں افتند
ز خاک ایں لالہ و گل راہ کہ می بینی ازاں بینی

لیکن مجروح کے شعر اور غالب کے مطلع میں مماثلت کے ساتھ ساتھ کچھ فرق بھی ہے۔ غالب کا مطلع غمناکی کی کیفیت لئے ہے۔ مجروح کے شعر میں والہانہ پن ہے اور سطحی مماثلت سے ہٹ کر غور کریں تو اچھا خاصہ فرق نکلے گا کیوں کہ مجروح کے شعر میں ''انا'' اور ''غیر انا'' یا دیگر الفاظ میں

''میں'' اور ''چمن'' کے بیچ جو جدلیاتی تعلق ہے اس کا غالب کے مطلع اور فارسی کے شعر کے موضوع سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب کا مطلع لازوال ہے اور فارسی شعر سے بدر جہاں بہتر۔ ایک دوسری مثال مجروح کا یہ شعر۔

نہ دیکھیں دیر وحرم سوئے راہوان حیات
یہ قافلے تو نہ جانے کہاں قیام کریں

یہ شعر پڑھتے وقت میرا ذہن لامحالہ غالب کے ایک عجیب وغریب شعر کی طرف جاتا ہے۔

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

دیر وحرم جو محدود اور منجمد ہیں و متحرک اور لامحدود شوق اور تمنا کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ ان کا وجود تو تمنا کی تکرار اور شوق کی وامندگی کا مرہون منت ہے۔ اگر تمنا بھرپور ہو تو پھر تو وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو خود غالب نے ہی ایک اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب شعر میں بیان کر دیا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

غالب کے پہلے شعر میں دیر وحرم کی تخلیق انسان کی اپنی کوتاہ دستی یا کوتاہی شوق کا نتیجہ ہے۔ مجروح کے شعر میں انسان کا جورہ رو حیات ہے، دیر وحرم سے اس طرح کا کوئی تعلق نہیں۔ یا اگر کبھی رہا ہوگا تو وہ اس کو توڑ چکا ہے۔ مجروح کا ''رہرو حیات'' تو دیر وحرم سے اسی طرح بے زار ہے جس طرح اقبال کا ''میں'' خردمندوں سے۔

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا ہے

ان کے دیوان کی تازہ ترین اشاعت میں بہت سی پرانی غزلیں اور کچھ پرانی غزلوں کے بعض اشعار شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ مثلاً ۱۹۵۱ء کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے

دست منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سر بازار سہی

اصل غزل میں آٹھ اشعار تھے، لیکن ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں دو شعر کم کر دئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔

بول کچھ بول مقید لب اظہار سہی
سر منبر نہیں ممکن تو سر دار سہی

آنے دے باغ کے غدار مرا روز حساب
مانگے تنکا نہ ملے گا یہی گلزار سہی

موخرالذکر شعر میں مجروح کو نہ صرف یہ اعتماد ہے کہ ایک دن روز حساب ضرور آئے گا بلکہ وہ یہ بھی وضاحت سے بتا دیتے ہیں کہ اس دن ستمگاروں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔اس کے مقابلے میں فیض کی ۵۴ء کی ایک غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔ روایت کا حوالہ یکساں ہے لیکن لہجہ کا فرق قابل توجہ ہے۔

غرور سرو وسمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار وخس والئ چمن تھے عروج سرو وسمن سے پہلے
فیض

مجروح کی ۱۹۴۷ء کی ایک غزل کا ایک شعر ہے۔

گریزاں تو نہیں تجھ سے مگر تیرے سوا دل کو
کئی غم اور بھی ہیں اے غم جانانہ برسوں سے

کچھ لوگ یہ کہ سکتے ہیں کہ اس شعر میں وہی بات دہرائی گئی ہے جس کو فیض نے چند سال پیشتر اپنی بے حد مشہور اور عہد آفریں نظم:

''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ''

اور جس کا یہ مصرعہ ضرور مجروح کے ذہن میں گونجا ہوگا۔

''اور ابھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا''

لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مجروح اور فیض دونوں سے سو برس پہلے غالب ایک ایسا شعر کہہ گئے جو فیض کی نظم اور مجروح کے شعر دونوں سے زیادہ خیال انگیز ہیں۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

روایات کی طرف یکساں رویہ اور عصری تجربات میں بھی خاصی یکسانیت ہونے کی وجہ سے مجروح اور فیض کی غزلوں میں توارد کا امکان خاصہ تھا۔لیکن بہت تلاش کے بعد مکمل توارد کی صرف ایک ہی مثال مل سکی۔ دونوں نے ۱۹۵۴ء میں ایک ہی مضمون کو تقریباً ایک ہی انداز میں باندھا ہے۔ پہلے فیض کا شعر ملاحظہ ہو۔

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گذر کر جاتی ہے

اس مضمون کا مجروح کا شعر ہے۔

دیار جو ر میں رستہ ہے اک یہی ورنہ
کسے پسند ہے اے دل کہ سیر دار کرے

دونوں شعر ایک ہی ذہنی کیفیت، یعنی Resignation کے مظہر ہیں۔لیکن یہ کیفیت فیض کے مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور اسی لئے کسی کسی کو فیض کا شعر زیادہ دلکش معلوم ہوتا ہے۔اس میں جو Understatment ہے وہ مجروح کے شعر میں دیار جور اور سیر دار کی وضاحت اور اے دل کے خطیبانہ لہجے کی وجہ سے مفقود ہے۔اس کے برخلاف ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو جو دونوں کی افتاد طبع کو بخوبی اجاگر کرتی ہے۔فیض اور مجروح دونوں انقلاب پسند رہے ہیں ۔انقلاب پسندوں کی ایک خاص عادت یہ رہی ہے کہ انھیں بیشتر اپنے بعد آنے والی نسلوں سے شکایت رہتی ہے، خاص طور پر جب وہ خود کو بڑا سمجھنے لگتے ہیں۔فیض کو دیکھئے ۔

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
ہم شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

یہ فیض کا مخصوص اسلوب ہے پہلے مصرعے کی زیر لب طنزیا Irony دوسرے مصرعے کا Understatment۔روایت (فرہاد) کا حوالہ۔لیکن مجموعی تاثر اس طرح کا ہے جیسے کوئی شخص کسی سیدھی سی بات کو چباچبا کر کہے۔اس کے برخلاف یہ ذہنی کیفیت مجروح کی افتادطبع سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے وہ کھل کر بات کرنے کے عادی ہیں چنانچہ ان کا یہ مطلع اس ذہنی کیفیت کو بخوبی ادا کرتا ہے اور کچھ بھی لگی لپٹی نہیں رہنے دیتا، حالانکہ بات وہ بھی روایت کے حوالے سے ہی کرتے ہیں ۔

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کئے ہیں ہم نے عزیزو، چار گریباں تم سے زیادہ

اب تک یہ گفتگو کسی نہ کسی طور پر مجروح کی غزل کے سیاسی رنگ کے حوالے سے ہی رہی ہے ۔ یہ ضروری بھی تھا کیوں کہ مجروح نے سیاسی معاملات خاص طور پر عصری سیاست معاملات کو اپنی غزل میں اہتمام سے اور وضاحت سے پیش کیا ہے اور ترقی پسند ادبی تحریک کو ان کا یہ خاص ہدیہ ہے لیکن بقول ان کے ۔

قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

یہاں ایک بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ وہ خواہ جام شریعت اور سندان عشق کی ثنویت ہو یا گیسوئے یار اور رسن و دار کی، غم جاناں اور غم دوراں کی آویزش ہو یا گلستان اور صحرا کا تضاد... چنانچہ جب ہم رسن و دار کی بات کرنے کے بعد ایک الگ شق گیسوئے یار کی قائم کرتے ہیں تو یہ محض اپنی آسانی کے لیے کرتے ہیں۔ خود مجروح کے ذہن میں یہ دو الگ خانے نہیں۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ۔

اب کارگہ دہر میں لگتا ہے بہت دل
اے دوست کہیں یہ بھی ترا غم تو نہیں ہے

اور ایک دوسرے شعر میں تو اس باہمی رشتہ کی اہمیت کو بہت ہی اصرار کے ساتھ پیش کیا ہے ۔

کرو مجروح دار و رسن کے تذکرے ہم سے
جب اس قامت کے سائے میں تمھیں جینے کا ڈھنگ آئے

جینے کا ڈھنگ عشق سے آتا ہے اور عشق کے اپنے بھی آداب ہوتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ غزل گو شعرا نے جہاں عشق کے تعلق سے جنون وحشت وارفتگی ،لغزش وغیرہ کا ذکر کیا ہے وہیں ساتھ ساتھ سلیقہ ،ادب قرینہ احتیاط کا بھی ۔لیکن اس طرح کے جنون کو سلیقہ کہا اور لغزش کو ہوش مندی ۔کیوں کہ شاعر موجود کی دنیا سے جب بے اطمینان ہو جاتا ہے تبھی شعر کی دنیا کی تخلیق ہوتی ہے اور لازم ہے کہ اپنی انتہائی باتوں میں وہ موجود کی دنیا سے بالکل مختلف ہو۔اس بات کو ذہن میں تازہ کرنے کے لئے میر کا ایک شعر کافی ہوگا ۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا
میر

مجروح کی عشقیہ شاعری کی چند اور مثالیں:

دل سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاکدامانی
نگاہ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

ان سے بچھڑے ہوئے مجروح زمانہ گذرا
اب بھی ہونٹوں میں وہی گرمیٔ رخسار سہی

371

وہ کون سی صبحیں ہیں جن میں بیدار نہیں افسوں تیرا
وہ کون سی کالی راتیں ہیں جو میرے نشے میں چور نہیں

جنت بہ نگہ، تسنیم بہ لب، انداز اس کے اے شیخ نہ پوچھ
میں جس سے محبت کرتا ہوں، انساں ہے خیالی حور نہیں

میرے شکوۂ غم سے عالم ندامت میں
اس لب تبسم پر شمع سی فروزاں ہے

ان اشعار کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مجروح جو رزم گاہ دہر میں تیغ بے نیام نظر آتے تھے جب بزم یار میں واپس لوٹتے ہیں تو دبے قدم داخل ہوتے ہیں۔ لیکن سرشاری

اور وقار ذات کا تاثر دونوں جگہ رہتا ہے۔

عبدالقوی وسنوی رقمراز ہیں:

''ترقی پسند غزل گویوں میں سوا فیضؔ کے کوئی ایسا نہیں ہے جس نے غزل کی خوبی یا خصوصیت میں کوئی قابل لحاظ اضافہ کیا ہو۔ ان غزل گویوں کے کلام میں اشترا کی تصورات کی کارفرمائی ملتی ہے۔ جہاں کہیں یہ غزل کے آداب سے انحراف کرتے ہیں مضحکہ خیز حد تک بے سرے ہوجاتے ہیں، یہ بات سے زیادہ مجروحؔ کے یہاں ملتی ہے۔ یوں مجروحؔ کی غزلیں بڑی دل آویز ہوتی ہیں اور ایک زمانے میں مجھے اس خیال سے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ آگے چل کے غزل گویوں میں وہ اپنے لیے بڑا اونچا مقام پیدا کریں گے لیکن ترقی پسند حلقہ میں پہنچ کر وہ غالبؔ کے اس شعر کو فراموش کر گئے۔''(۱)

پیمانہ بر آں رند حرام است کہ غالبؔ
در بے خودی اندازۂ گفتار نہ داند

''مجھے اندیشہ ہے کہ وہ جلد نہ سنبھلے تو کہیں ان کا حشر وہی نہ ہو جو یاسؔ چنگیزی کا ہوا۔''

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۱۶۵

یہ خیالات رشید احمد صدیقی نے اس وقت ظاہر کیے ہیں جب مجروحؔ سلطان پوری غالباً ۱۹۴۱ء میں تقریباً بائیس یا تئیس سال کی عمر میں شعروشاعری شروع کر کے اور نظم گوئی کو منہ لگا کر کچھ کچھ بیزار ہو چکے تھے اور غزل کی زلف میں اسیر اور اس کے محبوبانہ انداز سے سرسار ہو کر بالکل اسی کے ہو رہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی پینتیس سال کی فکری اور شعری دولت بنام ''غزل'' ۱۹۵۳ء میں پیش کر چکے تھے۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد ان کی غزلوں پر اس کا زبردست اثر پڑا۔ اس تحریک سے وابستہ ہوئے سے پہلے ۱۹۴۴ء تک ان کی جو غزلیں مطبوعہ صورت میں ملتی ہیں وہ کل چار ہیں۔ اگر چہ اس بات پر یقین کرنے کا جی نہیں چاہتا ہے کہ اس وقت تک انھوں نے اس قدر کم غزلیں کہی ہوں گی ... ہاں یہ ممکن ہے کہ انھوں نے نہایت سخت انتخاب کیا ہے۔ بہرحال وہ غزلیں یہ ہیں:

کب تلک ملوں جبیں سے اب اس سنگ در کو میں ۱۹۴۱ء

پندار تمنا ٹوٹ کے بھی دل کا کوئی عالم کیا ہوگا ۱۹۴۳ء

یہ رکے رکے سے آنسو، یہ دبی دبی سی آہیں ۱۹۴۴ء

مسرتوں کو یہ اہل ہوس نہ کھو دیتے ۱۹۴۴ء

یہ بات بھی سچ ہے کہ یہ غزلیں ایسی نہیں ہیں کہ اپنی طرف کسی خاص سبب سے متوجہ کر لیں۔ وہی جذبات عشق، وہی تغافل دوست کے شکوے، جبین عاشق اور سنگ آستاں، عالم رخصت، رکے رکے سے آنسو، دبی دبی آہیں، گیسوؤں کے سائے سرشک غم اور زخم تمنا کھانے کی بات

لیکن ان میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں اگر خیالات بالکل نئے نہیں لیکن مجروحؔ کی شاعری کی سمت طے کرنے میں مدد ملتی ہے اور یہ اندازہ ہونے لگتا ہے کہ وہ غم جاناں کی زبان میں غم دوراں سے بھی باخبر کرنا چاہتے ہیں:

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاش دست رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقش پا سے راہیں

یا

بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

یہ اشعار ۱۹۴۴ء یعنی ترقی پسند تحریک سے وابستگی سے پہلے کے ہیں۔ بعد میں ان کے یہاں ترقی پسندانہ خیالات میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ۱۹۵۱ء میں قید کر لئے جاتے ہیں۔ یہ زمانہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک چھ سال پر محیط ہے۔ اس زمانے کی مطبوعہ غزلیں جوان کے مجموعۂ کلام ''غزل'' میں ملتی ہیں وہ کل تیرہ ہیں، یہاں بھی مجروحؔ نے بڑی سختی سے انتخاب کیا ہے، اسی لیے اس مدت میں اس حد تک کم غزلیں ملتی ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مجروحؔ سلطان پوری کا تعلق فلم سے بھی ہو گیا تھا، اور ہندوستان کی جنگ آزادی فاتحانہ اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی اور انگریزوں کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکی تھیں اور سارا ہندوستان آزادی کی نعمت پا کر رقص کرنے لگتا ہے اور آزادی کے ترانے میں محو ہو جاتا ہے۔ جنانچہ ایسے ہی زمانے کی مجروح کی غزلوں کا جب ہم جائزہ

لیتے ہیں تو جہاں... ''نگاہ ساقی نامہرباں کی شکایت''، ''حیات کو لغزش پیہم کا نام دینا''، ''محبوب کا صبح عارض پر لئے زلفوں کی شام آنا'' اور ''چراغ راہ کا جلنا''، ''چہرے پر زلف کا اڑنا''، ''شبوں کے راز کا مچلنا''، ''نگاہ یار کا برسوں سے افسانہ کہنا'' اور ''پائے جاناں پر سجدے کرنا'' وغیرہ کی تصویریں آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہیں، وہاں دلکش آوازیں سنائی دیتی ہیں اور رنگا رنگ کیفیتوں سے دل لطف اندوز ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی پسندیدہ نئی آواز کانوں سے دل میں اتر رہی ہے، زبان سادہ، انداز دلنشیں، خیالات پاکیزہ، موضوعات پسندیدہ، ملاحظہ کیجیے:

ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی ہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے

ملی جب ان سے نظر بس رہا تھا ایک جہاں
ہٹی جو آنکھ تو چاروں طرف تھے ویرانے

منتظر ہیں پھر میرے حادثے زمانے کے
پھر مرا جنوں تیری بزم میں غزل خواں ہے

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

ہمارے شاعر کی دنیا صرف رنگ و بو کی دنیا نہیں، اسے صرف حسن و عشق کی کہانی سے سروکار نہیں بلکہ اسے اس دنیا کی بھی فکر پریشان رکھتی ہے جہاں گوشت پوست کا انسان ہے اور اس کی دکھ بھری کہانیاں ہیں۔ ہزرون مسائل سر اٹھاتے ہیں۔اور ہزاروں پریشانیاں منہ چڑھاتی ہیں اور وہ ان سے مضطرب دکھائی دیتا ہے اور ان کا مداوا چاہتا ہے، ملاحظہ کیجئے ایسے اشعار جن میں اس طرف اشارے ملتے ہیں:

گریزاں تو نہیں تجھ سے مگر تیرے سوا دل کو
کئی غم اور بھی ہیں اے غم جانانہ برسوں سے

یہ دنیا میری روداد محبت سے نہ اکتاجائے
اسی روداد میں دنیا کے افسانے بھی آئیں گے

اور پھر اپنے جہان آب وگل کی، اس کے سود وزیاں کی سیر کرتا ہے اور روشن مستقبل کے راستے بھی دکھاتا ہے، اسے ہموار کرنے کی باتیں بھی کرتا ہے اور عزم وحوصلہ پیدا کرنے کی سعی بھی کرتا ہے:

ہم قفس !صیاد کی رسم زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی انداز کلام آہی گیا

پستئ زمین سے ہے رفعت فلک قائم
میری خستہ حالی سے تیری کج کلاہی بھی

ڈرا کے موج و تلاطم سے ہم نشینوں کو
یہی تو ہیں جو ڈبویا کیے سفینوں کو

یہ محفل اہل دل ہے یہاں ہم سب میکش ہم سب ساقی
تفریق کریں انسانوں میں اس بزم کا یہ دستور نہیں

سنتے ہیں کہ کانٹے سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر عزم جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں

یہ اشعار خیالات کی تازگی اور ندرت فکر کی وجہ سے مجروح کی غزل گوئی کی پہچان بن جاتے ہیں اور اہل نظر سے تعریف وتحسین کے خراج لینے لگتے ہیں۔

آزادی حاصل کرنے کے تقریباً ڈیڑھ دوسال بعد جب آزادی کی نعمتیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور اس کی برکتیں ظاہر ہوتی ہیں تو مجروح اپنے تاثرات اس نظم نما غزل میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

عہد انقلاب آیادور آفتاب آیا
منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے
اب زمین گائے کی ہل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے
اہل دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم
اب گہر سبک ہوگا ایک جو کے دانے سے
منچلے نہیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کار خانے سے
عام ہوگا اب ہمدم سب پہ فیض فطرف کا
بھر سکیں گے اب دامن ہم بھی اس خزانے سے
میں کہ ایک محنت کش میں کہ تیرگی دشمن
صبح نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے

لیکن اس کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ ہمارے شاعر مجروحؔ سلطان پوری کو مایوسی ہوتی ہے۔ دراصل ہماری آزادی وہ سحر ثابت نہیں ہوئی جس کے سب منتظر تھے۔ چنانچہ حالات سے مجبور ہو کر وہ ادب کی قلم سے نکل پڑے اور سیاست کی حکمرانی کو اپنے اوپر مسلط کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ باتیں میں ۱۹۵۰ء کی کر رہا ہوں، ہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مجروحؔ سلطان پوری کے مجموعۂ کلام

کے وہ اوراق جو ۱۹۵۰ء کے لیے مخصوص تھے سادہ رہ گئے البتہ ان کا وہ کلام فضا میں گونجنے لگا جو خالص سیاسی تھا، لیکن ایوان ادب میں اسے باریابی کی اجازت نہیں ملی۔ ملاحظہ کیجیے:

ع لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا
ہو کے رہے گی دھرتی اپنی دیش ہمارا ہو کے رہے گا

یا

ع کس نے کہا پھر امن کا جھنڈا دھرتی پر لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

کچھ دنوں تک مشاعرے کی فضا ان کے اس طرح کلام سے بوجھل رہی اور ان کے اس طرح کلام سے بوجھل رہی اور ان کے ہم زبان، ہم خیال اور ان کی تحریک سے متاثر شعرا نے اس طرح کے کلام کو پسند بھی کیا اور تاثر بھی قبول کیا لیکن ادب کے ایوان میں اسے ممنون قرار دیا گیا اور اس کے خلاف فتوے جاری ہونے لگے ادھر حکمراں جماعت کی پیشانی پر بل پڑنے لگے اور اس کی نگاہ مجروح سلطان پوری کا تعاقب کرنے لگی، چنانچہ ایک وقت ایسا آیا جب مجروح کو قید و بند کی زندگی گذارنے پر مجبور ہونا پڑا وہ ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء میں گرفتار کر لئے گئے اور ممبئی کے آرتھر جیل میں ڈال دئے گئے جہاں تقریباً ایک سال تک رہنا پڑا مندرجہ ذیل چھ غزلیں اسی قید کی زندگی کی یادگار ہیں:

دست منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سر بازار سہی

ہوں جو سارے دست و پا ہیں خون میں نہلائے ہوئے
ہم بھی ہیں اے دل ، بہاراں کی قسم کھائے ہوئے

جس دم یہ سنا، ہے صبح وطن محبوس فضائے زنداں میں
جیسے کہ صبا اے ہم قفسو، بے تاب ہم آئے زنداں میں

دشمن کی دوستی ہے اب اہل وطن کے ساتھ
ہے اب خزا چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ

مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
کہ نہیں مرا کوئی نقش پا جو چراغ راہ گذر نہ ہو

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دارو رسن تک ہے

جو اردو ادب کے لئے ''ارمغان زنداں'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کا مطالعہ اس لئے بھی

شب ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروان سحر نہ ہو

مگر اے ہم قفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی
یہ رسم قید و زنداں، ایک دیوان کہن تک ہے

دعائیں دے رہے ہیں راستے مجھ آبلہ پا کو
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

جیل سے رہا ہونے کے بعد کی غزلیں جو "غزل" کے چوتھے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۵۹ء میں شامل ہیں ان کی دو غزلیں ۱۹۵۲ء کی ہیں اور تین غزلیں ۱۹۵۳اور ۱۹۶۳ کی ہیں۔ یعنی اس زمانے کی کل حسب ذیل پانچ غزلیں ملتی ہیں:

جلوۂ گل کا سبب دیدۂ تر ہے کہ نہیں
میری آہوں سے بہاراں کی سحر ہے کہ نہیں

۱۹۵۲ء

شمع زنداں مجھے ہو گلبدن سرخ سویرا

میں تو دیوانہ ہوں اے انجمن سرخ ترا

نذرِ سوویت: ۱۹۵۲ء

ہندوستان کا دروازہ عوامی چین کی طرف کھلتے ہوئے دیکھ کر:

آہی جائے گی سحر مطلع امکاں تو کھلا
ہم تو اقفل تو ٹوٹا در زنداں تو کھلا

۱۹۵۴ء

ادائے طول سخن کیا وہ اختیار کرے
جو عرض حال بطرز نگاہ یار کرے

ہمیں شعور جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے
نگاہ بن کے حسینوں کی انجمن میں رہے

اگست ۱۹۵۹ء

مندرجہ بالا پانچ غزلوں میں ایک ''نذرسویت'' ہے دوسری ''ہندوستان کا دروازہ چین کی طرف کھلتے دیکھ کر'' کہی گئی ہے۔ باقی تین پر کسی قسم کا اشارہ نہیں ملتا کہ کس وجہ سے کہی گئی ہیں۔ ''نذرسویت''

کے سلسلے میں تین شعر ایسے کہے گئے ہیں، جو سرخی کے علاوہ کچھ نہیں بولتے ۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو سرخی نا پسند کرتے ہوں گے مگر مجھے یہاں یہ سرخی سیاست کی ترجمان بن کر اپنی تمام تر رعنائی کھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

دوسری غزل چین سے گہرے تعلق کی غمازی کرتی ہے لیکن یہ غزل سیاست کی ترجمان ہونے کے باوجود اپنا حسن کھوتی نہیں اور تغزل کی نرم و نازک فضا کو برقرار رکھتی ہے:

سیل رنگ آہی رہے گا مگر اے کشت چمن
ضرب موسم تو پڑی بند بہاراں تو کھلا

باقی تین غزلوں میں:

جگائیں ہم سفروں کو اٹھائیں مشعل شوق
نہ جانے کب سحر ہو کون انتظار کرے
مثال ملتی ہے کتنوں کی اس دوانے سے
چمن سے دور جو بیٹھا غم بہار کرے

وہی ہے آبلہ پائی وہی چمن بندی

جئے دوانہ ترا شہر میں کہ بن میں رہے
کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے
ہوئے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

وغیرہ ایسے اشعار ہیں جو مجروح سلطان پوری کی پہچان کراتے رہیں گے۔ان میں کاروبار غزل کی پوری ترجمانی ہوتی ہے لیکن ایک خاص کیفیت کے ساتھ۔

ان غزلوں کے علاوہ اس کتاب کا آخری ایڈیشن ۱۹۷۰ء میں منظر عام پر آیا تو ساتھ نئی غزلوں کا تحفہ لے کر آیا جن میں ایک خاص کیفیت ہے اور ان کے مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے۔

مجروح سلطان پوری ۱۹۷۰ء تک پہنچتے پہنچتے فکر وخیال اور اسلوب کے لحاظ سے اپنے فن کو ایک خاص معیار تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

کام آئے بہت لوگ سر مقتل ظلمات
اے روشنی کوچۂ دلدار کہاں ہے

ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کیے ہیں ہم نے عزیزو چار گریباں تم سے زیادہ
جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشن چراغاں تم سے زیادہ

بچا کے لائے ہم اے یار پھر نقد وفا
اگر چہ لوٹے ہوئے رہزنوں کے ہات چلے

یہ اشعار اور اس طرح کے اور بھی اشعار ایسے ہیں جو غزل کا سوز و گداز، سرمستی و بدمستی، حسن و جمال، دلکشی و دلداری، سرشاری و ہوشیاری اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں، ان کا اگر بھر پور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مجروح ٹمٹماتے ہوئے غزل کے چراغ کی لو کو نہ صرف تیز کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ اسے قبولیت عام حاصل کرانے میں آگے آگے رہے ہیں، انھوں نے اپنے مجموعہ کلام ''غزل'' کے نئے ایڈیشن مطبوعہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں اس صنف کو اختیار کرنے کے سلسلے میں تحریر کیا ہے:

''میں نے صنف غزل کو اپنے لیے اس لحاظ سے بہتر جانا
کہ اس کا ایک کامیاب شعر اپنے اختصار و دل نشینی کے
باعث ابلاغ و ترسیل کی سہولتیں زیادہ رکھتا ہے۔''(۱)

---

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۱۷۶

فرمان فتح پوری رقمطراز ہیں:

''مجروح کی خود اعتمادی عم انسانی پیار کی حامل ہے اسی لئے اس میں ایک ایسی انفرادی شان پیدا ہو گئی ہے جسے ہم سماجی نمائندگی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ وہ جب اپنے اشعار میں متکلم کے صیغے استعمال کرتا ہے تو اس سے مقصود اس کی اپنی ذات نہیں ہوتی بلکہ صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ اس نے ''میں''میں ''ہم'' کو اور ''ہم'' میں سارے سماج کو جذب کر لیا ہے۔ ذیل کے چند اشعار دیکھئے۔ ان میں شاعر کی تعلیٰ آمیز انفردیت کے اظہار کے باوجود ہمیں اپنے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے:''(۱)

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دارو رسن تک ہے

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

میں تو جب جانوں کی بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۱۸۳

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

باعث جلوہ گل دیدۂ تر ہے کہ نہیں
میری آہوں میں بہاروں کا اثر ہے کہ نہیں

دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

اس شان اعتبار کی جھلک مجروح کی تمام غزلوں میں کم وبیش ملتی ہے۔''

مجروحؔ انھیں چند شاعروں میں ہیں جن کے یہاں ''سوز جاناں''، ''سوز دیگراں'' میں اور ''غم جاناں''، ''غم دوراں'' میں ڈھلنے لگا ہے۔

ذیل کے چند اشعار دیکھیے ۔ان میں ذاتی خوشی کو سماجی خوشی پر قربان کر دینے اور ذاتی دکھ کو سماجی دکھ میں بھول جانے کی کیسی ولولہ خیز حوصلہ مندی کارفرما ہے۔

جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

گریزاں تو نہیں تجھ سے مگر تیرے سوا دل کو
کئی غم اور بھی ہیں اے غم جانانہ برسوں سے

جو سمجھانے بھی آتے وعظ برہم تو کیا کرتے
ہم اس دنیا کے آگے اس جہاں کا غم تو کیا کرتے

غیروں کی خلش اپنوں کی لگن سوز غم جاناں درد وطن
کیا کہئے کہ ہم ہیں کس کس کو سینے سے لگائے زنداں میں

ہائے وہ ساعت کہ وقف شوق تھا ہر نفس
آہ یہ عالم کہ اب میری تمنا بھی نہیں

مجھے یہ فکر سب کی پیاس اپنی پیاس ہے ساقی
تجھے یہ ضد کہ خالی ہے مرا پیمانہ برسوں سے

جس دم یہ سنا ہے صبح وطن محبوس فضائے زنداں میں
جیسے کہ صبا اے ہم قفسو بے تاب ہم آئے زنداں میں

جنون گل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

عشق کی اتنی بدلتی ہوئی نوعیت کے اظہار میں فن کار، سوز غم جاناں، گل شیریں، اور قد و گیسو کے ذکر سے یکسر قطع نظر نہیں کر سکا اور سچ پوچھو تو وہ ان سے قطع نظر کر ہی نہیں سکتا، اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا فن پھیکا اور بے جان ہو جاتا۔ بات یہ ہے شخصی تجربات کا اثر دب سکتا ہے محو نہیں ہو سکتا۔ فن کار خارج کو پیش کرنے میں اپنی ذات کو خواہ کتنا ہی الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کرے، نہ تا وہ ذاتی تجربوں اور داخلی کیفیتوں کے اثر سے بچ سکتا ہے اور نہ اس اثر کے بغیر اس میں فنی دلکشی پیدا ہو سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رومانی اندازِ فکر سے روح گھٹتی نہیں ہے بلکہ اس میں بالیدگی آتی ہے۔ اچھے فن کار ''غم جاناں'' اور ''گل پیرہن'' کے قد و گیسو کے ذکر سے ہمیں بھٹکاتے نہیں بلکہ منزل کو آسان بناتے ہیں۔

یہی نہیں کہ کوئی بھولی بسری یاد ایک طرح کی نشاط خیزی اور حوصلہ مندی کا سامان فراہم کرتی ہے بلکہ غم حیات کی کٹھن منزلوں میں ٹوٹے دل کا آخری سہارا بھی بن جاتی ہے۔

کہیں جو بیٹھ گئے رہروانِ منزلِ شوق
غزل نوا نگہ سرمہ ساکی بات چلی
ہم گردشِ دوراں کی ہر اک ضربِ گراں پر
لطفِ نگہ لالہ رخاں یار کریں گے

مجروح بھی جب کبھی جادہ طلب سے دل شکستہ واپس جانے کی کوشش کرتے ہیں تو کسی کی آرزو بہ ہزار عشوہ گری اسے بزدلانہ حرکت سے باز رکھتی ہے اور دشوار سے دشوار منزل میں بھی اسے بے یار و مددگار نہیں ہونے دیتی:

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے بڑھ کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

نہ مٹ سکیں گی یہ تنہائیاں مگر اے دوست

جو تو بھی ہو تو طبیعت ذرا بہل جائے
اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

یہ ہیں چند میلانات جن کے حسن کارانہ اظہار سے مجروحؔ کے فن میں تازگی اور توانائی آتی ہے اس کے لب ولہجہ کی اثر انگیزی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کلاسیکی غزل کے مخصوص پیرایہ بیان پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ان کے یہاں مواد اور الفاظ میں ایسی پیوستگی ملتی ہے جو عام طور پر انفرادی لب ولہجہ کی ضامن ہوتی ہے۔یٹس (W.B.Yeats) کے خیال میں ادیب زبان کو محض زبان کی حیثیت سے نہیں بلکہ فن لطیف کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔مجروح کے یہاں اس کا احساس ملتا ہے۔کہ اسی احساس نے ان کے کلام میں ایک طرح کی انفرادی شان نمایاں کر دی ہے۔ذیل کے چند اشعار دیکھئے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجروح وقت کے ہر راگ کو غزل کے ساز پر گانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں:

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسم چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

اب زمیں گائے گی ہل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے

اب جنوں پہ وہ ساعت آپڑی کہ اے مجروح
آج زخم سر بہتر دل پہ چوٹ کھانے سے

اہل دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم
اب گہر سبک ہوگا جو کے ایک دانے سے

ان اوصاف کے باوجود کہیں کہیں وہ ایسی بے کیف حقیقت نگاری کا شکار ہو گئے ہیں جس کا شاعری سے تعلق کم کم ہے۔ مقصدی ادب غیر مقصدی ادب سے یقیناً اہم ہوتا ہے لیکن ادب میں مقصدیت کی نوعیت عام طریقوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ادب پروپگنڈے کا کام بھی کرتا ہے لیکن اس طور پر نہیں جس طرح مجروح کے ان اشعار میں:

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح
وہ سر زمیں کے ستارے جسے سلام کریں

لینن کے پیغام کی جے ہو اسٹالن کے نام کی جے ہو
جے ہو اس دھرتی کی جس پر اپنا اجارہ ہووے گا

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

اپنے ہی سنکٹ کے بھنور میں چکرائی ٹرومین کی کشتی
ڈھونڈتی ہے تنکے کا سہارا تنکا بھی کام آنے نہ پائے

''غزل اردو کی شعری روایت سے محمد علی صدیقی کہتے ہیں:

''فیض اور مجروح ترقی پسند تحریک کے دو اہم شاعر ہیں لیکن فیض اور مجروح کی شاعری کے لہجوں میں بین فرق ہے۔ان اشعار میں بھی جنھیں بعض مجروح کے سہل نگار قارئین اور مبصرین نے فیض احمد فیض کے نام موسوم کر دیا ہے۔ صرف لہجے کا فرق ہی مجروح اور فیض کے درمیان واضح حد فاصل کھینچ دیتا ہے۔''(۱)

اشعار:

میرے عہد میں نہیں ہے یہ نشان بلندی
یہ رنگے ہوئے امامے یہ جھکی جھکی کلاہیں

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۱۹۳

حادثے اور بھی گذرے تری الفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے اب مری تصویر نہ دیکھ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

مجروحؔ کے مندرجہ بالا اشعار ان اشعار میں سے ہیں، جنھیں بعض منصرین نے فیض احمد فیضؔ کے رنگ کے اشعار گردان کر اپنی ''لغزش فہم'' کا ثبوت دیا ہے۔ حالانکہ لہجے کا فرق صاف بتا رہا ہے کہ مجروحؔ ''ایقان'' کی بے پناہ جرأت اور اعتماد کی وجہ سے فیض احمد فیضؔ کے مقابلے میں زیادہ قطعیت پسند Categorical ہیں۔ فیض احمد فیضؔ کی بعض نظموں کی سطریں یا ابتدائی کلام کی غزلیں اس لہجے کو چھوتی ہوئی ملتی ہیں۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ فیضؔ کی غزل میں ''قطعیت'' کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مجروحؔ سلطان پوری اور فیض کے شعری ڈکشن میں کافی مماثلت ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ مجروح کی شناخت فیض کے علی الرغم غزل ہی سے ہے۔ مجروح کی غزل فیض کے مقابلے میں، روایت کے خمیر میں زیادہ گندھی ہوئی ہے۔ اور اس پر مغربی شاعری کے اثرات کی چھوٹ نہ

ہونے کے برابر ہے۔

مجروح نے تغزل کی قیمت پر سیاسی آدرشوں اور سیاسی آدرشوں کی قیمت پر تغزل کو خیر باد نہ کہنے کا جوعزم صمیم کر رکھا ہے اس کی وجہ سے وہ ایک نوع کے ہئیت پرست شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ مجروح کی غزل کا محبوب کلاسیکی شعرا کی غزل کے محبوب سے چنداں مختلف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجروحؔ تغزل سے بھرپور کام لیتے ہیں ۔

التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی
اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

دور دور مجھ سے وہ اس طرح خراماں ہے
ہر قدم ہے نقش دل ہر نگہ رگ جاں ہے
ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ

تیری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

نہ مانگوں بادۂ گلگوں سے بھیک مستی کی اگر ترے لب لعیں مرا یہ کام کریں

سکھائیں دست طلب کو ادائے بیبا کی پیام زیر لبی کو صلائے عام کریں

مجروح اور فیض کا تقبلی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فیض اپنی نظموں کے حوالے سے بین الاقوامی موضوعات پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ان کی شاعری کا Ethos بڑی حد تک ناظم حکمت، نیرودا اور لورکا کی بین الاقوامی فکر کے ساتھ ہم رشتہ ہے اور اس لئے ان کی غزلوں میں بھی مجروح کے مقابلے میں وسیع تر فریم ورک کارفرما ہیں۔فیض اپنے مخملی اور شیریں لہجے میں اپنی مخصوص افتادِ طبع کے حوالے سے کافی اجنبی Shades نکالتے ہیں۔اس کے برخلاف مجروح کی غزل کا خمیر روایتی میکدہ کی فضاؤں سے اٹھا ہے۔مجروح ترقی پسند کے ایک رجحان ساز شاعر ہیں جنھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ روایتی شاعری کی لغت نئے تقاضوں پر پوری اترتی ہے۔مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار:

غلام رہ چکے توڑیں یہ بند رسوائی

کچھ اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں

ہر موڑ پر مل جاتے ہیں ابھی فردوس و جناں کے شیدائی

تجھ کو تو ابھی کچھ اور حسیں اے عالم امکاں ہونا تھا

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھرپاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

زمیں کو مل کے سنواریں مثال روئے نگار
رخ نگار سے روشن چراغ بام کریں

ہم قفس صیاد کی رسم زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی انداز کلام آہی گیا

عہد انقلاب آیادور آفتاب آیا
منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے

منچلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے

پارۂ دل ہے وطن کی سرزمیں مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں

جس دم یہ سنا ہے صبح وطن محبوس فضائے زنداں میں
جیسے کہ صبا اے ہم قفسو بے تاب ہم آئے زنداں میں

دشمن کی دوستی ہے اب اہل وطن کے ساتھ
ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دارو رسن تک ہے

شب ظلم نرغۂ راہ زن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروان سحر نہ ہو

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ

جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

فیض احمد فیض ،خود مجروح کے خیال کے مطابق ،جدید اردو شاعری کے میر تقی میر ہیں ۔اس خیال کی روشنی میں دونوں شاعروں کے مابین فرق کی تفہیم کافی آسان ہو جاتی ہے۔ مجروح کی غزلوں میں جس نوع کی ''سپردگی'' کی فضا ملتی ہے وہ مجروح ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ مجروح نے اپنی شاعری میں ''قد وگیسو'' سے ''دار ورسن'' تک کا فاصلہ جس خوش دلی اور سرمستی کے ساتھ طے کیا ہے اور بڑی چابک دستی کے ساتھ ''منزل'' اور ''مسافت'' کے فرق کو ظاہر کیا ہے، وہ جدید ترقی پسند غزل کا مہتم بالشان باب ہے۔ مجروح کی شاعری ''انقلاب'' کے لئے دیدہ ودل فرش راہ ہے۔ وہ معاشرہ کی جملہ خرابیوں کی وجہ طبقاتی سماج کے اندر لابدی آویزش میں تلاش کرتے ہیں ۔

''غزل'' کا پہلا پاکستانی اڈیشن ۱۹۸۷ء

مجروح نے اصغر اور جگر والے عاشقانہ انداز سے اپنی غزلوں کے علاوہ نظموں میں بھی جمالیاتی کیفیت پیدا کی جو اس صدی کی چوتھی دہائی میں تعلیم یافتہ نوجوانوں اور طالب علموں میں بہت مقبول ہوئی۔اس زمانے کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں، جن کی آب وتاب میں آج بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

گو رات مری صبح کی محرم تو نہیں ہے
سورج سے ترا رنگ حنا کم تو نہیں ہے

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے

ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

یہ شعری فنی لحاظ سے کمزور ہے۔ پہلا مصرعہ بعد میں کہے جانے کی وجہ سے بھرتی کا ہے، لیکن شاعر کے تخلیقی حسن نے مصرعہ اول کے عیب کو ڈھانپ لیا ہے اور سننے والوں یا پڑھنے والوں کو اتنی مہلت نہیں دیتا کہ وہ موشگافی کر کے اس نازک فرق کو محسوس کو سکیں۔ یہ بھی شاعر کا کمال ہے اور اسے صائب اصفہانی کی طرح میری تنقید پر ''شعر مرا بمدرسہ کہ برد!'' کہنے کا حق ہے۔ کیونکہ شعر اتنا مقبول ہوا ہے کہ تقریباً ضرب المثل بن گیا ہے۔ اور خوبصورت شعر اس زمانے کے دیکھیے:

شرح غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کو وہیں ڈال دی ہیں باہیں

دور دور وہ مجھ سے اس طرح خراماں ہیں

ہر قدم ہے نقش دل ہر نگہ رگ جاں ہے

غزل کا یہ رنگ وآہنگ یعنی سرودعاشقانہ اورزبان کو بے حد لطیف اور نازک استعمال بالعموم اس دور کی غزل کی مرکزی خصوصیت رہی ہے اوراس زمانے میں کامیاب اور مقبول شاعر ہونے کے لیے اس لیے اس صفت کا ہونا ضروری تھا۔اس شعر پر غور کیجیے:

جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

تصوف کے نقطۂ نظر سے یہ شعر حافظؔ ،عطارؔ اور ہمارے یہاں مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر دردؔ سے زیادہ قریب ہے۔اس فلسفۂ وحدت الوجود کے ساتھ ہی عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے سفر کی جھلک صاف نظرآتی ہے،تاہم آج کی اصطلاح میں اسے انسانیت دوستی اور ہیومنزم کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے۔

مجروحؔ کی غزل میں اس وسیع تر رمزیت کی جھلک ملتی ہے نہ کہ سیاسی رمزیت کی ۔ برسوں مجروحؔ کے پڑھنے والے ایسے شعروں کی سیاسی رمزیت پر سر دھنتے رہے، جو جلسوں میں بینر پر لکھے جاتے رہے اورعوام میں جوش اور ہیجان پیدا کرتے رہے۔

ستون دار پہ رکھتے چلوں سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

میں اس شعر کی برائی نہیں کر رہا ہوں۔ بڑا ولولہ انگیز شعر ہے، لیکن اس کا حشر بھی علامہ اقبال کے اس ولولہ انگیز شعر کی طرح ہونے والا ہے:

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

چند غزلوں کے مطلعے درج کیے جاتے ہیں:

ختم شور طوفاں تھا دور تھی سیاہی بھی
دم کے دم میں افسانہ تھی مری تباہی بھی

مسرتوں کو یہ اہل ہوس نہ کھو دیتے
جو ہر خوشی میں ترے غم کو بھی سمو دیتے

یہ رکے رکے سے آنسو یہ دبی دبی سی آہیں
یونہی کب تلک خدایا غم زندگی نباہیں

اوران دو مطلعوں سے شروع ہونے والی غزلیں بھی جن کو پہلے لکھا جا چکا ہے:

دور دور وہ مجھ سے اس طرح خراماں ہیں
ہر قدم ہے نقش دل ہر نگہ رگ جاں ہے

جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

یہ ساری غزلیں شروع زمانے سے تعلق رکھنے کے باوجود بالغ نظری اور بصیرت سے خالی نہیں ہیں۔ چوتھا شعر حسن وعشق کے موضوع پر ہے لیکن اس کی جمالیات لب ورخسار کی نہیں بلکہ دوری و نارسائی کی ہے، جسمانی تلذذ کی نہیں، تخئیلی حسن کی ہے جہاں موج خرام یار گل کترتی چلی جاتی ہے، مجاز، جاں نثار اختر یا اختر شیرانی جیسے شاعروں اور مجروح میں یہی فرق ہے کہ مجروح ان کے برابر کے رومانی شاعر ہوتے ہوئے رومانیت کے صرف موج تہ نشیں کی طرح رکھتے ہیں اور بعض جگہ یہ رومانیت غروب ہوکر ایسے بصریت افروز اور دل نشیں تجربات کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے کہ تمام افق سخن شفق رنگ ہو گیا ہے۔ جیسے یہ شعر:

وہ تو کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہ یار کی طرح

بلکہ یہ پوری غزل معنوی حسن اور انداز بیان دونوں کا شاہکار ہے۔ اسی غزل میں یہ غیر فانی شعر بھی ہے:

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح

مجروح کہتے ہیں کہ اس شعر کی امیجری، رمزیت اور لطف بیان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مجھے اپنے مرحوم دوست ظ۔انصاری کی شعر فہمی کی داد دینا پڑتی ہے جنھوں نے اس شعر پر اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں اظہار خیال کیا ہے:

''حیران ہوں یہ شعر آسمان سے ٹپکا یا زمین سے اگا۔ غیب کی شعاع اتری ہے یا سالہا سال کے تجربوں کی رگڑ سے نکلنے والی روشنی۔ خیال اس میں اچھوتا نہیں کہ اگلے بھی کہتے آئے ہیں۔ غالبؔ نے تو ایک بار سے زیادہ یہی بات کہی ہے، مگر جیسے مجروحؔ نے کہی اور جس بلندی پر جا کر کہی اس کی کوئی مثال نہیں۔''(۱)

طوالت کے خیال سے ظ۔انصاری کی باقی عبارت حذف کی جارہی ہے۔ ان کی تشریح کافی لمبی

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۶۶

ہے۔ غالبؔ کی طرف ان کا خیال صحیح گیا ہے۔ ایک فارسی کا شعر مجھے یاد آ رہا ہے جسے ظ. انصاری کی بات پوری کرنے کے لیے درج کرر ہاہوں:

با من میاویزای پدر فرزند آذر رانگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرد

یعقوب راہی فرماتے ہیں:

''مجروح سلطان پوری اور ان کی غزل کے متعلق کچھ کہنے سننے سے قبل، مجروح کے چند اشعار ملاحظہ کرتے چلیں کہ ان سے مجروح کی تفہیم کے باب واہوتے ہیں۔''(۱)

(۱) نوا ہے جاوداں مجروح جس میں روح ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

(۲) بے تیشہ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۱۹

(۳)ہجوم دہر میں بدلی نہ ہم سے وضع خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

(۴)سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

(۵)آرزو ہی رہ گئی مجروح کہتے ہم کبھی
اک غزل ایسی جسے تصویر جانانہ کہیں

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجروح جانتے ہیں ''روح عصر'' کوئی مجرد لمحہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر ماضی کا عرفان اور مستقبل کا دل دھڑکتا ہے اور جس نے اس عرفان کو پرپت کرلیا، جس نے اس دل کی دھڑکن سن لی اس کا نغمہ جاوداں ہوگیا۔ مجروح کو چونکہ اردو اور فارسی غزل کا عرفان ہے اس لئے انھیں رفتگاں کی عظمت کا بھی احساس ہے۔ جن کا ہر نقش پا دیوار کی طرح بلند ہے۔ اس وادی کی سیر سے قبل تیشہ نظر سنبھالنا ضروری ہے۔ یہ تیشہ نظر وہی سنبھال سکتا ہے جس کی اپنی کلاسیکی شاعری پر خلاقانہ نظر ہو۔ مجروح کے پاس یہ نظر ہے اور یہ خلاقانہ نظر ماضی کی روایات سے منکر نہ ہونے کے باوجود اپنے لئے نئی ڈگر تراشتی ہے۔

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح

سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

یہ تو رہی شعر نمبر (۱) اور شعر نمبر (۲) کی بات ۔ جہاں تک شعر نمبر (۳) اور شعر نمبر (۴) کا معاملہ ہے ،ان پر آگے گفتگو ہوگی کہ انھیں کی بنیادوں پر مجروح کی غزل کا قصر کھڑا ہے ۔ شعر نمبر (۵) والے مجروح جانتے ہیں کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غزل میں کم از کم تصویر جانانہ کی جھلک ضروری ہے، اب چاہے وہ جس زاویے، جس انداز سے ہو۔ اب یہ جاناں کوئی بھی ہوسکتا ہے، وطن ،فطرت، ذات حق ،خود اپنی ذات یا پھر پری پیکر، نگار سرو قد، جس کی تعبیر وتفسیر سے، تعریف وتوصیف سے اردو شاعری کا دامن مالا مال ہے اور جس میں مجروح نے بھی قابل قدر اضافہ کیا ہے:

مجھے سہل ہوگیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

ے ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے

ے سرخی مے کم تھی میں نے چھو لیے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جو بھی اب ارباب میخانہ کہیں

ے وہ تو کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شئے نگہ یار کی طرح

ے ملی جب ان سے نظر بس رہا تھا ایک جہاں
ہٹی نگاہ تو چاروں تھے ویرانے

ے اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

؎ دل سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاکدامانی
نگاہ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

؎ جمال صبح دیا روئے نوبہار دیا
مری نگاہ بھی دیتا خدا حسینوں کو

ان اشعار کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مجروحؔ نے اپنے لیے ایک نیا راستہ تلاش کیا۔ حسن کو اس کے حسن کے ساتھ ساتھ اپنی نظر کی اہمیت کا احساس بھی دلا دیا، جس نظر کی متلاشی حسن، ازل سے رہا ہے ورنہ آدم خاکی کی تخلیق نہ ہوتی، عبادت حسن کے لیے شعور گناہ سے عاری فرشتے ہی کافی تھے۔

دہلی اور لکھنؤں اسکولوں میں بھی الگ الگ روایتیں تھیں دہلی میں میر غالب اور سودا کے علاوہ درد اور ان کے پیرو اپنے انداز بیان اور فکر کی وجہ سے دوسرے راستوں کے مسافر ہیں۔ لکھنؤ میں آتش مومن اور ناسخ کی فکر اور طرز بیان الگ ہے اور مصحفی انشا اور ان کے مقلدین کی راہ الگ ہے۔ لیکن عام طور پر اس تقسیم کے دوران ایک اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انھیں آوازوں کے درمیان ایک اور اہم اور قابل قدر آواز ہے جسے ہم مردانہ آواز کہتے ہیں اور اس آواز کی بنیاد میر اپنے اس مصرع میں ڈال دیتے ہیں:

مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

ان شعرا کے اشعار کے ذریعے ایک نظر ڈالیں:

غالبؔ:

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

بندگی میں بھی وہ آزاد و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

آتش:

طبل و علم ہے پاس ہمارے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

نامرد آسماں سے گوارہ ہے کس کو جنگ
آتشؔ سپر کو چیر لیے تلوار توڑ دیئے

یگانہ چنگیزی:

جس کی تلوار کا ہو لوہا تیز
حجت نا تمام کیا کرتا

پڑ چکے بہت پالے ڈس چکے بہت کالے
موذیوں کے موذی کو خوف نیش عقرب کیا

مجروح:

اپنی اپنی ہمت ہے اپنا اپنا دل مجروح
زندگی بھی ارزاں ہے موت بھی فراواں

ترے خانماں خرابوں کا چمن کوئی نہ صحرا
یہ جہاں بھی بیٹھ جائیں وہیں ان کی بار گاہیں

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار

رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

ہوئے ہیں قافلے ظلمت کی وادیوں میں رواں
چراغ راہ کیے خوں چکاں جبینوں کو

تجھے نہ مانے کوئی تجھ کو اس سے کیا مجروحؔ
چل اپنی راہ بھٹکنے نہ دے نکتہ چینوں کو

سوئے مقتل کہ پئے سیر چمن جاتے ہیں
اہل دل جام بکف سر بہ کفن جاتے ہیں

روک سکتا ہمیں زندان بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

سیل رنگ آہی رہے گا مگر کشت چمن
ضرب موسم تو پڑی بند بہاراں تو کھلا

ہجوم دہر میں بدلی نہ ہم سے وضع خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

ہم ہیں کعبہ ہم ہیں بت خانہ ہمیں ہیں کائنات

ہوسکے تو خود کو بھی ایک بار سجدہ کیجئے

کہاں صحن چمن میں بات کوئے سرفروشاں کی
ادھر سے سادہ رو پہنچے ادھر سے لالہ رنگ آئے

کرو مجروحؔ تب دار و رسن کے تذکرے ہم سے
جب اس قامت کے سائے میں تمہیں جینے کا ڈھنگ آئے

زندگی کی قدر سیکھی شکریہ تیغ ستم
ہاں ہمیں تھے کل تلک جینے سے اکتائے ہوئے

جگائیں ہم سفروں کو اٹھائیں پرچم شوق
نہ جانے کب سحر ہو کون انتظار کرے

دیار جور میں رستہ ہے اک یہی ورنہ
کسے پسند ہے اے دل کہ سیر دار کرے

ہم بھی ہمیشہ قتل ہوئے اور تم نے بھی دیکھا دور سے لیکن
یہ نہ سمجھا ہم کو ہوا ہے جان کا نقصاں تم سے زیادہ

سنگ تو کوئی بڑھ کے اٹھاؤ شاخ ثمر کچھ دور نہیں
جس کو بلندی سمجھے ہوان ہاتھوں کی کوتاہی ہے

غالبؔ، آتشؔ، یگانہؔ، اور مجروحؔ کے اشعار پیش کرنے سے ان کا موازنہ مقصود نہ تھا بلکہ یہ دکھانا مقصود تھا کہ اردو غزل کی انا اور سرکشی سے مملو مردانہ آواز نے کس طرح اپنا ارتقائی سفر طے کیا ہے۔ اب اس میں کہاں تک کامیابی یا ناکامی ہوئی اس کا فیصلہ تو اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔

مجروحؔ کی غزل میں خوبصورت فارسی تراکیب، مرصع سازی، سجیلا، البیلا انداز اور تیکھا پن، اردو، فارسی غزل کے سبھی نقش و نگار اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کلاسیکی فارسی شاعری کا آہنگ اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ مجروحؔ کا فارسی غزل کا مطالعہ بھرپور اور تخلیقی ہے اور ان کی غزل اس جوہر کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ہم مجروحؔ کی شاعری کو کلاسیک زدہ نہیں کہہ سکتے بلکہ ان کی غزل نئے کلاسیکی تیور لیے ہوئے ہے۔

چونکہ مجروحؔ اردو غزل کی روایت سے پوری طرح واقف ہیں، زبان و بیان پر دسترس رکھتے ہیں، کلاسکی لب و لہجہ کے مزاج داں ہیں۔ مرصع سازی و مرقع سازی کا فن جانتے ہیں، انھوں نے اردو غزل میں کتنی ہی خوبصورت، دلفریب، نظر نواز اور نادر المثال تراکیب کا اضافہ کیا ہے اور اسے طرح دار بنایا ہے۔ جیسے غیرت سنگ، رہبر کوتاہ خرام، کلمۂ سنگ بتاں، مقتل ظلمات، سنگ سفر، تیشۂ نظر، فصل جنوں

،دار ورسن، مطلع امکاں، فرش گل، ساز سخن، فراز دار، مشعل جاں، حلقۂ رسن، وضع خرام، جبریل جنوں، یاران تشنہ، شب دار، عزیزاں، اسی کے ساتھ ساتھ غالب کی ''شمع ماتم خانہ'' کی طرح مجروح نے بھی متعدد الفاظ اور تراکیب استعمال کی ہیں جو پورے منظر یا پس منظر کی نمائندہ بھی بن جاتی ہیں اور تصور سازی کا حق بھی ادا کرتی ہیں مثلاً خوں چکاں جبینیں، ستون دار سروں کے چراغ، سیل رنگ، ضرب موسم، بند بہاراں، قطار شیسہ، خرام جام... چند اشعار ملاحظہ ہوں:

قطار شیشہ ہے یا کاروان ہم سفراں
خرام جام ہے یا جیسے کائنات چلے

فرش گل مینائے مئے شمع سحر ساز سخن
سب اٹھے لیکن نہ اٹھا میں خراب انجمن

مژدہ اے یاران تشنہ دل سے پھر پھوٹا لہو
اے شب ناز عزیزاں پھر جلا داغ کہن

مجروح کی شاعری میں آتش کا سا استغنا اور سرشاری بھی ہے اور یگانہ کی سی پیکار اور للکار بھی۔ یگانہ ذاتی انا جوان کی خود بینی، خود پسندی اور خودسری کا اظہار ہے، مجروح کے یہاں عصری اور طبقاتی انا

کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ اس میں انقلابی قوتوں کا ادراک بھی ہے۔ سرکشی کا جذبہ بھی اور مجاہدانہ شان اور للکار بھی۔

پھر بھی کہلاؤں گا آوارۂ گیسوئے بہار
میں ترا دام خزاں لاکھ گرفتار سہی

اکتا کہ کہ ہم توڑ چکی تھی زنجیر نام ونگ
اب تک فضا میں ہے وہی جھنکار دیکھئے

ہم اہل عشق میں نہیں حرف گنہ سے کم
وہ حرف شوق جو سر محفل کہا نہ جائے

جس ہاتھ میں ہے تیغ جفا اس کا نام لو
مجروح سے تو سائے کو قاتل کہا نہ جائے

کام آئے بہت لوگ سر مقتل ظلمات
اے روشنئ کوچۂ دلدار کہاں ہے

اسی عصری اور طبقاتی انانے، اسی مردانی آواز نے، ایمرجنسی کے زمانے میں، جب ترقی پسندوں سے لے کر جدیدیوں تک کی بولتی بند تھی، مجروحؔ سے یہ غزل کہلوائی:

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے
موسم کی ہوا اب کے جنوں خیز بہت ہے

مجروحؔ سنے کون تری تلخ نوائی
گفتار عزیزاں شکر آمیز بہت ہے

ادب کے نام پر کیسی کیسی بے ادبیاں ہوئیں، غزل پر کیسی کیسی پھبتیاں کسی گئیں، جدیدیوں کا دور آیا اور بہت سے ترقی پسند شعوری یا غیر شعوری طور پر یا مصلحتاً اپنی غزلوں میں ان سے متاثر نظر آئے۔ اور بعضوں نے تو اسے ترقی پسندی کی توسیع تک قرار دیا، لیکن مجروح اپنی ہی ڈگر چلتے رہے۔ بقول یگانہ:

زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو
نظام دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں
مگر ہم ایک ہی پہلو سے بے قرار رہے

غزل مجروح کا مزاج ہے، ان کا فن ہے، اور انھیں اس کا اعتراف ہے۔

ادائے طول سخن کیا وہ اختیار کرے
جو عرض حال بطرز نگاہ یار کرے

مجروح کی کم سخنی نے اپنے عہد کے سیاسی وانقلابی احساس کے اظہار کے لئے جو پیمانہ منتخب کیا وہ یہی ''طرز نگاہ یار'' والا پیمانہ تھا۔ یعنی صنف غزل طرز نگاہ یار اور غزل میں قدر مشترک ہے۔ مثلاً اختصار، اشاریت، تمزیت تاثیر تیزی اور گہرائی۔ مجروح نے اپنے عہد کے سیاسی تقاضوں کو رمزیت اور اشاریت میں سمو کر انھیں استعاروں کی زبان دے دی۔

وہ ایک بات ہے کہئے طلوع صبح نشاط
کہ تابش بدن و شعلۂ حنا کہئے
وہ ایک حرف ہے کہئے اسے حکایات زلف
کہ شکوۂ رسن و بندش بلا کہئے
پکاریے کف قاتل کو اب معالج دل
بڑھے جو ناخن خنجر گرہ کشا کہئے
پڑے جو سنگ تو کہئے اسے نوالۂ زر
لگے جو زخم بدن پر اسے قبا کہئے

یہ کوئے یار ، یہ زنداں، یہ فرش مے خانہ
انھیں ہم اہل تمنا کے نقش پا کہیے

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ فیض نے ایک مدت تک محبوب کے چشم زلف ورخسار کو موضوع سخن جانا اور پھر حقائق زندگی سے گھبرا کر محبوب سے یہ کہ کر دامن چھڑا لیا۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
کیوں کہ ع اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اور اس طرح رومان سے انقلاب کی طرف بڑھ گئے ۔مجروح کے ہاں ''اور بھی غم'' کا برداشت کرنا اس لئے آسان ہو جاتا ہے کہ وہ اسے غم جاناں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

اب کارگہ دہر میں لگتا ہے بہت دل
اے دوست کہیں یہ بھی ترا غم تو نہیں

وہ رومان کو انقلاب کی نذر نہیں کرتے بلکہ انقلاب کو رومان میں ڈبو کر زندگی کو حسین بنانے کی دعوت دیتے ہیں۔

اہل طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو ، بھنور کو چشم جانانہ کہیں

دار پر چڑھ کر لگائیں نعرۂ زلف صنم
سب ہمیں با ہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں
یار نکتہ داں کدھر ہے پھر چلیں اس کے حضور
زندگی کو دل کہیں اور دل کو نذرانہ کہیں

تھامیں اس بت کی کلائی اور کہیں اس کو جنوں
چوم لیں منہ اور اسے انداز رندانہ کہیں

یہی وہ انداز رندانہ ہے جو مجروح کی غزل کو سطحی بننے نہیں دیتا۔ ان کی غزل میں شروع سے لے کر آج تک سطحی عشق، سطحی حسن یا سطحی عاشق کہیں نظر نہیں آتا۔

یوں تو مجروحؔ کی غزل ''حدیث رخسار و دہن'' باوجود محض رخسار و دہن تک محدود نہیں بلکہ داستان قفس و چمن بھی سناتی ہے۔ وہ چمنستان کے مختلف استعاروں مثلاً قفس، اسیری، صیاد، فصل گل ،صبا، شبنم، خار، نسیم، غنچہ وغیرہ کو نئے مفاہیم میں استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر ''چمن'' کا استعارہ ان کے ہاں مختلف معنوں میں آیا ہے مثلاً:

چمن ہے مقتل نغمہ اب اور کیا کہیے
بس ایک سکوت کا عالم جسے نوا کہیے

کہاں صحن چمن میں بات کوئے سرفروشاں کی
ادھر سے سادہ رو نکلے ادھر سے لالہ رنگ آئے

تو اے بہارِ گریزاں کسی چمن میں رہے
مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے

جو ٹھہرتی تو ذرا چلتے صبا کے ہمراہ
یوں بھی ہم روز کہاں سوئے چمن جاتے ہیں

اشکوں میں رنگ و بوئے چمن دور تک ملے
جس دم اسیر ہو کے چلے گلستاں سے ہم

حدیث رخسار و دہن اور داستان قفس و چمن سے ان کا شعری سفر کچھ اور آگے بڑھ جاتا ہے ۔

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسم چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

پھر مجروح کی فکر کا سب سے دلکش پڑاؤ آتا ہے جس کی طرف وہ یوں اشارہ کرتے ہیں ۔

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد وگیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

یہی وہ منزل ہے جسے مجروح غزل کا دل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ دار ورسن کا استعارہ بقول سردار جعفری ''ترقی پسندوں کی خاص مراث ہے۔ ترقی پسند قبیلے میں سب سے پہلے وامق جونپوری نے اس علامت کو ایک مظم استعمال کیا ہے ۔

سوئے دار اور ابھی اور ابھی اور ابھی

مخصوص نظریات کے باوجود موضوع اور فن کا جو خوبصورت امتزاج مجروح کی غزلوں میں ملتا ہے اس نے آنے والے غزل گویوں کے لیے اظہار خیال اور طرز ادا کی کئی پگڈنڈیاں روشن کر دی ہیں۔ مجروح نے سہی کہا ہے ۔

بہت ہی کم ہے تو خال رخ بہارا ں ہے
مری نوا کو ملی ہے وہ داغ پیرہنی

ملے جو وقت نوا سنجی ہزاراں سے
ادھر بھی دیکھ تماشہ ہے میری کم سخنی

رسالہ ''کتاب نما'' نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۴ء

مجروحؔ سلطان پوری کا پہلا مجموعہ کلام ''غزل'' کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ بعدازاں سنین کے ساتھ ساتھ غزلوں کی تعداد بڑھتی گئی اور اضافے کے ساتھ ایڈیشن شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۹۱ء میں مجروح سلطان پوری نے ''غزل'' میں ترمیم و اضافے کے ساتھ اپنا مجموعہ کلام ''مشعل جاں'' کے نام سے شائع کرایا۔ ۱۹۹۹ء میں ''مشعل جاں'' اردو کے ساتھ ساتھ ناگری میں بھی غزلوں کے اشعار میں ترمیم اور اضافے کا عمل نظر آتا ہے۔ چند ایسے ہی اشعار ملاحظہ فرمائیں جو کبھی ''غزل'' میں نہ تھے اور ''مشعل جاں'' میں ہیں یا الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ ہیں۔

۱ یہ رکے رکے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں
یوں ہی کب تلک خدایا غم زندگی نباہیں

۲ مرے عہد میں نہیں ہے، یہ نشان سر بلندی
یہ رنگ ہوئے امامے یہ جھکی جھکی کلاہیں

۱۹۴۴ء

(۱) ''مشعل جاں'' ۱۹۹۱ء میں یہ مصرعہ اس طرح ہے ''یہ رکے رکے سے آنسو یہ دبی دبی سی آہیں۔'' (۲) یہ شعر ''غزل'' ۱۹۵۳ میں نہیں ہے۔

۳ اک ستم گر تو کہ وجہ صد خرابی تیرا درد
اک بلا کش میں کہ تیرا کام ہی گیا

۴ ہم قفس !صیاد کی رسم زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی انداز کلام آہی گیا

۵ اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمہ سحر بھی ہے ،آہ صبح گاہی بھی

۶ وہی آستاں ہے وہی جبیں وہی اشک ہے وہی آستیں
دل زار تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے

۷ انھیں کب کے راس بھی آ چکے تری بزم ناز کے حادثے
اب اٹھے کہ تیری نظر پھرے جو گرے تھے گر کے سنبھل گئے

۸ یہ نیاز غم خواری،یہ شکست دل داری

بس نوازش جاناں، دل بہت پریشان ہے

۹ یہی جہاں ہے جہنم ،یہی جہاں فردوس
بتاؤ عالم بالا کے سیر بینوں کو

۱۰ جو سمجھاتے بھی آکر واعظ برہم تو کیا کرتے
تم اس دنیا کے آگے اس جہاں کا غم تو کیا کرتے

۱۱ غم جہاں کو غم دل بنا کے کچھ نہ ملا
کہ جس سے زیست کو راحت ملے وہ کام کریں

۱۲ غلام رہ چکے توڑیں یہ بند رسوائی
خود اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں

۱۳ زمیں کو مل کے سنواریں مثال روئے نگار
رخ نگار کی ضو سے فروغ بام کریں

۱۴ مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروحؔ
وہ سر زمیں کہ ستارے جسے سلا م کریں

۱۵ میں تو جب مانوں کہ بھردے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیرمغاں بنتا گیا

۱۶ دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیاوہ جاوداں بنتا گیا

۱۷ امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہالہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلامارلے ساتھی جانے نہ پائے

۱۸ سنتے ہم تو کیاسنتے اک بزرگ کی باتیں
صبح کو علاقہ کیاشام کے افسانے سے

۱۹ وہ لگا کے سینے سے فلسفہ تصوف کا

شیخ جی حسینوں میں پھرتے ہیں دوانے سے

۲۰ خود کشی ہی راس آئی دیکھ بد نصیبوں کو
خود سے بھی گریزاں ہیں بھاگ کر زمانے سے

۲۱ سرخ انقلاب آیا دور آفتاب آیا
منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے

۲۲ اب جنوں پہ وہ ساعت آپڑی کہ اے مجروحؔ
آج زخم سر بہتر دل پہ چوٹ کھا نے سے

۲۳ ستم کو سرنگوں ظالم کو رسوا ہم بھی دیکھیں گے
چل اے عزم بغاوت چل تماشا ہم بھی دیکھیں گے

۱۹۵۰ء

۲۴ بول کچھ بول مقید لب اظہار سہی
سر منبر نہیں ممکن تو سر دار سہی

۲۵ آنے دے باغ کے غدار مرا روز حساب
مانگے تنکا نہ ملے گا یہی گلزار سہی

۲۶ حل تو ہونا ہے مگر مسئلہ تشنہ لبی
ساغر خشک ابھی عقدۂ دشورا سہی

۲۷ کیا ہوا جو دست و پا ہیں خوں میں نہلائے ہوئے
ہم بھی ہیں اے دل بہاراں کی قسم کھائے ہوئے

۲۸ کانپ کے سر سے زمیں پر گر پڑا خسرو کا تاج
بڑھ رہا ہے تیشہ زن کوہ گراں ڈھائے ہوئے

۲۹ صد چاک فریب امن و سکوں عریاں ہے انسانی کا جنوں
کچھ خوں سے شہیدوں نے اپنے وہ گل ہیں کھلائے زنداں میں

۳۰ مجروح نے بھی دیکھا اس کو اے کہنہ نظام سرمایہ

تیری ہوئی بنیاد مگراب کیا ہے بنائے زنداں میں

۳۱ بہہ کر زمیں پہ ہے ابھی گردش میں خوں مرا
قطرے وہ پھول بنتے ہیں خاک وطن کے ساتھ

۳۲ ہشیار سامراج کہ زنجیرایشیا
ٹوٹے گی تیرے سلسلۂ جان وتن کے ساتھ

۳۳ اے دزد مال خام ! کدالوں کی سرزمیں
کر لے گی تجھ کو دفن ترے مکر و فن کے ساتھ

۳۴ بھڑکی ہوئی یہ آگ مرے لالہ زار کی
پھونکے گی تجھ کو خون بھرے پیرہن کے ساتھ

۳۵ تاریکیوں کی طرح سے مغرب میں لے پناہ
مشرق سے بھاگ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ

۳۶ کہاں بچ کر چلی اے فصل گل مجھ آبلہ پا سے
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

۳۷ جلوہ گل کا سبب دیدۂ تر ہے کہ نہیں
میری آہوں سے بہاراں کی سحر ہے کہ نہیں

۳۸ میرے ہونٹوں پہ تڑپتے ہیں ابھی تک شکوے
جانے اس کی وہی نیچی سی نظر ہے کہ نہیں

۳۹ روئی مشرق کی قسم ہم کو ہے اتنا معلوم
شب دوراں ترے دامن میں سحر ہے کہ نہیں

۴۰ ہوگی تجھ کو تو مری آبلہ پائی کی خبر
آہ یہ دشت سیہ وہ چمن سرخ ترا

۴۱ مژدہ اے صبح وطن آہی گیا تیغ بکف

وہی مجروح وہی نعرہ زن سرخ ترا

۴۲ رہے نہ آنکھ تو کیوں دیکھئے ستم کی طرف
کٹے زبان تو کیوں حرف ناروا کہئے

۴۳ منعم کی طرح پیر حرم پیتے ہیں وہ جام
رندوں کو بھی جس جام سے پرہیز بہت ہے

۴۴ گو رات مری صبح کی محرم تو نہیں ہے
سورج سے ترا رنگ حنا کم تو نہیں ہے

۴۵ حرف طلب سینے میں کچل دو شرط وفا ٹھہری ہے یہی
کاٹ کے رکھ دو اپنی زبان فرمان ظل الٰہی

۱ ''مشعل جاں'' (۱۹۹۱) میں یہ مصرعہ اس طرح ہے ''یہ در کے رکے سے آنسو یہ دبی دبی سی آہیں''

۲ یہ شعر ''غزل'' (۱۹۵۳) میں نہیں ہے۔

۳ یہ شعر "غزل" (۱۹۵۳ء) میں نہیں ہے۔

۴ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱ء) میں نہیں ہے۔

۵ یہ شعر "غزل" (۱۹۵۳ء) میں نہیں ہے۔

۶ یہ شعر "غزل" کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ (۱۹۵۳ء) میں نہیں ہے

۷ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱ء) میں نہیں ہے۔

۸ یہ شعر "غزل" (۱۹۵۳ء) میں نہیں ہے۔

۹ یہ شعر "غزل" (۱۹۵۳ء) میں نہیں ہے۔

۱۰ "مشعل جاں" (۱۹۹۱ء) میں "ہم" ہے۔

۱۱ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱ء) میں نہیں ہے۔

۱۲ "مشعل جاں" میں "کچھ" ہے۔

۱۳ "مشعل جاں" میں یہ مصرع اس طرح ہے "رخ نگار سے روشن چراغ بام کریں"

۱۴ "مشعل جاں" میں ۱۹۵۰ء کا سن دیا ہے۔

۱۵ "مشعل جاں" میں ۱۹۵۰ء میں "جانوں" ہے۔

۱۶ "مشعل جاں" میں "۱۹۴۷ء ہے

۱۷ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱ء) میں نہیں ہے۔

۱۸ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱ء) میں نہیں ہے۔

۱۹ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱ء) میں نہیں ہے۔

۲۰ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱ء) میں نہیں ہے۔

۲۱ "مشعل جاں" میں سرخ نہیں "عہد" ہے اور اشعار کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔

۲۲ "مشعل جاں" میں سن کے بعد "آرتھر روڈ جیل، بمبئی" اضافہ ہے۔

۲۳ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۲۴ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۲۵ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۲۶ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۲۷ "غزل" کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ (۱۹۵۳)ء میں یہ مصرع اس طرح ہے "ہوں جو سارے دست و پا خوں میں نہلائے"

۲۸ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۲۹ "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں "قبائے امن" ہے۔

۳۰ "مشعل جاں" میں مقطع نہیں ہے۔

۳۱ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۳۲ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۳۳ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۳۴ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۳۵ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۳۶ "غزل" کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ (۱۹۵۳)ء میں یہ مصرع اس طرح ہے "دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو"

۳۷ "غزل" کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ (۱۹۵۳)ء میں یہ مصرع اس طرح ہے "باعث جلوہ گل دیدۂ تر ہے کہ نہیں"

۳۸ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۳۹ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۴۰ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۴۱ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں نہیں ہے۔

۴۲ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں ناروا کی جگہ ناسزا ہے۔

۴۳ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں یہ مصرع اس طرح ہے "مانا شب غم، صبح کی محرم تو نہیں ہے

۴۴ یہ شعر "مشعل جاں" (۱۹۹۱)ء میں ناروا کی جگہ ناسزا ہے۔

۴۵ یہ شعر "مشعل جاں" ۱۹۹۹)ء میں نہیں ہے۔

باب ششم

مجروحؔ کی شاعرانہ عظمت

مجروحؔ سلطان پوری کی شاعرانہ عظمت

مجروح سلطان پوری کا شمار صف اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے لگ بھگ ساٹھ سال اردو شعروادب کی خدمت کی ہے...وارث کرمانی صاحب نے مجروح سلطان پوری پر ایک مضمون لکھا تھا جو آج کل نئی دہلی کے اپریل ۱۹۹۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔مضمون کے آغاز میں انھوں نے لکھا تھا:

''غالب کے بعد اگر اردو کی پوری غنائی شاعری کے صرف ایک ہزار شعروں کا انتخاب کیا جائے جس میں حالیؔ ،داغؔ ،اقبالؔ اور نہ جانے کتنے بلند اقبال شاعر نظر آجائیں گے تو اس انتخاب میں مجروحؔ سلطان پوری کا کوئی شعر ضرور آجائے گا اور اگر بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے تمام شاعروں کے کلام سے سو بہترین غزلیں منتخب کی جائیں تو

اس میں مجروحؔ کی کئی غزلیں آجائیں گی اور پھر سب سے
اہم بات یہ ہے کہ اگر ایسے اشعار کو یکجا کیا جائے جو اس
وقت باذوق لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں تو ان میں
مجروحؔ کے شعروں کی تعداد اپنے معاصرین میں سب سے
زیادہ ہوگی۔''(۱)

اگر چہ مجروحؔ کو اقبال سمان ، غالب ایوارڈ اور دادا پھالکے جیسے انعامات سے نوازا گیا لیکن ہمارے نقادوں نے مجروحؔ کو وہ مرتبہ نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مجروحؔ ہر چیز سے بے نیاز اپنے فن میں ڈوبے رہے۔انھوں نے کبھی کسی نقاد کی خوشامد کی اور نہ کسی کے آگے پیچھے پھرے۔جھوٹی کمانے کے لیے جو حربے آجکل عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔مجروحؔ نے ان کا استعمال کبھی نہیں کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ساہتیہ اکادمی کے ''ہوز ہو'' میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے بہت کم درجے کے لوگوں کا ذکر ہے لیکن مجروحؔ سلطان پوری کو اس میں قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔اس پر ہمارے نقادوں کا عذر یہ تھا کہ مجروحؔ کی تخلیقی صلاحیت کا بیشتر حصہ فلمی گانے لکھنے میں صرف ہوتا ہے۔ یہ تو درست ہے کہ مجروحؔ نے فلمی گانے لکھے لیکن یہ بھی اسی قدر درست ہے کہ اردو کو ہندوستان میں مقبول بنانے میں جتنا مجروحؔ کا حصہ ہے اتنا ان کے علاوہ بس ساحر لدھیانوی کا ہے اور جہاں تک ہمارے بیشتر نقاد حضرات کا تعلق ہے ان کے اسمائے گرامی سے بھی دوسری زبانوں کے لوگ تو کیا خود اردو والے بھی واقف نہیں ۔ یہ نتیجہ مغربی انداز پر دی جانے والی ہماری اس تعلیم کا ہے جس میں فن کار سے زیادہ نقاد اور محقق کی اہمیت ہوتی ہے۔رہا سوال مجروحؔ کی شاعری کا تو اردو شاعری میں ان کا مرتبہ کسی بھی ترقی پسند شاعر سے کم نہیں۔صرف فلمی حلقوں ہی میں مقبولیت حاصل نہیں رہی وہ اردو کے صاحب ذوق طبقے میں بھی غیر معمولی طور پر پسند کیے جاتے رہے ہیں اور ان کے یہ چند

(۱) گلکاری وحشت کا شاعر مجروح سلطانپوری مرتب: خلیق انجم ص ۷

اشعار تو زبان زدِ عام ہیں:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں کہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
تیرا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آگئی
وہی لب نہ میں جنھیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے

مجروحؔ اگر اپنے معاصرین کے گل نہیں کر سکے تو فن کی روشنی معاصرین کے چراغوں سے کسی طور کم نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجروحؔ کا شعری آہنگ ،فکری مزاج اور پیرایۂ اظہار انھیں بیسویں صدی کے شاعروں میں بہت ممتاز مقام دلاتا ہے۔

اپنی شاعری اور فلمی گانوں کی وجہ سے انھیں دنیا کے ان تمام چالیس پینتالیس مما لک میں شہرت حاصل ہوئی جہاں اردو بولنے اور سمجھنے والے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ روس ،امریکہ،کنیڈا،انگلینڈ،فرانس ،موریشس اور خلیجی مما لک میں ان کے اعزاز میں جلسے ہوئے اور انھیں انعامات سے نوازا گیا۔

ان کی شاعری کے انتخاب کا ایک ترجمہ کینیڈا کے جناب بیدار بخت اور Maric Anni Arki (میرس اینی آرکی) نے کیا ہے۔ جو ''Never Mind Your Change'' کے نام سے روپا اینڈ کمپنی سے شائع ہو چکا ہے۔

مظہر امام رقمطراز ہیں:

شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے بچپن میں مجروحؔ کے یہ دو شعر شکیل بدایونی کے نام سے سنے تھے:

یہ رکے رکے سے آنسو یہ دبی دبی سی آہیں
یوں ہی کب تلک خدایا غم زندگی نباہیں

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

(۱) گلکاری وحشت کا شاعر مجروح سلطانپوری مرتب: خلیق انجم ص ۱۰۱

پروفیسر شمیم حنفی فرماتے ہیں:

''انھوں نے کئی یادگار غزلیں اور محاوروں کی طرح زبان پر چڑھ جانے والے بہت سے شعر کہے:''(۱)

تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہیے میکدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں

پارۂ دل ہے وطن کی سر زمیں مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں

۱۹۵۸ء

کا م آئے بہت لوگ سر مقتل ظلمات
اے روشنیٔ کوچۂ دلدار کہاں ہے

اے فصل جنوں ہم کو پئے شغل گریباں
پیوند ہی کافی اگر جامہ گراں ہے

۱۹۶۰ء

کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے
ہوئے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

(۱) گلکاری وحشت کا شاعر مجروح سلطانپوری مرتب: خلیق انجم ص ۱۱۴

مجھے نہیں کسی اسلوب شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

۱۹۵۹ء

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح
اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولتِ بیدار کی طرح
بے تیشۂ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقش پابلند ہے دیوار کی طرح

۱۹۶۳ء

لٹ گیا قافلۂ اہل جنوں بھی شاید
لوگ ہاتھوں میں لیے تار رسن جاتے ہیں
روک سکتا ہمیں زندان بلا کیا مجروح
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

۱۹۷۳ء

آہی جائے گی سحر مطلع امکاں تو کھلا

نہ سہی باب قفس روزن زنداں تو کھلا

سیل رنگ آہی رہے گا مگر اے کشت چمن

ضرب موسم تو پڑی بند بہاراں تو کھلا

۱۹۶۲ء

اسیر بند زمانہ ہوں صاحبان چمن

مری طرف سے گلوں کو بہت دعا کہیے

پکاریے کف قاتل کو اب معالج دل

بڑھے جو ناخن خنجر گرہ کشا کہیے

۱۹۶۰ء

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے

جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

دیار شام نہیں منزل سحر بھی نہیں

عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے

ہمارے لب نہ سہی وہ دہان زخم سہی

وہیں پہنچتی ہے یارو کہیں سے بات چلے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ

جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
پھر آئی فصل کہ مانند برگ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

۱۹۶۲ء

مانا کہ شب غم صبح کی محرم تو نہیں ہے
سورج سے ترا رنگ حنا کم تو نہیں ہے
کچھ زخم ہی کھائیں چلو کچھ گل ہی کھلائیں
ہر چند بہاراں کا یہ موسم تو نہیں ہے

۱۹۷۶ء

ہم اہل عشق میں نہیں حرف گنہ سے کم
وہ حرف شوق جو سر محفل کہا نہ جائے

۱۹۸۱ء

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے
موسم کی ہوا اب جنوں خیز بہت ہے
مصلوب ہوا کوئی سر راہ تمنا
آواز جرس پچھلے پہر تیز بہت ہے

۱۹۷۶ء

کچھ نہ کچھ آج اسیروں نے کہا ہے تو ضرور
ایک اک گل سے لپٹتی ہے صبا گلشن میں

۱۹۹۴ء

شاہد ماہلی رقمطراز ہیں:

"فلمی نغموں میں بھی انھوں نے ادبیت برقرار رکھی ہے۔ اردو اور فارسی کے مخصوص الفاظ جو اب تک فلموں میں رائج نہیں تھے انھوں نے کامیابی کے ساتھ انھیں فلمی نغموں میں استعمال کیے۔ مجروحؔ صاحب کے چند گیت تو ایسے ہیں کہ ان کو جتنی بار سنو اتنی ہی بار سننے کو دل چاہتا ہے۔" (۱)

پروفیسر عبدالمغنی کے خیال میں:

"تغزل کی خصوصیات مجروح کو ان کے ہم مشرب معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔" (۲)

ڈاکٹر بشیر بدر کے مطابق:

"مجروح صاحب کے ایسے اشعار جو غزل کے ہر منتخاب میں شامل رہیں گے: (۳)

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

(۱، ۲، ۳) گلکاری وحشت کا شاعر مجروح سلطانپوری مرتب: خلیق انجم ص ۱۳۸، ۱۴۶، ۱۵۰

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

سر پر ہوئے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

مجروح سلطان پوری کے سچے شاعر ہونے کا اعتراف ان کے ان ہی اشترا کی غزلیہ شعروں سے ہوتا ہے۔ان اشعار کا ہیرو غیر معمولی صلاحیت کا عام انسانوں سے سر بلند پیمبرانہ شان کا انقلابی ہے۔''

مجروح سلطان پوری کی شاعرانہ عظمت صرف غزل تک محدود نہیں ہے۔انھوں نے بعض فلمی نغمے بھی اس طرح کے لکھے ہیں کہ اگر انھیں علاحدہ طور پر کوئی عنوان دے کر شائع کیا جائے تو انھیں کوئی بھی باضابطہ نظم تسلیم کر لے گا۔ملاحظہ ہوں:

مری دنیا ہے ماں تیرے آنچل میں
شیتل چھایا تو دکھ کے جنگل میں

مری راہوں کے لیے تری دو انکھیاں
مجھے گیتا سے بڑی تری دو بتیاں

یگ میں ملتاجوسو ملاوہ پل میں
میں نے آنسو بھی دیے پر تو روئی نا

مری نندیاکے لیے برسوں سوئی نا
ممتاباقی رہی غم کے ہلچل میں

آؤ نادھوکے پیوں میں چرن ترے ماں
دیوتا پیالہ لیے در پہ کھڑے ماں

امرت سب کا ہے اسی گنگاجل میں
(فلم ''تلاش'')
اک دن بک جائے ماٹی کے مول
جگ میں رہ جائیں گے پیارے تیرے بول
دوجے کے ہونٹوں، کو دے کر اپنے گیت
کوئی نشانی چھوڑ پھر دنیاسے ڈول

انہونی پیٹھ پر کانٹے لاکھ بچھائے
ہونی تو پھر بھی بچھڑا یار ملائے

یہ برہا یہ دوری دو پل کی مجبوری
پھر کوئی دل والا کاہے گھبرائے

دھارا جو بہتی ہے مل کے رہتی ہے
بہتی دھارا بن جا پھر دنیا سے ڈول
(فلم "دھرم کرم")

جو چلا گیا اسے بھول جا
وہ نہ سن سکے گا تری صدا
یہ حیات و موت کی ہے ڈگر
کوئی خاک میں کوئی خاک پر
یہ تو جان لے وہ کوئی نہ تھا
وہ غبار تھا ترا ہمسفر
اسے دور لے کے گئی ہوا

کوئی التجا کوئی بندگی
نہ قضا سے ہاتھ چھڑا سکی
کئے آدمی نے بڑے جتن
مگر اس کے کام نہ آسکی
نہ کوئی دوا نہ کوئی دعا
(فلم ''ساتھی)

محمد ایوب واقف کہتے ہیں:

''انھوں نے گنتی کی غزلیں کہنے کے باوجود زیادہ سے زیادہ ضرب المثل اشعار دئے۔ ہماری اردو کی شاعری میں یہ نادر مثال ہے جسے مجروح صاحب نے پیش کیا۔ اشعار ملاحظہ ہوں:(۱)

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے

(۱) گلکاری وحشت کا شاعر مجروح سلطانپوری مرتب: خلیق انجم ص ۲۸۱

جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

شب ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کارواں سحر نہ ہو

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

اپنی اپنی ہمت ہے اپنا اپنا دل مجروح
زندگی بی ارزاں ہے موت بھی فراواں ہے

سر پرہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

روک سکتا ہمیں زنداں بلا کیا مجروح
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

داغ سے مہکی ہوئی زخموں سے لالہ پیرہن
کس قدر ملتی ہے شاخ دار سے شاخ چمن

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

مجروح کی نظم نما نغموں کے علاوہ ان کی نظموں کو بھی فلموں میں شامل کیا گیا۔ اس طرح عام فلموں میں غزلوں، نظموں، قوالیوں، وغیرہ کا بھی چلن شروع ہوا۔ اس قسم کی کچھ مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

تری آنکھو کی چاہت میں سب کچھ لٹا دوں گا

محبت کیسے کی جاتی ہے دنیا کو دکھا دوں گا

(جنتا حولدار)

ٹکڑے ہیں مرے دل کے اے یار ترے آنسو
دیکھے نہیں جاتے ہیں دلدار ترے آنسو

(میرے صنم)

ہمیں کریں کوئی صورت انھیں بلانے کی
سنا ہے ان کو تو عادت ہے بھول جانے کی

(ایک نظر)

کہیں بے خیال ہو کر یوں ہی چھو لیا کسی نے
کئی خواب دیکھ ڈالے یہاں میری بے خودی نے

(تین دیویاں)

تجھے کیا سناؤں اے دل ربا
ترے سامنے مرا حال ہے
تری اک نگاہ کی بات ہے
مری زندگی کا سوال ہے

(آخری داؤں)

'آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا
کہ مرے دل پہ پڑا تھا کبھی غم کا سایا
(آرتی)

پتھر کے صنم تجھے ہم نے محبت کا خدا جانا
بڑی بھول ہوئی ارے ہم نے یہ کیا سمجھا یہ کیا جانا
(پتھر کے صنم)

مجروحؔ کی ایک شاعرانہ عظمت یہ بھی ہے کہ انھوں نے جس زبان میں شاری کیا اس کے فروغ کے لئے بھی کام کیا۔ پھر چاہے وہ غزل کہہ رہے ہوں یا فلمی نغمے لکھ رہے ہوں۔ حسرت جے پوری، راجندر کرشن، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، راجہ مہدی علی خاں، جیسے ہم عصروں کے ساتھ فلم لائن میں قریب ۵۴ برسوں تک ٹکر لیتے رہنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن اپنی قابلیت کی بنا پر مجروح صاحب نے اپنے قلم کے زور کا لوہا منوا کر رکھا۔ ان کے مقبول کلام کے چند اور نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن میں اردو الفاظ کی جھلک نمایاں ہیں:

دل جو نہ کہہ سکا وہی راز دل
کہنے کی رات آئی
(بھیگی رات)

مرا تو جو بھی قدم ہے وہ تیری راہ میں ہے
کہ تو کہیں بھی رہے تو مری نگاہ میں ہے
(دوستی)

کو ئی ہمدم نہ رہا کوئی سہارا نہ رہا
ہم کسی کے نہ رہے کوئی ہمارا نہ رہا
(جھمرو)

کوئی آیا دھڑکن کہتی ہے
رہ رہ کے پلکوں کی گرتی اٹھتی چلمن کہتی ہے
کوئی آیا
(لاجونتی)

ہم بے خودی میں تم کو پکارے چلے گئے
ساغر میں زندگی کو اتارے چلے گئے
(کالا پانی)

دیوانہ مجھ سا نہیں اس امبر کے نیچے
آگے ہے قاتل میرا اور میں پیچھے پیچھے
(تیسری منزل)

قرۃالعین حیدر:

''ساحراور مجروح نے فلمی گانوں کامعیار اتنا بلند کردیا کہ ان کے بہت سے گیتوں کو ادبی اہمیت حاصلہ ہوئی آپ دنیاکے کسی گوشے میں چلے جائیے جہاں ہندوستانی آباد ہیں وہاں آپ کو دوردراز کی پہاڑیوں اور گاؤں اورشہروں میں لتا کی آواز میں گائے ہوئے مجروح کے نغمے سنائی دیں گے۔''(۱)

پرفیسر گوپی چند نارنگ:

''افسوس مجروح سلطان پوری سے اٹھ جانے سے ترقی پسندغزل کامیرتقی میرت خصت ہوگیا۔قبول عام اورلطف سخن کوخداداد کہا گیاہےلیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت کچھ صلاحیت ،تربیت اور ذاتی کوششوں پر منحصر ہے، مجروح سلطان پوری کاکمال یہ تھا کہ فارسی اور اردو شاعری کی غزلیہ روایت کی روح کوانھوں نے جذب کرلیا تھااوران کی آواز میں ایسا جمالیاتی رچاؤاور کشش پیدا ہوگئی تھی کہ ان کی بات دل پراثر کرتی تھی۔''(۲)

(۲،۱) گلکاری وحشت کا شاعر مجروح سلطانپوری مرتب:خلیق انجم ص ۳۶۷،۳۶۸

پروفیسر عبدالقوی دسنوی:

''ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس وقت جب غزل کی
بعض حصوں سے بے جا مخالفت کی جا رہی تھی انھوں نے نہ
صرف غزل کے دامن کو تھامے رکھا بلکہ ہمیشہ غزل کی صنف
کو سر بلندی کرنے کہ کوشش کرتے ہے۔''(۱)

پروفیسر علی احمد فاطمی:

''اس حقیقت کے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ مجروؔح سلطان
پوری غزل کے ایک عمدہ طرحدار اور سجیلے غزل گو ہیں۔ جس
زمانے میں ترقی پسندی کے شور وغل میں غزل پس منظر میں
چلی گئی تھی عین اسی زمانے میں انھوں نے سیاسی رمزیت
اور ترقی پسند حسیت کو غزل میں کچھ اس انداز سے جذب و
پیوست کیا کہ وہ غزل کے فکر وفن اور اس کی روشن جمالیات
کا حصہ بن گئی۔ غزل کو ایک نئے آہنگ اور روپتی الفاظ و
تراکیب کو ایک نئے معنیاتی نظام سے دوچار کیا۔''(۲)

خلیق انجم رقمطراز ہیں:

(۲،۱) گلکاری وحشت کا شاعر مجروح سلطانپوری مرتب: خلیق انجم ص ۳۷۸،۳۷۲

''رشید حسن خاں، ظ.انصاری اور مجروحؔ سلطان پوری کے یہاں خاکساری اور انکساری نام کی کوئی چیز نہیں۔ لیکن خود اعتمادی اور انا بلا کی ہے۔ مجروحؔ کے چند شعر ملاحظہ ہوں (۱):

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

ہم ہیں کعبہ ہم ہیں بت خانہ ہمیں ہیں کائنات
ہوسکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجیے

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاش دست رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقش پا سے راہیں

اسی انا کی کوکھ سے جنم لینے والی خوداعتمادی اور احساس برتری یہ نمونہ بھی دیکھیے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

(۱) گلکاری وحشت کا شاعر مجروح سلطانپوری مرتب: خلیق انجم ص ۳۹۲

میرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
کہ نہیں مرا کوئی نقش پا جو چراغ راہ گرز نہ ہو

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھو تا گیاوہ جاوداں بنتا گیا

ڈاکٹر زیبامحمود فرماتی ہیں:

’’آنے والی نسلوں نے مجروح کا جتنا اثر قبول کیا اور دنیا میں جتنی شہرت ہوئی عقیدت کے پھول پیش کئے وہ بے مثال فاضلوں اور عالموں نے مجروح کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں مختلف عنوانوں کے تحت جو ہے۔‘‘(۱)

ڈاکٹر زیبامحمود مذید فرماتی ہیں:

’’مجروحؔ اردو شاعری کا منارۂ نور ہیں، جس کی مقبولیت اور شہرت زمان و مکاں کے حدوں کو پار کر چکی ہے۔ انھوں نے شاعروں کو وقار ہی نہیں بلکہ تہذیب نفس عطا کی۔ مجروحؔ غزل کہنے کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں‘‘۔(۲)

(۱،۲) مجروح سلطانپوری ’’غزل‘‘ کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر زیبامحمود ص۲۲، ۲۸

علی سردار جعفری کا کہنا ہے:

''غزلوں کو ازسرِ نو عصرِ حاضر میں لانے کا
کام فیض اور مجروح نے انجام دیا۔ ہم
اس سلسے میں مجروح کا نام اکثر و بیشتر
بھول جاتے ہیں حالانکہ ان کا
Contribution کسی طرح کم نہیں
رہا ہے۔''(۱)

پروفیسر علی احمد فاطمی:

...''ادب میں بھی ان کی کج کلہی، کج ادائی
ان کے بانکپن اور محبوبیت کا حصہ بن گئی
اور وہ ہر طبقۂ فکر میں قدر و منزلت کی
نگاہوں سے دیکھے گئے۔''(۲)

مجروح کا یہ بھی بڑپن ہے کہ وہ اپنے فلمی گیتوں میں بھی ادب کا عنصر پیدا کرنے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱،۲) تین ترقی پسند شاعر مصنف: پروفیسر علی احمد فاطمی ص ۸۴، ۸۶

''...اگر پھر بھی ہلکا پھلکا گیت لکھنا پڑا تو اس میں یوں کوئی بات ،کوئی نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں ہماری پسند ہی چلتی تھی، اکثر و بیشتر گانوں کی نہ صرف دھنیں ہم نے بنائیں بلکہ اس گیت اور کیفیت کے اعتبار سچویشن کو ڈھال دیا کرتے ہیں اور ہماری بات ڈائرکٹر بھی مانتا تھا اس لئے ہماری عزت ہے تھوڑی بہت ہماری خد مت ہے اور یہ سب یونہی تو نہیں ہوتا اس کے لئے بڑی تپسیا کرنی پڑتی ہے۔''(۱)

پروفیسر علی احمد فاطمی مذید فرماتے ہیں :

''انھیں کی توسط سے اے۔آر۔کاردار کی فلم شاہ جہاں میں گیت لکھنے کا کام ملا اور انھوں نے اس فلم کے دس گیتوں میں آٹھ گیت لکھے اور سب کے سب مقبول ہوئے اور مجروح اپنے فلمی کیریر کی پہلی ہی منزل پر دھوم مچا گئے اور دھاک بھی جما گئے۔'' (۲)

مجروح سلطان پوری کی عظمت ہر جگہ واضح ہے۔انھوں نے فلمی گیتوں میں کچھ اختراع بھی کی ہے۔وہ خود رقمطراز ہیں:

(۱،۲) تین ترقی پسند شاعر مصنف: پروفیسر علی احمد فاطمی ص ۹۹،۸۹

''رومانی مزاحیہ قسم کے گیت جیسے ''چھوڑ دو آنچل زمانہ کیا کہے گا''، ''آنکھوں میں کیا جی سنہرا بادل'' جیسے گیت میری ہی ایجاد ہیں ۔ برتھ ڈے گیت سب سے پہلے میں نے ہی شروع کیا تھا۔''(۱)

پروفیسر علی احمد فاطمی بھی بتاتے ہیں :

''مجروح اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ ڈویل گیت بھی انھوں نے ہی شروع کئے ۔ یہ بات بھی صحیح ہے لیکن سچ یہ ہے کہ مجروح کی مقبولیت یا شہرت بلکہ عظمت ان کے ان گیتوں ونغموں میں ہے جن میں سفر بازار یا ہدایت کار کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کی اپنی شعریت اور تخلیقیت کام کرتی نظر آرہی ہے ۔ مجروح جہاں جیسا بھی موقع ملا انھوں نے اپنی غزلیت یا فنکاریت کو عمومی لہجہ کیتے ہوئے اس مین بلا کی کیفیت اور نغمگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ان کے بعض نغمے یا نغموں کے نعض اشعار بھرپور غزل کے اشعار محسوس ہوتے ہیں مثلاً:(۲)

کہیں بے خیال ہو کر یوں ہی چھو لیا کسی نے
کئی خواب دیکھ ڈالے یہاں میری بے خودی نے

اب کیا مثال دوں میں تمھارے شباب کی
انسان بن گئی ہے کرن آفتاب کی

چھپا ہوا تھا مجھی میں بھی تو کہیں اے دوست
میری ہستی میں نہیں ہے تو میری آہ میں ہے

دعویٰ تھا جنھیں ہمدردی کا خود آ کے نہ پوچھا حال کبھی
محفل میں بلایا ہے ہم پر ہنسنے کو ستمگاروں کی طرح

کبھی اس پری کا کوچہ کبھی اس حسیں کی محفل
مجھے در بدر پھرایا مرے دل کی سادگی نے

بہاراں چیز ہے کیا کیا ہے پھول کلیاں کس کو کہتے ہیں

ہو میرا سر سلامت میں تیرا جیون سجا دوں گا

آنکھیں تھیں اور آئے تھے وہ بھی نظر مجھے
پھر کیا ہوا نہیں ہے کچھ اس کی خبر مجھے

ٹکڑے ہیں مرے دل کے اے یار تیرے آنسو
دیکھے نہیں جاتے ہیں دلدار ترے آنسو

تجھے کیا سناؤ اے دل ربا ترے سامنے مرا حال ہے
تری اک نگاہ کی بات ہے مری زندگی کا سوال ہے

جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

پروفیسر علی احمد فاطمی آگے بتاتے ہیں :

" مجروحؔ شاعری کے اعلیٰ ادب سے بھی اتنا ہی وابستہ رہے اور

اپنا نام و مقام پیدا کیا اور فلمی شاعر میں بھی ایک اعتبار و
وقار کا درجہ قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح پوری ترقی
پسند غزلوں ی حیثیت سے جو عزت و حیثیت مجروح کی
ہے کسی اور کی نہیں اسی طرح فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے
جو شہرت مقبولیت اور احترام مجروؔح کا ہے شاید ہی کسی
دوسرے گیت کار کو ملا ہو یہی وجہ ہے کہ فلموں کا سب سے
بڑا اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ پہلی بار کسی نغمہ نگار
کو ملا تو وہ مجروؔح صاحب ہی تھے۔''(۱)

''غزل'' کے پیش لفظ سے کچھ اقتباسات:

مجروح، اپنے افکار میں بزم کو رزم سے ملا دیتے ہیں اور تقلید سے بچ کر اپنی محفل الگ آراستہ کرتے ہیں:

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

یہ انفرادیت مجروح کے مقام کو بلند کرتی ہے لیکن اس انفرادیت کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ ان کا رشتہ زندگی کے حقائق سے قائم نہ رہے۔ وہ تو قائم رہتا ہے، صرف انداز بیان بدلا ہوا ہوتا ہے:

تین ترقی پسند شاعر مصنف: پروفیسر علی احمد فاطمی ص ۱۱۲

وہی بات جو وہ نہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آ گئی
وہی لب نہ میں جنھیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے

اس انفرادیت کے اکثر دلچسپ پہلو مجروح کی شخصیت میں نمایاں ہیں لیکن ان کے کلام کا حسن یہ ہے کہ جب ان کی انفرادیت کوئی دعویٰ کرتی ہے تو وہ شیخی اور گھمنڈ کی آلودگی سے پاک ہوتا ہے، مثلاً:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

یا

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

یہ خودستائی نہیں ہے بلکہ خوداعتمادی ہے۔ مجروح کے کلام کا یہی حسن ہے جو ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔

ایک اور خصوصیت جو مجروح کو عام غزل شعرا سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ انھوں نے سماجی اور سیاسی موضوعات کو بڑی کامیابی کے ساتھ غزل کے پیرائے میں ڈھال لیا ہے۔
مجروح اپنے ہم عصر شاعروں میں اس لئے بھی سب سے زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں کہ وہ ایک

فطری شاعر ہیں۔ان کی شخصیت میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جوایک شاعر کو غیر شاعر سے ممیز کرتے ہیں۔

قاضی عبدالغفار:

''غزل کے میدان میں انھوں نے وہ سب کچھ کیا ہے جس کے لئے بعض ترقی پسند شعرا صرف نظم کا پیرایہ ضروری اور ناگزیر سمجھتے ہیں، صحیح طور پر انھوں نے غزل کے نئے شیشے میں ایک نئی شراب بھر دی ہے۔''(۱)

انھوں نے اپنے انداز تغزل میں کچھ ایسے تیور پیدا کر لئے، جو صرف انھیں سے مخصوص ہیں، سیاسی موضوعات سے پر ان کی غزلوں میں جو آبداری ہے وہ معدودے چند شعرا کو نصیب ہے۔

کچھ اور منتخب اشعار ملاحظہ ہوں جو ان کے مخصوص انداز سخن کی نمائندگی کرتے ہیں:

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۳

روک سکتا ہمیں زندان بلا کیا مجروح
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

جست کرتا ہوں تو لڑ جاتی ہے منزل سے نظر
حائل راہ کوئی اور بھی دیوار سہی

کام آئے بہت لوگ سر مقتل ظلمات
اے روشنی کوچۂ دلدار کہاں ہے

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

پڑے جو سنگ تو کہیے اسے نوالۂ زر
لگے جو زخم بدن پر اسے قبا کہیے

اسیر بند زمانہ ہوں صاحبان چمن
مری طرف سے گلوں کو دعا کہیے

دیار جور میں رستہ ہے اک یہی ورنہ
کسے پسند ہے اے دل کہ سیر دار کرے

اب جنوں پہ وہ ساعت آ پڑی کہ اے مجروح
آج زخم سر بہتر دل پہ چوٹ کھانے سے

رفیعہ شبنم عابدی رقمطراز ہیں:

''مجروح سلطان پوری رومان کو انقلاب کی نذر نہیں کرتے بلکہ انقلاب کر رومان میں ڈبو کر زندگی کو حسین بنانے کی دعوت دیتے ہیں:(۱)

اہل طوفاں ! آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو بھنور کو چشم جانانہ کہیں

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۹۹

دار پر چڑھ کر لگائیں نعرۂ زلف صنم
سب ہمیں باہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں

یار نکتہ داں کدھر ہے پھر چلیں اس کے حضور
زندگی کو دل کہیں اور دل کو نذرانہ کہیں

تھامیں اس بت کی کلائی اور کہیں اس کو جنوں
چوم لیں منھ اور اسے انداز نذرانہ کہیں

یہ اشعار دیکھئے کہ کہیں بھی مزدور یا کسان کا نام نہیں آتا مگر یہ کیا ان کے متعلق نہیں کہے گئے؟ لہجے کی غنائیت ملاحظہ ہو:

دست منعم مری محنت کا طلب گار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سر بازار سہی

وہ جس کے گداز محنت سے پر نور شبستاں ہے تیرا
اے شوخ اسی بازو پہ تری زلفوں کو پریشاں ہونا تھا

جو مٹی کو مزاج گل عطا کر دیں وہ اے واعظ
زمیں سے دور فکر جنت آدم تو کیا کرتے

کہاں بچ کر چلی اے فصل گل مجھ آبلہ پا سے
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

مرے ہاتھ ہیں تو بنوں گا خود میں اپنا ساقیٔ میکدہ
خم غیر سے تو خدا کرے لب جام بھی مرا تر نہ ہو

مجروحؔ کی غزلوں کی خوبی یہ ہے کہ عصری تقاضوں کے بھرپور اظہار کے باوصف ان کے یہاں کلاسیکی رچاؤ اور روایت کا احترام موجود ہے۔ لسانی اعتبار سے وہ اس دبستان میں شمار کئے جا سکتے ہیں جس میں حافظؔ، یگانہؔ، اقبالؔ اور فیضؔ شامل ہیں۔

☆☆☆

اختتامیہ

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی رقمطراز ہیں:

اردو شاعری میں اگر کوئی صنف سدا سہاگن ہے تو وہ ہے
غزل، اور مجروح سلطان پوری بنیادی طور سے غزل کے
شاعر ہیں۔ کلیم الدین احمد نے غزل کو وحشی صنف سخن کہا تھا
۔اس پر کافی لے دے ہوئی اور اسی کے ردعمل کے طور پر
غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ مغلوں
نے ہندوستان کو تین چیزیں دیں۔ اردو، تاج محل اور غزل
۔ جملہ بڑا دلکش ہے اور اردو والوں کی اجتماعی یادداشت کا
ایسا جذ بن گیا ہے کہ جزوی حقیقت کے مرتبے سے کم
ہونے کے باوجود مقولہ بن گیا ہے اور مقولے کی عمر لمبی
ہوتی ہے۔(۱)

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ مجروح سلطان پوری کا شمار صف اول کے ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ لیکن مجروح سلطان پوری کا مقام و مرتبہ ترقی پسندوں تک محدود نہیں ہے۔ ان کے شعروں کی عظمت ترقی پسندوں کے درمیاں اور ترقی پسندی کے باہر بھی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی جیسے ترقی پسند رجحانات کے سخت مخالف نے بھی مجروح کی مدح سرائی کی اور باقاعدہ ایک مضمون بھی لکھا۔

'ادھر بھی دیکھ تماشہ۔ ہے میری کم سخنی'، فلمی مصروفیت کے سبب مجروح کا ادبی سرمایہ کم ہے۔ جوان بیٹے کی موت نے انھیں یہ ذمہ داری اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ گیت لکھ کر پیسے کمانا ان کی اولین ضرورت میں

---

(۱) مجروح سلطانپوری (گلکارئ وحشت کا شاعر) مرتب خلیق انجم ص ۶۵

شامل ہوگیا تھا جس کے سبب انھیں اکثر غزل کی قربانی دینی پڑی۔

پروفیسر ملک زادہ منظور لکھتے ہیں کہ مجروح صاحب نے ۳/اپریل ۱۹۵۹ء کو میرے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا:

"پچھلے دو مہینوں سے دل میں کیا کیا امنگیں اٹھ رہی ہیں کہ کوئی غزل کہوں ،لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سحر و شام کی مصروفیت ہمیشہ کی طرح ان کا بھی خون کر کے ہی رہے گی ۔بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را،کی جیتی جاگتی تصویر دیکھنی ہوتو فلم لائن میں اپنے شاعروں اور ادیبوں سے ملئے ،نہ روتے بنے گی نہ ہنستے بنے گی۔"

پیش لفظ "مشعل جاں" میں مجروح لکھتے ہیں:

"اس عہد تجارت میں جب کہ حسن فطرت کو جنس اور زرگل کو زر نقد میں تبدیل کیا جا چکا ہے، دیکھئے اس اصناف ہنر کا کیا انجام ہوتا ہے جنھیں ہم شعر و سخن رقص و موسیقی اور صورت گری کہتے ہیں کہ اب تو یہ بھی اشیائے فرد ختنی میں شامل ہو چکے ہیں اور اس دردناک موحول میں لازمی طور پر ہم اہل فن بھی بیچے اور خریدے جاتے ہیں ۔ برسوں پہلے میں نے اسی المنا کی کا نوحہ لکھا تھا:(۱)

(۱) مجروح سلطانپوری "غزل" کے آئینے میں مرتب: ڈاکٹر ثریا محمود ص ۱ (۲) مجروح سلطانپوری مقام اور کلام مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۳۱۳

ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

تبلیغ کی دنیا میں ایڈورٹائزنگ اور کمرشلائزنگ کے اس دور میں قبولیت کی اونچی نشستوں میں تمکن پانے کے لیے کسی پی آر او کا ساتھ رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا غالبؔ کے لیے نوحہ گر کا رکھنا ضروری تھا، مگر ہر شخص کا یہ مقدور کہاں۔ اس نارسائی کا اعتراف تو خود مجروحؔ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''یہ تو درست ہے کہ میری پست، پر کوئی دست شفقت کبھی نہیں رہا۔ مجھے زندہ رکھا تو میرے غیر جانب دار سننے اور پڑھنے والوں نے۔ اور احباب کے منفی رویے کے باوجود مجھے سننے اور پڑھنے والوں نے خواہ کسی طبقے سے ہوں، میری غزل کو کسی صنف سخن سے کم تر نہیں جانا۔ میرے کتنے ہی اشعار آج اردو دنیا والوں کی تحریروں میں دیکھے اور ان کی زبانوں میں سنے جا سکتے ہیں۔ البتہ وقت کی یہ ستم ظرفی ضرور رہی ہے کہ ان میں سے کئی اشعار دوسروں کے نام سے جانے جاتے ہیں۔''(۱)

(''گفتنی ناگفتنی'' پیش لفظ ''مشعل جاں'' مطبوعہ ۱۹۹۱ء)

مرزا سلیم بیگ کے ایک سوال کے جواب میں اپنے پسندیدہ اشعار جو انھوں نے بتائے ان

---

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۳۱۴

کرتے ہیں... یہ انفرادیت مجروحؔ کے مقام کو بلند کرتی ہے

...'' (جنوری ۱۹۵۳ء)

علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

'' مجروح کی غزل کا ایک دوسرا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے ،اچھے فن کے لئے محض منفی جذبہ کافی نہیں ہے ، مثبت قدروں کی تخلیق بھی ضروری ہے، جو حال کا رشتہ مستقبل سے جوڑتی ہیں۔ اور زمانے کے تسلسل کو ادب میں منتقل کر دیتی ہیں...ایسا قاعدہ (ہوا) جس کر کوئی قیمت ادا نہیں کی جا سکتی یعنی ان کی شاعری پر دھار آ گئی ۔غزل کی تلوار میں یہ دھار شاذ و نادر ہی ملتی ہے ۔ مجروح کے علاوہ فیضؔ اور جذبیؔ کے چند نئے اشعار میں یہ دھار نظر آتی ہے ...''(۱)

(جنوری ۱۹۵۳ء)

ہندوستان میں ۱۹۳۵ء میں سیاسی اور قومی بیداری کا ایک نیا طوفان آیا جس کے اثرات ادب پر بھی ایک تحریک کی صورت میں نمودار ہونے لگے۔اقبال اور جوش نے سیاسی نظم نگری کے وہ دلنواز نمونے پیش کئے تھے کہ پڑھے لکھے حلقوں میں غزل اپنی مقبولیت کھونے لگی تھی ۔ یہاں تک کہ ترقی پسندی کی تحریک کے اوائل میں نظم ہی کو سماجی ،تمدنی اور سیاسی تصورات کی پیش کش کے لئے مناسب ترین وسیلۂ اظہار سمجھا جانے لگا، یوں بھی حالی نے جب سے غزل کے متعلق سے کچھ سوالات اٹھائے تھے ہمارے نقاد اس صنف سخن کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ترقی پسندوں کے ایک گھروہ نے

---

(۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ۲۸

میں سے چند ملاحظہ فرمائیں:

ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ

مجروح سلطان پوری کو ان کی شعری وادبی خدمات کے سلسلے میں غالب ایوار
میر، یوپی اردو اکیڈمی کے انعامات کے علاوہ اردو کا اعلیٰ ترین ایوارڈ ''اقبال سمان'' دیا گیا:
شعری و ادبی خدمات کا کھلا اعتراف ہے۔ انھیں فلم کا بھی سب سے بڑا انعام دادا صاحب
ایوارڈ ملا۔ یہ ایوارڈ اس بات کا ثبوت ہے کہ مجروح نے فلمی گیتوں اور نغموں کو بھی ایک اعلیٰ معیا
ہے۔ قاضی عبدالغفار کہتے ہیں:

''شاعر جس ماحول سے متاثر ہوتا ہے، اسی کا عکس اس کے
کلام میں پیدا ہوتا ہے۔ مجروح اپنے افکار میں بزم کو رزم
سے ملا دیتے ہیں اور تقلید سے بچ کر اپنی محفل الگ آراستہ

اس کو جاگیرداری تہذیب اور اقدار کا پردہ کہہ کر مسترد کرنے کی کوشش کی۔ خود غزل کے صف اول کے شعرا کا رویہ بھی یہی تھا کہ یہ صنف ادب کوئی ایسا پیمانۂ اظہار ہے جہاں حسن و عشق کی واردات اور عام انسانی تجربات ہی کو حد غزل میں رہ کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ حسرت موہانی جو امام المتغزلین کہلاتے تھے، اپنی غزلوں کو سیاسی تصورات سے محفوظ رکھنے پر مصر تھے۔ غزل خوانی کا مطلب ہی ان دنوں محض ذاتی معاملات عشق کا بیان رہ گیا تھا۔ چنانچہ جب جگر مرادآبادی نے ترقی پسندوں کی ایک کانفرنس میں اپنی ایک غزل پڑھی جس کا مطلع تھا:

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

تو دھوم مچ گئی کہ کیا سچ کہا ہے۔ جیسے کہ خوب پریشاں کی تفسیر حدود غزل سے باہر کی گفتگو ہو۔ غرض اس غلط فہمی کو ہوا دینے میں خود اکابرین غزل کا بھی ہاتھ تھا کہ صرف نظم ہی کے ذریعے سیاسی انقلابی اور دوسرے عصری تقاضوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اصل مسئلہ غزل کے لب و لہجہ، الفاظ کے انتخاب اور شاعر کے انداز فکر میں تبدیلی کا تھا۔ اردو غزل کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ سیاسی ماحول میں پلی اور بڑھی اور اس کے بیشتر استعارے تراکیب کنائے اور محاورے سیاسی تصورات کی ادائیگی کے لئے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کثرت استعمال سے وہ نیم مردہ ہو چکے تھے۔ پھر بھی بسمل عظیم آبادی کی غزل کا شعر:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

۱۹۴۰ کے آس پاس جو غزل کے مستند اور مشہور شعرا تھے، انھوں نے غزل کی دنیا کو بے حد محدود کر رکھا تھا۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ بس ذاتی مسائل کی حد تک خارجی دنیا اور اس کے ہنگاموں سے تعلق رکھنا چاہتے ہیں ؛ ویسے حسرتؔ، جگرؔ، آثرؔ لکھنوی، فراقؔ، روشؔ صدیقی اور اختر انصاری وغیرہ بیدار مغز لوگ تھے اور ترقی پسندوں کے جلوس میں شریک بھی ہوتے تھے، ان میں سے فراقؔ اور اختر انصاری نے تو تحریری طور سے بھی ادب اور سیاست کے پر روشنی ڈالی ہے۔ خاص کر فراقؔ نے تو بعد میں ایک نا قابل فراموش رول غزل کی اہمیت اور بازیافت کے سلسلے میں ادا کیا، پھر بھی مجموعی حیثیت سے اس وقت ان تمام شعرا کی غزلوں کا مواد بھی یا شعری مزاج ایسا نہ تھا کہ قومی بیداری کے موڈ سے ہم آہنگ کہا جا سکے۔ اس موڈ سے کچھ ہم آہنگ یگانہؔ کا انداز سخن تھا لیکن وہ الگ تھلگ ہی رہے۔ اس وقت کے تازہ فکر شعرا میں مجازؔ اور جذبیؔ نظم و غزل دونوں میں اپنی انفرادیت اور خوش نوائی کے باعث تیزی سے اپنا مقام بنانے لگے تھے۔ اور جس رنگ تغزل کو بعد میں عروج حاصل ہوا، اس کے اولین نقوش ان ہی کے یہاں ملتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں بھی یہ رویہ رہا کہ غزلوں میں ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا جائے جس سے تغزل کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہو، مثلاً:

بہت مشکل ہے دنیا کا سنور نا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
(مجازؔ)

یا

کتابیات

نمبر شمار	کتاب	مصنف/مرتب	ناشر	سنہء
۱	آب حیات	مولانا محمد حسین آزاد	اردو اکادمی، اتر پردیش	۲۰۰۲ء
۲	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۷ء
۳	اردو غزل پر ترقی پسند تحریک کے اثرات	ڈاکٹر عامر ریاض	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ	۱۹۹۶ء
۴	اردو غزل	ڈاکٹر کامل قریشی	اردو اکادمی، دہلی	۲۰۰۱ء
۵	اردو غزل	یوسف حسین خان	شبلی پبلیکیشنز، اعظم گڑھ	۲۰۰۱ء
۶	اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	بک امپوریم، پٹنہ	۱۹۸۵ء
۷	ادب نما	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی	شبلی پبلیکیشنز، اعظم گڑھ	۲۰۰۱ء
۸	اقبال حروف و معنی	اسلوب احمد انصاری	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۸ء
۹	تین ترقی پسند شاعر	پروفیسر علی احمد فاطمی	ادارہ نیا سفر، الہٰ آباد	۲۰۰۰
۱۰	تحریک و تعبیر	یعقوب یاور	بھارت آفسٹ گلی قاسم جان، دہلی۔۶	۱۹۹۹ء
۱۱	تفہیم و تنقید (تنقیدی مقالات)	حامدی کاشمیری	نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی	۱۹۸۸ء
۱۲	ترقی پسند تحریک سفر در سفر	پروفیسر علی احمد فاطمی	ادارہ نیا سفر، الہٰ آباد	۲۰۰۶
۱۳	ترقی پسند تحریک اور اردو غزل	ڈاکٹر سراج اجملی	عذرا پبلیکیشنز، دہلی	۱۹۹۶ء
۱۴	ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت	پروفیسر گوپی چند نارنگ	ریڈشاٹ پبلیکیشنز، ممبئی	۲۰۰۴
۱۵	ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر	پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی	پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی	۱۹۹۴ء
۱۶	''چراغ'' نمبر مجروح شخصیت اور شاعری	شاہد ندیم	چراغ پبلیکیشنز، کرلا ممبئی	
۱۷	دو ترقی پسند شاعر	پروفیسر علی احمد فاطمی	ادارہ نیا سفر	۲۰۰۵
۱۸	طرز خیال	پروفیسر محمد حسن	اردو اکادمی، دہلی	۲۰۰۵ء

کیا تجھ کو خبر، کیا تجھ کو پتہ دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکل گیتی ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں
(جذبیؔ)

ان اشعار میں دردمندی، خلوص کی آنچ، فنی حسن اور تھوڑی بہت تہداری بھی ہے لیکن گرمیٔ سخن یہاں بھی نہیں ہے۔ مختصراً یہی غزل کا منظر نامہ تھا جب مجروحؔ کو سلطانپوری بساط غزل پر وارد ہوئے اور چند ہی برسوں میں اپنے منفرد تیور اور انداز تغزل کے باعث ایک نئے انقلابی آہنگ کی علامت بن کر ہندوستان گیر شہرت حاصل کر لی۔

میں قاضی عبدالغفار کی رائے سب سے بلیغ اور متوازن نظر آتی ہے ملاحظہ کیجیے:

''ہندوستان کی نوجوان نسل کے آتش خانے سے جو چنگاریاں نکل رہی ہیں، ان میں ایک بہت روشن چنگاری مجروحؔ سلطان پوری ہیں، جنھوں نے تغزل کے وجدان میں اپنی روح کو عریاں کیا ہے۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''غزل کے میدان میں انھوں نے وہ سب کچھ کیا ہے جس کے لیے بعض ترقی پسند شعرا صرف نظم کا پیرایہ ضروری اور ناگریز سمجھتے ہیں۔(۲)

☆☆☆

(۲،۱) مجروح سلطانپوری (مقام اور کلام) مرتب: ڈاکٹر محمد فیروز ص ص ۲۳،۲۳

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	ناشر	سنہ
۱۹	''غزل''	مجروح سلطان پوری	مجروح اکیڈمی، ممبئی	۱۹۵۶ء
۲۰	غزل اور مطالعہ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۸۳ء
۲۱	فکر ندیم	ابوشہمہ صدیقی ندیم	صفہ پبلیکیشنز، سدھارتھ نگر یو۔پی	۲۰۰۹
۲۲	کلیات مجروح سلطان پوری	تاج سعید	الحمد پبلیکیشنز، لاہور	۲۰۰۳ء
۲۳	کلیات پریم چند	مدن گوپال	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	۲۰۰۷
۲۴	گلکاری وحشت کا شاعر مجروح	خلیق انجم	انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی	۲۰۰۰
۲۵	مجروح سلطان پوری مقام اور کلام	ڈاکٹر محمد فیروز	ساقی بک ڈپو، اردو بازار دہلی	۲۰۰۰
۲۶	''مشعل جاں''	مجروح سلطان پوری	مجروح اکیڈمی، ممبئی	۱۹۹۹ء
۲۷	مجروح سلطان پوری کے سو شعر	ڈاکٹر انس سرور انصاری	دانش بک ڈپو، ٹانڈہ، امبیڈکر نگر	۱۹۹۸ء
۲۸	مجروح سلطان پوری ایک مطالعہ	راشد انور راشد	اثبات ونفی پبلیکیشنز، کولکاتا	۱۹۹۹ء
۲۹	معاصر اردو غزل مسائل ومیلانات	پروفیسر قمر رئیس	اردو اکادمی، دہلی	۲۰۰۶ء
۳۰	مجروح سلطان پوری فن اور شخصیت	قمر گونڈوی	قمر الدین خاں قمر یوسف زئی (قمر گونڈوی)، تاج پریس، بہرائچ	۱۹۹۸ء
۳۱	مجروح سلطان پوری شخص اور شاعر	ڈاکٹر آدم شیخ	مجروح اکادمی سنتا کروز، ممبئی	۱۹۹۴ء
۳۲	ہندوستانی ادب کے معمار: مجروح سلطان پوری	وہاب اشرفی	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	۲۰۰۳ء
۳۳	مفتاح التقویم	حبیب الرحمٰن صابری	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	۱۹۹۹ء
۳۴	ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری	پروفیسر گوپی چند نارنگ	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	۲۰۰۳ء
۳۵	یادگاری مجلّہ ''مجروح سلطان پوری ''غزل'' کے آئینے میں'' قومی سیمینار	ڈاکٹر زیبا محمود	جی۔ایس۔پی۔جی۔کالج، سلطان پور	۲۲،۲۳ فروری ۲۰۰۹

☆

رسائل

۱	''آج کل'' گوشہ مجروح	محبوب الرحمٰن فارقی	نئی دہلی	اکتوبر ۹۳
۲	''آج کل''	محبوب الرحمٰن فارقی	نئی دہلی	اگست ۲۰۰۰
۳	''آج کل'' گوشہ مجروح	عابد کرہانی	نئی دہلی	اپریل ۹۳
۴	اردو دنیا (مجروح سلطان پوری)	ڈاکٹر سید عبدالباری	نئی دہلی	اپریل ۲۰۰۷
۵	امروز وفردا	محمد فیروز	علی گڑھ یونی ورسٹی	۹۹ تا ۲۰۰۰
۶	ایوان اردو ما (ہنامہ)	منصور احمد عثمانی	نئی دہلی	جون ۲۰۰۰
۷	بیباک	ہارون بی اے	مالیگاؤں	اکتوبر، نومبر ۲۰۰۹
۸	چنگاری (پندرہ روزہ) اردو غزل کا نشاۃ الثانیہ اور مجروح سلطان پوری	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	دہلی	اگست ۸۳
۹	حیات (ماہنامہ)	شمیم فیضی	نئی دہلی	ستمبر ۰۸
۱۰	روزنامہ راشٹریہ سہارا	منصور احمد عثمانی	لکھنؤ ایڈیشن	۳۱ ر اکتوبر ۲۰۰۹
۱۱	زمانہ		کانپور	ستمبر ۱۹۳۰
۱۲	سبق اردو (ماہنامہ)	دانش الہ آبادی	بھدوہی	ستمبر ۲۰۱۰

۱۳	شاعر (ماہنامہ)	افتخار امام صدیقی	ممبئی	۲۰۰۹
۱۴	عصری ادب گوشۂ مجروح	محمد حسن	تاج آفسٹ پریس، اردو بازار،	
۱۵	فکر و نظر		علی گڑھ	۱۹۵۴
۱۶	کتاب	شمیم الدین	لکھنؤ	اپریل ۷۰
۱۷	کتاب نما (ماہنامہ)	ولی شاہجہان پوری	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	جون ۸۶
۱۸	نیا دو (ماہنامہ)ر شکیل بدایونی نمبر	وضاحت حسین رضوی	لکھنؤ	دسمبر ۰۹
۱۹	نوائے ادب	ڈاکٹر آدم شیخ	ممبئی	جنوری تا مارچ ۲۰۰۱

☆☆☆

چند تصاویر

مجروحؔ سلطانپوری

(1919-2000)
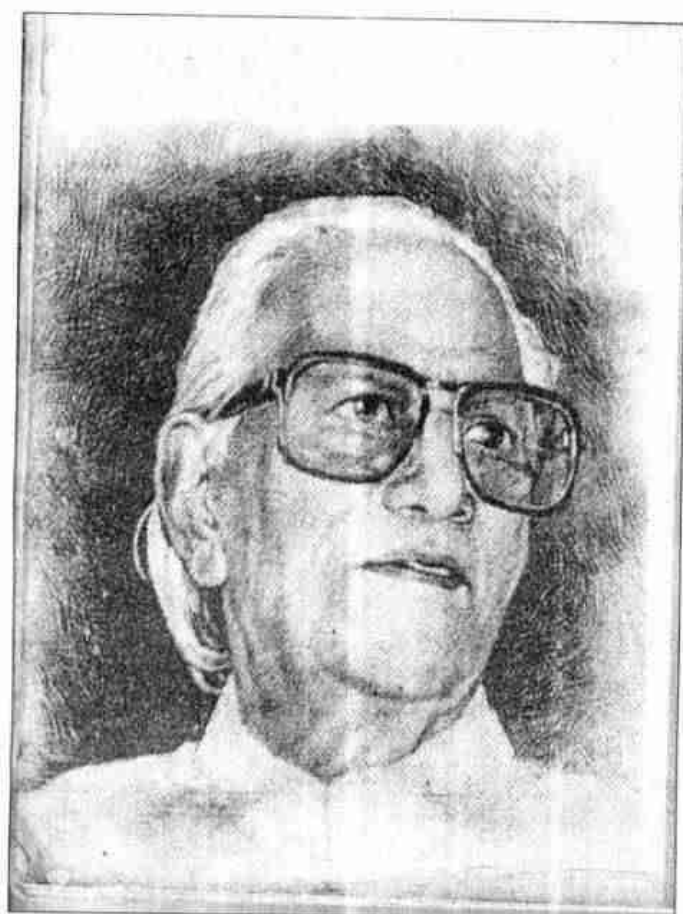
مجروح سلطان پوری کے ساتھ ایک یادگار تصویر میں نامور موسیقار نوشاد روس کی ممتاز اردو ادیبہ لا میلا وا سلکوا، عزیز احمد
اور ایم اے منان دیکھے جا سکتے ہیں